

مقالات گیلانی



محققہ اخص حضرت مولانا مناظر آسن گیلانی کے علمی و تحقیقی تبلیغی اشاعتی
اور تاریخی و شہسای مقالات و مضامین کا نہایت مفید اور سیرین مجموعہ

مرتبہ
سید حافظ اکبر شاہ بخاری

مکتبہ سید فہر وق



مقالات گیلانی

محقق العصر حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و تحقیقی،
تبلیغی و اصلاحی اور تاریخی سیاسی مقالات و مضامین کا نہایت مفید و حسین مجموعہ

مرقبہ

سید حافظ قاری اکبر شاہ بخاری

مکتبہ علم و فہرہ

4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی

Tel: 021-34594144 Cell: 0334-3432345

جُمْلَةٌ حَقُوقٌ بِحَقِّ نَاشِرٍ مَحْفُوظٌ هَيِّنٌ

نام کتاب مقالات گیلانی
افادات سید حافظ قاری اکبر شاہ بخاری
اشاعت اول اگست 2012ء
تعداد 1100
طابع القادر پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر مکتبہ عرفان و ق 4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی
021-34594144 Cell: 0334-3432345
ای میل M farooq.12317@yahoo.com



ملنے کے پتے

دارالاشاعت، اردو بازار کراچی
اسلامی کتب خانہ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
قدیمی کتب خانہ، آرام باغ کراچی
ادارۃ الانور، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
مکتبہ رشیدیہ، سمرکی روڈ کوئٹہ
کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار لاہور
مکتبہ العارفی، جامہ آباد، ہستیانہ روڈ فیصل آباد
مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور
مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار لاہور
مکتبہ علمیہ، بی بی روڈ اکوڑہ ٹکٹ منٹن نوشہرہ
وحیدی کتب خانہ، محلہ گل قند خانی بازار پشاور

فہرست مقالات گیلانی

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
۲۲۳	کرامات اولیاء	۴	پیش لفظ
۲۳۱	تعلیمات غزالیؒ کے انقلابی اثرات	۵	مختصر سوانح مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
		۲۳	مقالات و مضامین
۲۴۴	حکیم الامت تھانویؒ کی اعتدال پسندی پر عمومی نظر	۳۳	رسول اکرم ﷺ کی مدنی زندگی
۲۵۰	آغوش موج کا ایک ذریعہ بندہ	۶۳	توحید القرآن
۲۶۰	حضرت شیخ الہندؒ کے درس میں	۸۵	قرآن کے استدلال پر سرسری نظر
۲۷۱	امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کے درس میں	۹۳	تدوین حدیث
۲۷۹	استاذ محترم حضرت مولانا شہیر احمد عثمانیؒ	۹۷	روزہ اور قرآن
۲۹۵	میری محسن کتابیں اور ابتدائی حالات	۱۰۴	بیت اللہ مرکز تجلی
۳۰۳	کرشن کے ساتھ آریوں کی عداوت پر ایک نظر	۱۱۴	حضرت ابوذر غفاریؓ کے آخری لمحات
۳۱۶	مناظرہ	۱۲۶	خصال الفطرۃ
۳۲۵	مکالمات، شاہ و گدا	۱۵۶	یہودیوں کی ایک ذبردست سازش اسلام میں
۳۳۱	مذہبی سوالات اور سائنس کی حد پرواز	۱۶۹	الجنۃ والنار
۳۳۸	سائنسی ایجادات کا سرچشمہ کون ہے؟	۱۸۱	اسلامی رواداری اور مساوات و بے نفسی
۳۴۲	موت سے پہلے آدمی عم سے نجات پائے کیوں	۱۹۲	فیصلہ آسمانی درباب مسیح قادیانی
۳۴۹	واقعہ معراج اور نکتہ کی دو باتیں	۲۰۰	مسئلہ جذب و کشش پر ایک تنقیدی نظر
۳۵۱	فہرست تصانیف مرتب کتاب	۲۱۰	البدعۃ و حقیقتھا (بدعت اور اس کی حقیقت)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

محقق العصر مؤرخ اسلام مولانا سید مناظر احسن گیلانی ”دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز فضلاء میں سے تھے، ان کا علم و فضل اور زہد و تقویٰ مسلم تھا، ساری عمر تدریس و تبلیغ اور تصنیف و تالیف میں گزاری تھی، متعدد تصانیف اور سینکڑوں مقالات و مضامین منظر عام پر آئے۔ حضرت شیخ الہند، مولانا محمود حسن، امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور ان کے عمل و علم سے خوب استفادہ حاصل کیا تھا۔ حکیم الامت تھانوی اور دیگر اکابر سے خاص باطنی تربیت حاصل کی۔ ماہنامہ القاسم دیوبند اور ماہنامہ الرشید دیوبند کے مدیر بھی رہے اور مقالہ نگار بھی، دارالعلوم دیوبند میں رہ کر تبلیغ و اشاعت کی خدمت سرانجام دی اور آخری تصنیف ”سوانح قاسمی“ دو جلدوں میں حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب قاسمی کی فرمائش پر تالیف کی۔ زیر نظر کتاب ”مقالات گیلانی“ میں حضرت کے قلم سے لکھے ہوئے چند مقالات و مضامین جمع کئے گئے ہیں، جو ماہنامہ القاسم دیوبند، ماہنامہ الرشید دیوبند، ماہنامہ الفرقان لکھنؤ اور دیگر رسائل و جرائد میں طبع ہوئے تھے، اب ان کو یکجا کتابی صورت میں مکتبہ معارف القرآن کراچی سے شائع کیا جا رہا ہے۔ جزاکم اللہ احسن الجزاک۔

حق تعالیٰ شانہ مولانا جلیل اشرف زید مجدد کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائیں کہ انہوں نے اپنے مکتبہ معارف القرآن سے اس عظیم الشان مجموعہ کو شائع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے سب مسلمانوں کیلئے نافع و مفید فرمائے، آمین۔

احقر محمد اکبر شاہ بخاری

مرکز تبلیغ مجلس

بدر سہ اشرفیہ احتشام العلوم

جامع مسجد عثمانیہ جام پور

ضلع خیر پور (پنجاب)

محقق اسلام

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

محقق اسلام حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ موجودہ صدی کے عظیم اسلامی متکلم، مفکر اور مؤرخ تھے، ان کے بزرگ دو ڈھائی صدی پہلے عرب سے ایران ہوتے ہوئے برصغیر پاک و ہند وارد ہوئے، اس خاندان کی ایک شاخ نے ضلع پٹنہ میں ایک بستی ”گیلانی“ کے نام سے بسائی، اگر اس بستی میں مولانا مناظر احسن جیسی نادرہ روزگار ہستی نے جنم نہ لیا ہوتا، تو عین ممکن ہے کہ اس کی شہرت ضلع پٹنہ کی حدود سے متجاوز نہ ہوتی۔ مولانا موصوف ۹ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ بمطابق ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا کے نام کے ساتھ ”گیلانی“ اسی بستی کی نسبت ہے، یہ نسبت ہرگز، یعنی: شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے متعلق نہیں ہے۔ مولانا گیلانی کا خاہران ذی وجاہت تھا، مالی فارغ البالی اور علمی اعتبار سے گردونواح کے دیہات میں نمایاں تھا، ان کے والد ماجد ابوالخیر صاحب زمینداری میں مشغول تھے، مگر ان کے چچا ابونصر صاحب شعر و سخن کی مجلسیں جلاتے اور علم و فضل کی محفلیں برپا کرتے تھے، ان کے جد امجد سید احسن صاحب اس علاقے میں جید عالم گزرے ہیں، غالباً انہی کی مناسبت سے ان کا نام رکھا گیا تھا۔ مولانا گیلانی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، تیرہ چودہ سال کی عمر میں راجپوتانہ کی مسلم ریاست ٹونک بھیج دئے گئے، جہاں خیر آبادی سلسلہ کے چراغ سحر اور جامع معقولات مولانا سید حکیم برکات احمد کی مسندِ درس علم کے پروانوں کو سمیٹے ہوئے تھی۔ مولانا مناظر احسن صاحبؒ نے ان سے چھ سال تک دینی علوم کے علاوہ منطق و فلسفہ کا درس لیا۔ کچھ عرصہ اجیر میں مولانا ٹونکی کے شاگرد مولانا معین الدین صاحب سے مذاکراتی استفادہ کیا، لہذا انہیں بھی ”استاد“ کہہ کر یاد کیا کرتے تھے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بعد حدیث کی تحصیل کیلئے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور یگانہ روزگار علماء سے استفادہ کیا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ سے نہ صرف ترمذی اور بخاری شریف کا درس

لیا، بلکہ ان سے بیعت بھی کی۔ امام العصر محمد انور شاہ کشمیریؒ سے مسلم شریف کا درس لیا۔ ان کے علاوہ دوسرے اساتذہ میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمن عثمانیؒ، فخر الہند مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ اور سید العلماء مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ شامل ہیں۔

آپ نے ۱۳۳۱ھ میں دارالعلوم میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۲ھ میں دورہ حدیث میں شریک رہ کر کتب حدیث کی سند حاصل کی، دورانِ تعلیم میں آپ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے اپنے اساتذہ کرامی کے منظور نظر رہے اور ان کے فیض علمی و روحانی سے خوب خوب مالا مال ہوئے۔

علمی و تدریسی خدمات

دورہ حدیث کے اختتام کے ساتھ ہی آپ دارالعلوم دیوبند کے ماہانہ مجلہ ”القاسم“ سے منسلک ہو گئے، یہ تعلق ۱۳۳۹ھ تک قائم رہا۔ دارالعلوم کے آرگن کے کرتا دھرتا بننے کا شرف مولانا کیلئے کچھ کم نہ تھا، لیکن اسکے ساتھ ساتھ آپ نے اپنے علمی اور تحقیقی مضامین اور والہانہ طرزِ نگارش سے علمی و ادبی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ ”سوانح ابوزر غفاری“ اور ”کائنات روحانی“ دونوں کتابیں آپ کے اسی دور کی یادگار ہیں، پھر حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی سفارش سے مولانا گیلانی کا حیدرآباد دکن کے جامعہ عثمانیہ میں تقرر ہو گیا، جہاں جلد ہی شعبہ دینیات کے صدر منتخب ہو گئے اور تقریباً پچیس برس تک حیدرآباد میں علمی و تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دوران ہزاروں افراد نے آپ کے درس و تربیت سے فیض حاصل کیا۔ حیدرآباد دکن کے قیام کے بارے میں جناب اختر راہی ایم اے لکھتے ہیں:

”حیدرآباد دکن نے اردو یونیورسٹی ”جامعہ عثمانیہ“ کے نام سے قائم کی تھی، جو اپنے مخصوص طرزِ تعلیم کی وجہ سے ہندوستان بھر میں اپنی مثال آپ تھی اور روز بروز ترقی کر رہی تھی، روز افزوں ترقی کے ساتھ شعبہ دینیات میں ایک عالم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اتفاقاً مولانا گیلانی ”حیدرآباد گئے اور اپنے دور کے بڑے مفسر مولانا حمید الدین فراہیؒ سے

ملاقات ہوئی۔ مولانا فرامی نے اٹنی ذات میں جوہر قابل تلاش کر لیا اور جامعہ عثمانیہ چلے آنے کی خواہش کا اظہار کیا، مگر مولانا گیلانی دارالعلوم دیوبند چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے، لیکن جب خود دیوبند کے بزرگوں نے اس مشورے کی تائید کی، تو وہ جامعہ عثمانیہ جانے پر رضامند ہو گئے۔

۱۳۳۸ھ میں لیکچرار دینیات کی حیثیت سے مولانا کا تقرر ہوا، ترقی کرتے کرتے ریڈر بنے، پروفیسر ہوئے اور آخر کار کئی سال تک صدر شعبہ دینیات کے فرائض انجام دے کر ۱۳۶۸ھ میں ریٹائر ہوئے اور وظیفہ یاب بھی ہوئے۔ حیدرآباد دکن میں مولانا گیلانی کو مولانا حمید الدین فرامی کی صحبت میسر آئی، مطالعہ قرآن میں ان سے مدد لی، ان کی طرز فکر اور اعتدال نگاہ: مولانا فرامی کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ مولانا گیلانی حیدرآباد کے بارے میں لکھتے ہیں:

”یہ کورنصیب گو حیدرآباد میں پیدا نہیں ہوا تھا، مگر میرے جسم میں جو کچھ ہے، حیدرآباد ہی کا ہے۔ اب بھی حیدرآباد ہی میرے سدرتس کا ذریعہ ہے، پھر اپنی محبوب تعلیم گاہ ہے، ہماری جامعہ عثمانیہ جس میں میرے دماغ و دل نے آنکھیں کھولیں، اسی کے ماحول میں میری پرورش ہوئی۔“

(ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک، دسمبر ۱۹۷۹ء)

مولانا گیلانی ”وسعت نظر، علمی تبحر اور دینی مسائل میں دسترس کی وجہ سے شعبہ اسلامیات کی روح رواں تھے، اساتذہ اور طلباء میں یکساں مقبول تھے، یونیورسٹی کی سینٹ مولانا کے وجود کو اتنا قیمتی خیال کرتی تھی کہ مدت ملازمت میں توسیع ہو سکتی تھی، مگر سقوط حیدرآباد نے دنیا ہی بدل ڈالی، نئی سیکولر ہندی نے شعبہ دینیات کو اڑا دیا اور لادینی نظام تعلیم میں عوام کی آنکھوں میں دھول چھونکنے کیلئے شعبہ اسلامیات قائم کیا گیا، جو جامعہ کے اعلیٰ مقاصد کے پیش نظر بے حقیقت تھا، چنانچہ مولانا اس جبری تنزل سے دل برداشتہ ہو گئے اور مدت ملازمت کے دن پورے ہوتے ہی وطن چلے آئے اور خود ان کے بقول کیفی زندگی بسر کرنے لگے، وطن واپس آنے کے بعد ان کی زندگی کا دور تنہائی شروع ہوا، اس فرصت میں ہمتن تصنیف و تالیف میں لگ گئے، ہزاروں صفحات لکھ ڈالے، ان کا قلم خوب جولانی دکھاتا رہا، مگر کیفی زندگی نے ان کا سکون لوٹ لیا۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی مجلس ماتم میں

شرکت کے لئے لکھنؤ گئے، وہاں سے واپسی پر دوسرے، یا تیسرے روز مکان میں چوروں کی کافی تعداد گھس گئی، جو کچھ ساتھ لے جا سکتی تھی لے گئی، مولانا گیلانی کے الفاظ ”صبح کو جب آنکھ کھلی، تو آنکھیں کھل گئیں“۔ ادھر مولانا کے اکلوتے صاحبزادے پاکستان میں مقیم تھے، ان کی طرف سے بھی فکر مند تھے، ضعیفی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا، بیٹے کی جدائی اور غم آلام نے گھیر لیا۔

۱۹۵۳ء کے آخر میں قلبی شکایت کا حملہ ہوا اور فوری علاج معالجہ سے افاقہ ہو گیا، پھر ۱۹۵۴ء میں چند ماہ بعد شکایت عود کر آئی اور حملہ اتنا شدید ہوا کہ ڈاکٹروں نے تصنیف و تالیف پر مکمل پابندی عائد کر دی۔ مولانا کا قلم پہلے حملے کے بعد اپنی پوری رفتار سے چل پڑا تھا، دل کے ہاتھوں رک گیا، دو سال تک تندرستی اور بیماری کے درمیان کش مکش چلتی رہی، اسی دور کے خطوط میں مولانا نے اس زندگی کو برزخی زندگی سے تعبیر کیا، الغرض اس آخری دور میں تین جلدوں میں ضخیم و حجم ”سوانح قاسمی“ ترتیب دی۔ اس بارے میں مولانا قاری محمد طیب صاحب فرماتے ہیں کہ:

”میں نے سوانح قاسمی لکھنے کی فرمائش کی، تو بہت خوشی اور امنگ سے قبول کرتے ہوئے لکھا کہ میری علمی زندگی کی ابتدا ”القاسم“ ہی سے ہوئی تھی اور شاید انتہا بھی ”القاسم“، یعنی: مولانا نانوتوی پر ہوگی، چنانچہ یہی ہوا کہ سوانح قاسمی کی چوتھی جلد آپ نے شروع کی، پانچ صفحے لکھنے پائے تھے کہ عمر فانی نے جواب دیا اور القاسم پر ہی انتہا ہو گئی۔“

۵ جون ۱۹۵۶ء کو دن کے معمولات انجام دے کر خواب استراحت کے لئے لیٹے اور خواب ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے، پاس ہی لیٹے ہوئے بھائی کو بھی پتہ نہ چلا کہ چہیتا بھائی ایک طویل سفر کر کے اپنے اللہ سے جا ملا۔ (انا اللہ وانا الیہ راجعون)

اللہ تعالیٰ درجات عالیہ نصیب فرمائے، آمین۔

تصنیف و تالیف

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب فرماتے ہیں کہ:

”حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی“ مشاہیر فضلاء داہ العلوم دیوبند میں سے تھے،

صاحب طرز مصنف، نیز ذہن و ذکاؤ اور طباعی منفرد تھے، تحصیل علوم سے فراغت کے بعد دارالعلوم کے آرگن رسالہ ”القاسم“ کے ایڈیٹر اور رئیس التحریر منتخب کئے گئے اور عرصہ دراز تک قلمی خدمات سے ہندوستان کے علمی حلقوں کو مستفید کرتے رہے۔ اس کے بعد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ”مہتمم دارالعلوم دیوبند کی سفارش پر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے پروفیسر مقرر ہوئے، اس دوران بہت سی مفید اور علمی تصانیف آپ کے قلم سے نکلیں۔ ”کائناتِ روحانی“، ”سوانح ابوذر غفاری“، ”النبی الخاتم“، ”مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت“، ”اسلامی معاشیات“، ”امام بوحنیفہ کی سیاسی زندگی“ اور ”رحمۃ اللعالمین“ وغیرہ آپ کی مخصوص اور مشہور تصانیف ہیں۔ تصانیف اور علمی مقالات کا عدد بہت کافی ہے، جو مقبول خواص و عوام ہے۔ آخر میں احقر کی فرمائش پر ”سوانح قاسمی“ تین جلدوں میں مرتب کی، جو آپ کی تصانیف میں ایک شاہکار تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ تقریر و خطابات نہایت عالمانہ، ادیبانہ اور پُر جوش ہوتی تھی۔ دقیقہ سنج اور نکتہ رس علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا اور ہندوستان کے مشاہیر علماء میں آپ کو ممتاز حیثیت حاصل تھی۔“ (تاریخ دارالعلوم دیوبند)

مولانا ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں کہ:

”مولانا گیلانی اپنی ذات میں انجمن تھے، وہ عالموں میں عالم، ادیبوں میں ادیب، مورخوں میں مورخ، فقیہوں میں فقیہ، محدثوں میں محدث، مفسروں میں مفسر اور محققوں میں محقق تھے، فارسی اردو ان کا یکساں مذاق تھا، شعر و شاعری کا ذوق اور سخن شناسی و سخن سنجی دونوں سے حصہ وافر ملا تھا، وہ ہندوستان کی اس گذشتہ تہذیب و ثقافت کی یادگار تھے، جب فقیہ اہدث کیلئے خشک ہونے اور عالم کیلئے شعر کو غیر موزوں پڑھنے کی شرط نہ تھی۔ مولانا کی تصانیف میں سے سب سے پہلے ”النبی الخاتم“ پڑھی، کتاب عجیب البیلے انداز میں لکھی گئی، صحت سادی کا انداز بیاں، خطیبوں کا جوش و برجستگی، عشاق کی مستی اور وارفتگی، عقل و ذہن کی لطیف آمیزش، حسب معمول معمولی اور مشہور واقعات سے نکتے اور عظیم نتیجے نکلنے جاتے ہیں اور وہ اس سرعت و کثرت کے ساتھ کہ پڑھنے والا مصنف سے شکایت کرنے لگتا ہے کہ ع

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی ﷺ میں ”رحمۃ للعالمین“ اور ”النبی الخاتم“ سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی، کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم و انشا پر دازی کی کوشش نہیں ہے، اس کے اندر ان کا سوزِ دروں اور خونِ جگر بھی شامل ہے اور واقعہ یہی ہے کہ۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حر و صوت معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے۔ وسعتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، رسوخِ فی العلم اور ذکاوت میں مولانا کی نظیر اس وقت ممالکِ اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے، (والغیب عند اللہ) تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصرِ حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں، انہوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کیا ہے، وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف اور محقق بنا سکتا ہے۔ اس ایک آدمی نے تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں، ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوا کرتا ہے اور اب ان جیسا آدمی برسوں میں بھی پیدا نہ ہوگا۔“ (پرانے چراغ)

جناب مولانا سمیع الحق صاحب مدیر ماہنامہ ”الحق“ حضرت علامہ گیلانی کی مایہ ناز تالیف ”النبی الخاتم“ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

اکتوبر ۱۹۵۱ء کی بات ہے کہ ملتان کے ایک دینی مدرسہ کے جلسہ دستار بندی میں شمولیت کا اتفاق ہوا، تقریب دستار بندی کے اختتام پر حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے فضلاء مدرسہ سے مختصر خطاب فرمایا اور اس وقت شاہ جی مرحوم کے ضعف و عالت اور نقاہت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور آسمانِ خطابت کا یہ آفتاب پوری طرح گرہن نازد میں تھا۔ شاہ جی نے فضلاء کو دیگر نصائح اور ذمہ داریوں پر تنبیہ کے ساتھ ساتھ فتنہ انگارِ حدیث پر توجہ دلائی، پھر حجیتِ حدیث کے ضمن میں حضرت علامہ گیلانی مرحوم کی کتاب ”تدوین حدیث“ کو سراہتے ہوئے اس کے مطالعہ پر زور دیا اور فرمایا:

”میں نے جب مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب ”تدوین حدیث“ کا مطالعہ کیا تو مجھے پروجا اور جذب کی حالت طاری ہوئی۔ حضرت گیلانی جب اس کتاب کو لکھ رہے تھے تو مجھے خیال ہوا کہ مولانا گیلانی اور صاحبِ مدینہ طیبہ ﷺ کے درمیان سارے حجاب ہٹا دینا۔“

گئے ہیں اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بول مولانا گیلانی لکھ رہے ہیں۔ ”تدوین حدیث“ فقہانہ کا حدیث کی رد میں آخری قاطع اور کامیاب چیز ہے۔“

تدوین حدیث کی طرف شاہ جی مرحوم کی یہ بات علامہ گیلانی ”کی کتاب ”النبی الخاتم“ پر بھی صادق آتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ سیرت لکھتے وقت صاحب سیرت علیہ السلام کی خاص توجہات اور عنایات سیرت نگار کے شامل حال رہیں اور روح القدس کے فیض خاص سے مؤلف کی روح فیضاب ہوتی رہی۔ مبدا، فیاض نے ان کی دستگیری کی اور عشق کی آگ اور سوز و گداز میں ڈوب کر مصنف نے صاحب محبوبیت کبریٰ کا ایک ایسا حسین مرقع ”النبی الخاتم“ کے نام سے تیار کیا، جو درد و سوز، جذب و وجد کے ساتھ ساتھ استناد و تحقیق اور استخراج نتائج کا شاہکار ہے۔ کتاب کا انداز بیان ایسا ہے کہ آسمانی صحیفوں اور الہامی عبارتوں کا گمان ہوتا ہے۔ اگر کسی دوسری کتاب کی تلاوت جائز ہوتی، تو جی چاہتا کہ اس کی تلاوت کی جائے، سیرت مطہرہ کے واقعات و احوال کو عجیب و غریب ربط و ترتیب سے مختصر بیان کیا گیا ہے کہ ہر سطر صداقت رسالت کا دعویٰ بھی ہے، اور دلیل بھی۔ پہلے مکی زندگی کا بیان ہے، پھر مدنی زندگی کا، جسے دماغ کا دور قرار دیا ہے۔ حضرت علامہ گیلانی اپنے وقت کے نہ صرف محقق اجل اور نقاد و بصیر عالم تھے، بلکہ صاحب حال اور صاحب بزرگی بھی۔ اور جب سوز و گداز کے ساتھ علم و تحقیق بھی جمع ہو جائے، تو نشہ کیوں دو آتشہ نہ ہو۔“

(ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک، ستمبر ۱۹۶۸ء)

آپ کے شیخ و مربی حضرت حکیم الامت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ:

”مناظر احسن کے سارے مناظر احسن ہیں۔“

علامہ سید سلیمان ندویؒ آپ کی تالیف ”النبی الخاتم“ کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

”یہ مناظر اسلام، مستکمل ملت اور سلطان القلم کے قلم کی روانی اسلام کی محافظت میں تیغ رانی کا کام دیتی ہے۔“

(ماہنامہ الرشید: ۱۷)

جناب علامہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

”مولانا گیلانی کی تصنیف کو اسلوب نگارش اور ربط تحریر کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اس نقطہ نظر کے لحاظ سے دیکھنا چاہئے کہ ان میں علوم و حقائق اور استنباط و استخراج مسائل کا کس

قدرگراں بہاذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔“

یوں تو مولانا کی ہر تحریر اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہے، تاہم ان کی مندرجہ ذیل تالیفات بہت مقبول ہیں:

- ۱۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ۲۔ الدین القیم ۳۔ النبی الخاتم ۴۔ تدوین قرآن
- ۵۔ تدوین حدیث ۶۔ تدوین فقہ ۷۔ اسلامی معاشیات ۸۔ ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی
- ۹۔ مقالات احسانی ۱۰۔ تفسیر سورہ کہف ۱۱۔ سوانح قاسمی سہ جلد ۱۲۔ تذکرہ شاہ ولی اللہ
- ۱۳۔ کائنات روحانی ۱۴۔ رحمۃ للعالمین ۱۵۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ، اور
- الفرقان لکھنؤ کے ”مجدد الف ثانی نمبر“ اور ”شاہ ولی اللہ نمبر“ میں ان کے مقالات جان
- اشاعت تھے، ان مقالات سے جہاں ان کے ذوقِ تاریخ، اندازِ فکر اور ژرف نگاہی نمایاں
- ہے، ان کے سینے میں اٹھتے ہوئے طوفان اور مچلتے ہوئے ارمان بھی ظاہر ہیں۔“

(بحوالہ الحق، اکوڑہ خٹک، دسمبر ۱۹۷۹ء)

بہر حال حضرت مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھنے کا آغاز ”القاسم“ سے کیا اور آخر ”سوانح قاسمی“ کی چوتھی جلد لکھتے لکھتے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ملک کا کوئی قابلِ ذکر مجلہ ایسا نہ تھا جس کے صفحات ان کی قلم کاریوں سے رنگین نہ ہوں۔ بیسیوں کتابوں پر مقدمے لکھے، ہر اہم مذاکرے میں شرکت کی اور اپنے تجربے علمی کا لوہا منوالیا۔ محدثوں کی محفل ہو، یا فقہاء کی مجلسِ افتاء، موزخوں کی انجمن ہو، یا شاعروں کی سوسائٹی، ہر جگہ ان کی شخصیت جانِ محفل تھی۔ مولانا نے زندگی میں ہزاروں صفحات لکھے، درجن بھرا ہم کتابیں ان کی یادگار ہیں، مگر ایک دو کتابوں کے علاوہ کوئی کتاب باضابطہ طور پر نہ لکھی، کسی طرف سے تحریک ہوئی اور پھر

لگا رہا ہوں مضامین نو کے انبار

خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

وہ صفحات کے صفحات لکھتے چلے جاتے تھے اور کبھی نظر ثانی نہ کرتے، یہ فریضہ ان کے

مخلص احباب، عزیز شاگرد، یا ناشر اپنے طور پر کرا دیتے تھے۔ ”النبی الخاتم“ اور ”الدین

القیم“ ان کے شاگرد عزیز ڈاکٹر غلام دستگیر رشید (پروفیسر فارسی نظام کالج حیدرآباد) نے

ترتیب دیں۔ ”تدوین حدیث“ ”تفسیر سورہ کہف“ اور ”مقالات احسانی“ کی ترتیب و تدوین اور ذیلی سرخیاں مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب حیدر آبادی (حال کراچی) کی سعی و محنت کا نتیجہ ہے۔ مولانا سے کسی رسالے کے مدیر، یادوست نے فرمائش کی، موضوع سامنے آیا، تو پھر خیالات کا سیلاب نوکِ قلم پر آ گیا اور اسے صفحہ قرطاس پر قلم بند کرتے چلے گئے۔ ”النبی الخاتم“ اور ”مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت“ اسی طرح وجود میں آئیں، بعض اوقات لیکچر کی تیاری، یا کسی طالب علم کی رہنمائی کیلئے نوٹس لئے، بجز یہ نوٹس ضخیم کتاب بن گئے۔ ”الدین القیم“ ”اسلامی معاشیات“ ”تدوین حدیث“ اور ”تدوین قرآن“ اسی قبیل کی تالیفات ہیں۔ مولانا کی پہلی کتاب ”ابوزر غفاری رضی اللہ عنہ“ دیکھ کر حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ:

”اس کتاب کا مؤلف آئندہ چل کر عظیم محقق ثابت ہوگا۔“

چنانچہ حضرت تھانویؒ کی پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی ان علمی و تصنیفی خدمات کے صلہ میں ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

(ماخوذ ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک)

تحریک آزادی میں علماء کا کردار

برصغیر پاک و ہند میں آزادی کی تحریک اسی دن سے شروع ہو گئی تھی جب ایک بیرونی طاقت انگریز نے اس سرزمین پر اپنے پنجے گاڑنے شروع کئے تھے۔ سرانج الدولہ، ٹیپو سلطان اور دیگر مسلمان حکمرانوں کی انگریزوں کے خلاف جنگیں، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا فتویٰ جہاد، سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اسی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمانوں میں ایمانی حرارت پیدا کر کے صوبہ سرحد کی جانب سے انگریزوں کے خلاف پیش قدمی کی جائے اور ہندوستان کو غیر ملکی آقاؤں کے پنجے سے آزاد کرایا جائے۔ سید احمد اور شاہ اسماعیلؒ کے شہید ہو جانے کے بعد ان کے باقی ماندہ ساتھیوں نے سوات کی حدود میں ستھانہ کے قریب مرکز جہاد قائم کر کے طویل عرصے تک شیع حریت کو روشن رکھا اور انگریز حکومت کے خلاف مسلسل

لڑتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کو اس کی بہت مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی، انگریزوں نے آزادی کے بارے میں سوچنے والوں کو چن چن کر ختم کرنا شروع کر دیا اور اس ظالمانہ کارروائی کا نشانہ خاص طور پر اکابر علماء دیوبند حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، حافظ ضامن تھانویؒ وغیرہ علماء و مجاہدین بنے، جو تحریک آزادی کے قائدین میں سے تھے۔ یہ حضرات اکابر دیوبند بنفس نفیس جہاد آزادی میں شریک رہے، حضرت حافظ ضامن صاحبؒ شہید ہوئے اور باقی حضرات میں سے حضرت گنگوہیؒ گرفتار ہوئے، حضرت نانوتویؒ کو گولی لگی، مگر حق تعالیٰ نے ان کو دینی علوم کی اشاعت کیلئے زندہ رکھا، حضرت حاجی صاحبؒ اور مولانا کیرانویؒ وغیرہ علماء مکہ معظمہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ اس کے بعد ان حضرات کے جانشین شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند جو غلامی سے نفرت اور آزادی سے محبت کو جزو ایمان سمجھتے تھے، سر پر کفن باندھ کر نکلے اور آزادی کی تحریک کو بڑی سرسری سے آگے بڑھایا۔ تحریک ریشمی رومال، تحریک خلافت اور ترک موالات کی تحریک، ہنہنہ شیخ الہند کے جذبہ حریت کی واضح نشانیاں ہیں۔ حضرت شیخ الہند ان تحریک کے روح رواں اور عظیم قائد تھے۔ ساری زندگی انگریز حکومت کے خلاف جہاد کرتے رہے اور بالآخر بے پناہ قربانیوں کے بعد انگریزوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا گیا۔ بعد میں جب مسلمانوں کو ہندوؤں کے متعصبانہ رویے سے یہ خطرہ پیدا ہوا کہیں انگریز کے چلے جانے سے ہندو اکثریت کے پھندے میں نہ پھنس جائیں، تو حضرت شیخ الہند کے جانشینوں میں سے حکیم الامت تھانویؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے دو قومی نظریے کے تحت تحریک پاکستان کو حرز جان بنالیا، پھر اس کیلئے اتنی قربانیاں دیں کہ انگریز کو اپنا پورا بستر سمیٹنا پڑا اور ان اکابر علماء دیوبند کی مخلصانہ جدوجہد آزادی کے نتیجے میں مملکت خدا داد پاکستان نصیب ہوئی۔ تو مقصد یہ ہے کہ یہ سب کچھ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حکیم الامت تھانویؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور دیگر علماء کرام کی بے پناہ قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ ان حضرات نے آزادی کی ہر تحریک میں قائدانہ عملی حصہ لیا اور خصوصاً تحریک پاکستان میں پوری قوت سے کام کیا، چنانچہ اس سلسلے میں جناب

محمد اقبال صاحب سہیل لکھتے ہیں کہ:

”تحریک پاکستان میں صفِ اول کے جن علماء نے ملت کو جگانے اور آزادی کیلئے دن رات کام کیا، اس کی داستان بڑی ولولہ انگیز ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا اطہر علی، مولانا شمس الحق فرید پوری، مولانا جمال الدین فرنگی محل، مولانا عبدالحمید بدایونی، مولانا مفتی دین محمد خان، پیر صاحب سر سید شریف، پیر صاحب ماکی شریف، پیر زکوی شریف، پیر جماعت علی شاہ، مولانا داؤد غزنوی، مولانا راغب احسن، مولانا عبدالرؤف دانا پوری اور مفتی جعفر حسین اور جانے کتنے ہی مشائخ و علماء کرام نے خاموشی سے تحریک پاکستان میں عظیم الشان کردار ادا کیا تھا۔ برصغیر کے علماء کی اپنی ایک روایت رہی ہے کہ وہ کسی بھی پلیٹ فارم میں خود نمائی پسند نہ فرماتے تھے۔ کلکتہ میں ۲۶ تا ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جو آل انڈیا جمعیت علماء اسلام کی زبردست کانفرنس ہوئی تھی، اس میں پانچ سو صفِ اول کے علماء و مشائخ شامل تھے، اس کانفرنس کی تفصیلات روح پرور ہیں۔ مغربی دنیا میں تحریک پاکستان کے خلاف جو اہم کتابیں اور شدید تنقیدیں لکھی گئی ہیں، ان میں اس کانفرنس کی قراردادوں کو تحریک پاکستان کی کارفرما قوت قرار دیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ لیاقت علی خان مرحوم جس طبقہ سے کھڑے ہوئے تھے، وہ کانگریس کا گڑھ تھا، مگر مولانا ظفر احمد عثمانی اور مفتی محمد شفیع صاحب کی کوششوں نے لیاقت علی خان کو کامیاب کرایا اور یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے رفقاء کی سعی و کوششوں نے مسلم لیگ کو ہر میدان میں کامیاب کرایا اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی قیادت میں جمعیت علماء اسلام نے کانگریس اور جمعیت علماء ہند کو شکست سے دوچار کیا تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے صوبہ پنجاب جمعیت علماء اسلام کانفرنس لاہور جنوری ۱۹۴۶ء میں ”ہمارا پاکستان“ کے عنوان سے جو ولولہ انگیز اور تاریخی خطبہ پڑھا تھا، اسکی صدائے بازگشت دنیا بھر میں پاکستان پر لکھے گئے لٹریچر میں آج تک سنی جاتی ہے، جیسے کہ راقم نے عرض کیا ہے کہ برصغیر کے علماء کی اپنی ایک روایت رہی ہے۔ علماء و مشائخ کی بہت عظیم تعداد نے خاموشی سے کارفرما قوت کے طور پر کام آنا مناسب سمجھا۔ اس بات کے بھی

دلائل موجود ہیں کہ ڈاکٹر علامہ اقبال نے کئی دفعہ کوشش فرمائی کہ علماء قیادت کریں، لیکن علماء و مشائخ کا اپنا ایک انداز تھا، جسے وہ نشاۃ ثانیہ کے لئے مناسب اور درست قرار دیتے تھے اور پھر ان عظیم علماء نے مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کی رائے پر صادر کے اجماع کے ساتھ قائد اعظم کی قیادت کو نہ صرف چلنا تھا، بلکہ اس قیادت کو تسلیم کر کے پوری قوت سے تحریک پاکستان کیلئے بھرپور کام کیا تھا۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے نوائے وقت ۷ فروری ۱۹۸۶ء کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک عجیب و غریب بات کی، انہوں نے فرمایا کہ:

”علماء نے تحریک پاکستان میں ”معاونین کی حیثیت سے کام کیا تھا جو حضرات اجنبی عینک لگا کر تحریک پاکستان کا مطالعہ کرتے ہیں، بلاشبہ انہیں ڈاکٹر اسرار صاحب کی یہ بات پسند آئے گی، جاننا کہ یہ باہر تہجربہ پاکستان سے متعلقہ ریکارڈ کے بالکل منافی ہے۔“

صوبہ سرحد کارلینڈم علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع، پیر صاحب مانکی شریف اور پیر صاحب زکوڑی شریف کا مرہون منت تھا اور سلہٹ کارلینڈم مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا اطہر علی وغیرہ علماء کی کوششوں سے کامیاب ہوا تھا۔

یوپی مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں اسلامی نظام حکومت کا خاکہ بنانے کیلئے جو کمیٹی مولانا سید سلیمان ندوی کی سربراہی میں قائم کی تھی، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت میں علماء ”معاونین“ نہیں تھے، کہنے کی بات یہ ہے کہ علماء تحریک پاکستان میں کارفرما قوت کے طور پر کام کر رہے تھے، یہ ملک بنانے کی تحریک تھی، بنے بنائے ملک میں نظام ناند کرنے کی تحریک نہ تھی۔ اس تناظر میں دونوں کا عمل یکسر مختلف ہے، ملک بنانے کی اس تحریک میں اجنبی سامراج سے نکلنا اور ساتھ ہی اس سامراج کے ساتھ مشترک ہندو سامراجیت سے بھی واسطہ تھا اور آزادی لینی تھی۔ صورتحال سیاسی تناظر میں بے حد مختلف تھی۔ تحریک پاکستان میں علماء کارفرما قوتوں کے طور پر ملت کو جگانے اور اٹھانے کا کام کر رہے تھے، جب کہ اس وقت کی برصغیر کی چوٹی کی قیادت اہل الرائے حضرات اور بالغ نظر مفکرین نے اس سلسلے میں اقبال سے رجوع کیا تھا اور اقبال نے اپنے گہرے بصیرت و فکر سے کام لیتے ہوئے ایسے شخص کا چناؤ کیا، جو انگریزی سامراج کی باریکیوں سے پوری طرح واقف ہو، ہندو جاںکلیت کے مکروہ دھوکا کو خوب پہچانتا ہو، ملی جذبے سے سرشار ہو اور اسلام

کی بالادستی اور عظمت کا فکری ودلی طور پر قائل ہو اور سب سے بڑھ کر پختہ کردار کا انسان ہو، تحریک آزادی کی نوعیت ایسی ہی تھی، متعدد ریکارڈ پر یہ حقائق روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اقبال نے قائد اعظم محمد علی جناح کے چناؤ پر مولانا محمد علی جوہر سے ہی مشورہ نہیں کیا تھا، بلکہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے سب سے پہلے اس پر صاف کیا تھا اور قائد اعظم کی دینی تربیت اور دینی رہنمائی مولانا تھانویؒ ہی نے کی تھی، ان علماء نے پاکستان بننے کے بعد بھی بہترین رول ادا کیا تھا تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی شاندار اور عظیم خدمات ہماری تاریخ کا بنیادی حصہ ہے۔

(روزنامہ نوائے وقت، ۲ مارچ ۱۹۸۶ء)

دوقومی نظریے کی تائید و حمایت

ہندوستان کے طبقہ علماء دیوبند میں یہ شرف اور سعادت حضرت حکیم الامت تھانویؒ کو حاصل ہوا کہ سب سے پہلے پاکستان کا تخیل اور خالص اسلامی حکومت کا خیال آپ ہی نے پیش کیا تھا۔ اس کے ساتھ کانگریس کے معاملہ میں علی الاعلان کھلے بندوں قائد اعظم اور مسلم لیگ کی حمایت و اعانت اس وقت کی، جب پورے ملک میں سیاسی طوفان آیا ہوا تھا۔ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا یہ عقیدہ تھا کہ ہندو اور انگریز دونوں ناگ ہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جتنے کافر ہیں، سب اسلام کے دشمن ہیں، کوئی گورا ہو، یا کالا، دونوں ہی سانپ ہیں، بلکہ گورے سانپ سے کالا سانپ زیادہ زہریلا ہوتا ہے۔ اگر گورے سانپ کو گھر سے نکال دیا جائے، تو ڈسنے کو کالا موجود ہے جس کا ڈسا ہوا زندہ ہی مشکل سے رہتا ہے۔

حضرت تھانویؒ کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد ایک بہت بڑا فتنہ تھا، آپ دوقومی نظریے کے علمبردار تھے اور مسلمانوں کا کانگریس میں شریک ہونا دینی موت کے مترادف سمجھتے تھے۔ آپ نے مسلم لیگ کی حمایت میں کھلم کھلا اعلان کیا، تو مسلمان جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہو کر جنگِ پاکستان لڑنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس پر کانگریس مشتعل ہو گئی اور حضرت کو راستہ سے ہٹانے کے لئے قتل کے منصوبے بنانے لگی، بلکہ فی الواقعہ حضرت کے اعلان کی اشاعت کے بعد آپ پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا، مگر قاتل نہایت حق کی تائب نہ لاکر اٹلے

پاؤں واپس دوڑ گئے اور پھر ساری تحریک مسلم لیگ کے دوران کسی کو ایسی جرأت نہ ہوئی۔ سیاسی معاملات میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے اس استقلال و استقامت کو دیکھ کر محقق اسلام حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کو لکھا کہ:

”اللہ تعالیٰ حضرت تھانویؒ کے ”سایہ کومت اسلامیہ کے سر پر دیر تک صحت و سلامتی کے ساتھ قائم رکھے اور اس وقت کے طوفان کے اکیلے ملّاح کو اتنا تو وقفہ دے کہ کم از کم یہ طوفان سر سے ٹل جائے۔ علماء میں افسوس ہے کہ سب اُدھر ہی چلے گئے جدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں؛ ایک حضرت ہی ہیں جن سے اس جماعت کی آبرو باقی ہے۔“

(حکیم الامت: ۳۵۶)

حضرت مولانا گیلانیؒ جیسے اہل نظر محقق حضرت کی درازی سمر کیلئے دعائیں مانگ رہے تھے اور اہل غرض انہیں اپنے راستہ سے ہمیشہ کیلئے ہٹانے کی تیاریوں میں مصروف تھے، مگر یہ مردِ حق کارنگریسیوں کے تمام ناجائز حربوں کے باوجود مسلم لیگ کی حمایت سے باز نہ آئے۔ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے اس نعرہٴ حق کی تائید کرنے والی پہلی عظیم شخصیت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تھی، جو تحریک آزادی کے عظیم مجاہد حضرت شیخ الہندؒ کے سیاسی و علمی امور کے ترجمان تھے۔ علامہ عثمانیؒ اپنے استاد و مرشد شیخ الہندؒ کی طرح دو قومی نظریے کے حامی تھے۔ انہوں نے دو قومی نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

”ہندوستان میں جو سیاسی کشمکش اس وقت جاری ہے، میرے نزدیک اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ تنفر، بلکہ اشتعال انگیز جھوٹ اور سب سے بڑی اہانت آمیز دیدہ دلیری یہ ہے کہ یہاں کے دس کروڑ فرزندِ ان اسلام کی مستقل قومیت کا صاف انکار کر دیا جائے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ غلط، یا صحیح طور پر دنیا میں اقوام کی تقسیم وطن، نسل، زبان اور طرزِ تمدن وغیرہ کے لحاظ سے ہوتی رہی ہے اور اب بھی موجود ہے، لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے دنیا کی جو تعمیر جدید ہوئی، اس میں تخلیق کے اعلیٰ ترین مقاصد کے پیش نظر، اللہ کے پیدا کئے ہوئے تمام انسانوں کی باعتبار قومیت کے ایسی ثنائی تقسیم کر دی گئی، جس کے احاطہ سے کوئی فرد بشر باہر نہ رہ سکے۔ اب اسلامی نقطہ نظر سے گویا روئے

زمین پر دو ہی قومیں آباد ہیں: ایک وہ قوم جس نے فاطرِ ہستی کی صحیح معرفت حاصل کر کے اس کے مکمل اور آخری قانون کو اس کی زمین میں رائج کرنے کا التزام کر لیا ہے، وہ ”مسلم“ یا ”مومن“ کہلاتی ہے۔ دوسری جس نے اپنے اوپر ایسا التزام نہیں کیا، اس کا شرعی نام ”کافر“ ہوا۔

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ﴾

یاد رہے کہ ایمان و کفر کی یہ تقسیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی تھی، لیکن آپ سے قبل ہر نبی کسی مخصوص قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا، اسی لئے ان کی بعثت سے قومیتوں کے قائم شدہ امتیازات کلیہً مٹائے نہیں جاسکتے تھے، البتہ رحمۃ اللعالمین کی بعثت عامہ نے تشخصات اور محدود امتیازات کی قدر و قیمت گھٹادی، یا ختم کر دی، جن کو لوگوں نے اپنے جہل و تنگ نظری سے شرافت و کرامت کا اصلی معیار بنا رکھا تھا۔ اسی اساسی نقطہ نظر سے لامحالہ کل غیر مسلم قومیں دوسری قوم سمجھی جائیں گی اور اب اس چیز کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے امتزاج سے کوئی قومیت متحدہ صحیح معنی میں بن سکے۔

(خطبات عثمانی: ۴۷)

اسی دو قومی نظریہ کے تحت حضرت حکیم الامت تھانویؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے حصول پاکستان کی خاطر مسلم لیگ کی تائید و حمایت کی اور شریعت اسلامیہ کی روشنی میں متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سوا اِعظم کی رہبری و رہنمائی کا فریضہ انجام دیا، پھر اسی دو قومی نظریہ اسلام کی تائید و حمایت میں مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ، حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ اور حضرت مولانا اطہر علی صاحبؒ جیسے جلیل القدر علماء میدان میں نکلے اور اپنی تحریروں اور تقریروں سے مسلمانان ہندوستان کو شرعی حیثیت سے مطمئن کیا۔

محقق اسلام حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بھی اپنے شیخ حضرت حکیم الامت تھانویؒ اور اپنے استاذ محترم علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے سیاسی نظریات کی مکمل تائید و حمایت کی اور اپنے ان ہم عصر ممتاز علماء دیوبند کے شانہ بشانہ دو قومی نظریہ کے تحت تحریک پاکستان میں

اہم کردار ادا کیا، مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ان علماء و مشائخ نے خاموشی سے کام کیا، یہ حضرات خود نمائی کو پسند نہیں فرماتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ حضرات علماء دیوبند مسلم لیگ میں شرکت کر کے شریعت اسلامیہ کی روشنی میں متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی رہنمائی نہ کرتے، تو مسلم لیگ کی طرف ہوا کا رخ موڑنا اور نظریہ پاکستان کی طرف سیاست کے دھارے کا منہ پھیرنا، ناممکن نہیں، تو دشوار بہت تھا اور آنحضرت کی جمعیت علماء ہند دہلی کے اعظم کار، مجلس احرار کے شعلہ بیان مقرر، جماعت اسلامی کے نثار، انجمن خاکسار کے پیچھے بردار، صوبہ سرحد کے سرچوش ڈاکٹر خان اور گاندھی جی کے چیلے عبدالغفار خان، پنجاب کے یونیٹس انگریزوں کے حاشیہ بردار، سندھی جی ایم سیدوں کے نمک خوار سارے کے سارے قائد اعظم اور تحریک پاکستان کے یکسر مخالف تھے۔ سیاست کی اس گھٹا ٹوپ سیاہی میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ان روحانی فرزندوں اور جانشینوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے مخالفت کے بادلوں کو چھانٹ کر رکھ دیا اور مسلمانان ہند کو شرعی حیثیت سے دلائل اور براہین سے مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئے اور آخر کار پاکستان معرض وجود میں آ گیا اور مخالف طاقتیں ناکام ہو گئیں۔

(بحوالہ ہفت روزہ صوت الاسلام، لاہور)

دستور پاکستان کا خاکہ

پاکستان بنے ہوئے ابھی چھ سات ماہ ہی گذر رہے تھے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد مسلمانوں کو اس کی فکر ہوئی کہ جس غرض کیلئے پاکستان بنایا گیا اور جس کی خاطر ان علماء کرام اور لاکھوں مسلمانوں نے اپنے گھریار کو چھوڑا اور قربانیاں پیش کیں، اب اس کا دستور اسلام کے اصول صحیحہ پر ایسا مرتب ہو، جس کے تحت اسلامی نظام کی برکات کا مشاہدہ کر سکیں اور اسے دوسروں کے لئے نشانِ راہ کے طور پر پیش کر سکیں، چنانچہ کراچی میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے مشورہ سے کچھ مسلمانوں کی ایک جماعت نے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان کا دستور کتاب و سنت کے اصول پر بنانے کیلئے ایک خاکہ مرتب کیا جائے، جو ممبران اسمبلی کے سامنے رکھا جاسکے اور اسی کی روشنی میں دستور بنوانے کی سعی کی جاسکے۔ حضرت علامہ عثمانیؒ

مرحوم کے مشورہ سے مندرجہ ذیل چار علماء اس کام کیلئے تجویز ہوئے۔

۱۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

۲۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ

۳۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

۴۔ حضرت مولانا ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادیؒ

مگر حسن اتفاق ایسا ہوا کہ اس وقت کوئی بھی پاکستان میں موجود نہ تھا، سب کے سب ہندوستان میں مقیم تھے، حالانکہ ان حضرات کی زندگی سخت خطرہ میں تھی، کیونکہ ہندو انہیں اپنا دشمن تصور کرتے تھے کہ انہوں نے علامہ عثمانیؒ کے ساتھ مل کر جہاد پاکستان میں حصہ لیا تھا۔ خصوصاً حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے تو بہت ہی زیادہ دشمن تھے کہ وہ بڑے سرگرم عمل رہ چکے تھے، مگر بایں ہمہ انہوں نے پاکستان آنے کی سعی نہ کی تھی۔

ان حضرات کو پاکستان لانے کیلئے شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ نے مولانا احتشام الحق تھانویؒ کو ہندوستان بھیجا، مولانا تھانویؒ نے انہیں تدوین دستور کیلئے کراچی آنے کی دعوت دی۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ تو کسی عذر کے سبب اس وقت نہ آسکے، باقی تینوں حضرات کراچی کی اہمیت کے پیش نظر فوراً پاکستان آگئے اور وسط ۱۹۴۸ء میں یہ حضرات دستوری خاکہ مرتب کرنے میں مشغول ہو گئے اور قریباً تین ماہ میں ایک مختصر سا خاکہ علامہ عثمانیؒ کی زیر ہدایت مرتب کر لیا۔ کام ختم ہونے پر حضرت مولانا گیلانیؒ اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ تو واپس چلے گئے، مگر حضرت محمد شفیع صاحبؒ کو دو وجوہات کی بناء کراچی روک لیا گیا، ایک تو اسلئے کہ ان کا بھارت واپس جانا خطرہ سے خالی نہ تھا، دوسرے اسلئے کہ اس کام کی تکمیل کیلئے ان کا یہاں رہنا اشد ضروری تھا، بہر حال حضرت مولانا گیلانیؒ نے حضرت علامہ عثمانیؒ کے تلمیذ رشید ہونے کی حیثیت سے دو قومی نظریہ کے تحت تحریک پاکستان کی مکمل حمایت کی اور آخر دم تک پاکستان کے دلی طور سے خیر خواہ اور پاکستان میں نظام اسلام کے نفاذ کے خواہاں رہے، اسی لئے دستور پاکستان کے خاکہ کی ترتیب و تدوین کیلئے علامہ عثمانیؒ کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے اور دستور کی تیاری میں شانہ روز تین ماہ تک لگے رہے، پھر

چند مجبوریوں کے تحت واپس ہندوستان چلے گئے۔ وہاں ہندوستان میں مولانا گیلانیؒ مرحوم کئی انجمنوں اور علمی مجالس کی اعزازی رکنیت بھی رکھتے تھے اور ندوۃ المصنفین دہلی کے رکن تھے۔ ۱۳۵۰ھ سے ۱۳۶۷ھ تک آپ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں بھی شامل رہے اور اسی طرح ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کے اعزازی مدیر کی حیثیت سے ایک سال کام کیا۔ الغرض آخر دم تک علمی، دینی اور اسلامی خدمات میں مصروف رہے۔

(ماخوذ از تہمیر پاکستان و علمائے ربانی)

مقالات و مضامین

مذہب اور سائنس

علامہ سید مناظر احسن گیلانی

مذہب کا سنگ بنیاد:

ماضی کی تلاش، مستقبل کی فکر، بشری فطرت کی ایک قدرتی بے چینی ہے، جوں جوں انسانی دل و دماغ بلند و بیدار ہوتے جاتے ہیں، ان سوالات کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ ایک تنگ خیال، پست فطرت آدمی صرف اپنی ذات کے ماضی اور مستقبل کو سوچتا ہے۔ جو اس سے اونچا ہوتا ہے، وہ اپنے خاندان کو بھی اس خیال میں شریک کر لیتا ہے۔ اسی طرح جوان سے بھی عالی طبع ہوتے ہیں، وہ صرف خاندان، بلکہ قوم و وطن کے متعلق بھی غور کرتے ہیں، حتیٰ کہ فطرت انسانی کی بلندی کا ایک نقطہ وہ بھی ہے، جہاں ذات و خاندان، قوم و جنس ہی نہیں، بلکہ خود اس عالم کے متعلق یہ سوانح پیدا ہوتا ہے کہ کائنات کا یہ دریائے ناپید کنار، جس کے ایک گوشے میں آفتاب و ماہتاب تنکے کی طرح تیر رہے ہیں اور فطرت کا یہ بحر ذخار، جس میں ہر آن، ہر لحظہ کروڑوں ہستیاں ابھرتی اور ڈوبتی رہتی ہیں، آخر اس کا نقطہ آغاز اور ابتدائی سرچشمہ کیا ہے؟ اور گنبدوں کے ان چکروں کا آخری انجام کیا ہوگا؟ انسان جب تک انسان ہے، جب تک اس کے کاسہ سر میں جانوروں کا مغز نہیں، بلکہ انسانی دماغ کی بلندی اور ذہنی وسعت باقی ہے، یہ سوالات بھی باقی رہیں گے اور ان کو باقی رہنا چاہئے کہ اس جستجو کے بغیر انسانی زندگی کا ماضی و مستقبل، جز تاریکی کے اور کچھ نہیں ہے۔ آخر جس کا ماضی بھی تاریک اور مستقبل بھی اندھیرے میں ہو، کیا وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ روشنی میں ہے؟! کہاں سے آ رہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ جس مسافر کے لیے دونوں باتیں مجہول ہوں، اس کے سفر کا انجام معلوم!؟

ترجمہ: ”کیا جو اندھے منہ جا رہا ہے (نہ آگے کا حال اسے معلوم، نہ پیچھے

کا) وہ سیدھی راہ پر ہے، یا وہ جو کھڑا سیدھی راہ پر جا رہا ہے۔“

خلاصہ یہ ہے کہ گزشتہ اور آئندہ کے متعلق جتنی بلندی سے سوال اٹھایا جائے گا، اسی نسبت سے ہماری فطرت بھی بلند سے بلند تر ہوتی جائے گی، بلکہ سچ پوچھئے، تو اسی نسبت سے تاریکی بھی گھٹے گی اور روشنی بڑھے گی۔ بہر حال ہماری فطرت کے یہی دو مطالبے ہیں جو دراصل مذہب کے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ان کے سوا اور بھی چند سوالات ہیں، جو قریب قریب ان ہی دو سوالوں کی طرح ہماری فطرت کی گہرائیوں سے ابلتے رہتے ہیں اور مذہب کی تعمیر میں ان کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ اب ہم ترتیب کے ساتھ چند اہم سوالات کو ذیل میں بیان کرتے ہیں:

بنیادی سوالات

۱۔ عالم کا نقطہ آغاز کیا ہے؟
 ۲۔ اس کا آخری انجام کیا ہوا؟
 ۳۔ ہر چیز کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان کے کام آئے، پھر انسانی وجود کا کیا مقصد ہے؟

۴۔ کیا زندگی کی موجودہ کش مکش سے نجات کی کوئی صورت نکل سکتی ہے؟
 ۵۔ کیا بقائے دوام کی فطری خواہش مغالطی اور وہمی طور پر نہیں، بلکہ حقیقی معنوں میں پوری ہو سکتی ہے؟

۶۔ علمی اور عملی طور پر ہم میں سے ہر شخص غیر محدود ہونے کی خواہش رکھتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ جو چاہوں کروں اور جو کچھ چاہوں، جانوں، کیا فطرت انسانی کا یہ مطالبہ اپنے مقصد کو پاسکتا ہے؟

یہی سوالات ہیں جن کے جواب کا نام مذہب ہے، یہی پیاس ہے جس کے پانے کی تعبیر دین سے کی جاتی ہے، یہی وہ بھوک ہے، جس کی غذا صرف پیغمبروں کا پیغام ہے اور انہی سوالات کو حل کرنا مذہب کی اصل غرض و غایت ہے۔

مذہبی سوالات اور علوم عقلیہ

مذہب نے ان سوالات کو جن ذرائع سے حل کیا ہے، اس کے بتانے سے پیشتر یہ

دیکھنا چاہئے کہ مذہب سے کنارہ کش ہو کر کیا صرف عقلی علوم کی رہمائی میں ہم ان سوالوں کو حل کر سکتے ہیں؟ بحث کے لیے صرف اس سوال کو لو کہ عالم کا نقطہ آغاز اور انجام کیا ہے؟ کیوں کہ اس کے حل ہو جانے کے بعد تقریباً دوسرے سوالات خود بخود حل ہو جاتے ہیں، اب آؤ اور عقلی علوم کی روشنی میں ان کا جواب ڈھونڈو۔

یوں تو عقلی علوم کی بہت سی شاخیں ہیں، لیکن اجمالی طور پر ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک کا نام سائنس ہے اور دوسرے کو فلسفہ کہتے ہیں۔ پہلے ہم سائنس کو لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس معاملہ میں وہ ہماری کس حد تک مدد کر سکتی ہے؟

مذہبی سوالات اور سائنس کی حد پرواز

مذہب کے اس بنیادی سوال کو سائنس حل کر سکتی ہے، یا نہیں؟ اس کے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ سائنس کی حد پرواز کیا ہے؟ علماء سائنس نے اس علم کے حدود کو معین کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

سائنس کی بحث و تحقیق کا تعلق تمام تر فطرت (Nature) کے ان واقعات اور مشاہدات سے ہے، جو ہمارے زیر تجربہ آسکیں، لیکن جو چیزیں ہمارے احساس اور مشاہدہ کے دائرہ سے خارج ہیں، سائنس کو ان کے اقرار و انکار سے کچھ بحث نہیں۔

ماہرین سائنس کا اعتراف

پروفیسر لیٹر جو فرانس کا مشہور ماہر سائنس ہے، لکھتا ہے: ”کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں ہے، اس لیے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی، یا ابدی وجود کا انکار کریں، جس طرح ہمارا کام یہ بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں، ہمارا کام نفی و اثبات دونوں سے الگ رہتا ہے۔“

پروفیسر سٹڈل نے اس خیال کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اگر تم گھڑی کو دیکھو، اس میں گھنٹے، منٹ، سیکنڈ کی سوئیاں نظر آئیں گی، یہ سوئیاں کیوں پھرتی ہیں؟ اور ان کی حرکت کی باہمی نسبت جو ہمیں نظر آتی ہے، کیونکر قائم ہے؟ ان سوالات کا جواب گھڑی کے کھولے اور اس کے مختلف پرزوں کو اچھی طرح دیکھے اور ان کا ایک دوسرے سے تعلق

قائم کئے بغیر نہیں دیا جاسکتا ہے، جب یہ سب کچھ ہو لیتا ہے، تب ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ سویوں کی یہ خاص حرکت گھڑی کی اندرونی ساخت اور مشین کا نتیجہ ہے، جو کوک کی قوت سے چل رہی ہے، سویوں کی یہ حرکت صنعت انسانی کا ایک کارنامہ ہے، لیکن مجتہد یہی حال واقعات و حوادثِ فطرت کا ہے۔ عالم کی اس مشین کے اندر بھی ایک مخفی مشین کار فرما ہے اور ایک خزانہ قدرت ہے، جو اس مشین کو چلا رہا ہے۔ سائنس کا انتہائی کام اس مشین اور ذخیرہ قوت سے پردہ ہٹا کر یہ بتانا ہے کہ واقعات و حوادث ان ہی دونوں کے باہمی تعلق کا نتیجہ ہیں، لیکن کارخانہ عالم کی یہ اندرونی مشین خود کیا ہے؟ اور کیسے بنی؟ اور اس گھڑی کو کس نے کوک دی؟ اور اس کی چلانے والی قوت کہاں سے آئی؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب سائنس سے باہر ہے۔

انسان صرف کچھ جان سکتا ہے، کسی چیز کی تحقیق و ایجاد پر قادر نہیں

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس نہ تو قدرتی قوانین کو ایجاد کرتی ہے، نہ ان قوانین کی تمام کڑیوں کو سلجھا کر ہمارے سامنے پیش کر سکتی ہے، بلکہ حوادث و واقعات کے محض ان حلقوں کو ترتیب کے ساتھ ہمیں بتانے کی کوشش کرتی ہے، جو اس کے دائرہ احساس و مشاہدے میں آجاتے ہیں، مثلاً: وہ آگ میں جلانے کی خاصیت پیدا نہیں کرتی، بلکہ صرف یہ بتاتی ہے کہ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ جلاتی ہے اور اسٹیم کو ایجاد (وجود بخشا اور تخلیق کرنا) نہیں کرتی، بلکہ صرف اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے کہ جب آگ کا تعلق پانی سے ہوتا ہے، تو یہ ایک قدرتی قانون ہے کہ وہ بھاپ بن جائے۔ بہر حال ہمارے سامنے جو کچھ قدرتی قوانین پھیلے ہوئے ہیں ہم ان کو بتا نہیں سکتے، بلکہ صرف جان سکتے ہیں اور سائنس اس پر اتنا اضافہ اور کرتی ہے کہ اسی حد تک جان سکتی ہے، جس حد تک مشاہدہ ہمارا ساتھ دے گا، لیکن یہ سوال کہ ان قوانین کا مقنن کون ہے؟ ان کا نقطہ آغاز کیا ہے؟ اور ان کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائنس کے حدود سے ان کا جواب خارج ہے۔

بکسلے نے سائنس کی اسی در ماندگی کا اندازہ کرنے کے بعد بالکل سچ لکھا ہے کہ وہ کسی چیز کی بھی کامل توجیہ نہیں کر سکتی، اس کے سارے اسباب اول سے آخر تک نہیں بتائے

جاسکتے، کیونکہ انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ علم بھی توجیہ میں آغازِ اشیاء کی جانب چند قدم سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

حکیم اور عامی میں فرق

بہر حال انسان کی انتہائی پرواز سائنس کے نقطہ نظر سے صرف اس قدر ہے کہ کل نہیں، بلکہ فطرت کے صرف ان قوانین کو وہ جان سکتا ہے، جو حواس کی گرفت میں آجائیں، باقی رہا یہ سوال کہ جب صرف محسوس قوانین کی واقفیت تک عام انسانی پرواز ختم ہو جاتی ہے، تو حکیم اور عامی میں کیا فرق رہا؟ نوبات یہ ہے کہ گو عامی کا علم بھی مشاہدات اور محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے اور حکیم بھی اس دائرہ سے آگے قدم نہیں رکھ سکتا ہے، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ عامی آدمی کسی حادثہ، یا مظہر قدرت کو جب دیکھتا ہے، تو وہ اس کے اثرات کو دور تک نہیں لے جاسکتا، یعنی: ایک جزوی واقعہ سے کلیہ نہیں بتا سکتا اور حکیم ایک جزوی واقعہ کو دیکھ کر چونکتا ہے اور یہ دیکھنا شروع کرتا ہے کہ آیا یہ واقعہ اسی جزئیہ تک محدود ہے، یا آگے بھی بڑھ سکتا ہے؟ پس اگر اس میں کچھ وسعت نظر آتی ہے، تو چند جزئیات پر منطبق کرنے کے بعد اسی جزئیہ کو وہ کلیہ کی شکل عطا کرتا ہے اور اسی کو ”قانون“ کے نام سے موسوم کرتا ہے، مثلاً: نیوٹن نے سیب کو گرتے ہوئے دیکھا، اس طرح ہر شخص دیکھتا ہے، لیکن وہ چونکا کہ آخر کیوں گرتا ہے، اس کو محسوس ہوا کہ زمین کی کشش کا نتیجہ ہے، اب اس کشش کی خاصیت کو اس نے دوسری چیزوں میں ڈھونڈنا شروع کیا، بالآخر اس نے اعلان کیا کہ فضا میں جتنے کڑے تیر رہے ہیں، وہ سب جذب و کشش ہی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ بہر حال نیوٹن نے فضائی کڑوں کی خاصیت کا ایک علم حاصل کیا، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ان کڑوں کا موجود تھا، یا اس نے ان میں جذب و کشش کی خاصیت پیدا کر دی تھی، جو قانون پہلے سے موجود تھا، صرف اس کا علم اس نے حاصل کیا، اس سے زیادہ نہ اس نے کچھ کیا، نہ کر سکتا تھا۔ وہ خود کہتا ہے: ”عالم فطرت کی یہ نیرنگیاں (جذب و کشش) واجب الوجود کے ارادہ کے سوا اور کسی شے سے ظاہر نہیں ہو سکتیں، وہ واجب الوجود جو ہر جگہ اور ہمیشہ موجود ہے“۔ اور یہی حاصل سائنس کے تمام مسائل اور اختراعات کا ہے۔ بھاپ سے

کیتلی کے ڈھکنے کو اٹھتے ہوئے سب ہی دیکھتے ہیں، جس طرح اسٹیفن نے دیکھا، لیکن اسٹیفن نے اس جزوی مشاہدہ سے ایک کلیہ پیدا کیا اور اس کلیہ کو فطرت کے دوسرے قوانین، مثلاً: لوہے کی پلک، پیہوں کی گردش، اسی قسم کے میکاکی قوانین کے علم کے ساتھ وابستہ کر دیا، اس نے اپنے کسی پیدا کردہ قانون کو نہیں، بلکہ قدرتی قوانین کو اس شکل میں نمایاں کیا ہے، جسے ہم ”ٹرن“ کہتے ہیں۔

الغرض صنعت و حرفت والے قدرتی قوانین کے جزئیات سے کلیات کا علم حاصل کرتے ہیں، لیکن کسی چیز کی ایجاد (یعنی: اس کو وجود بخشنا) ایک غریب انسان کے بس کی بات نہیں، وہ فقط ”علم آدم الاسماء کلھا“ (سکھائے اللہ نے آدم کو سارے اسماء) کے اجمال کی تفصیل کر سکتا ہے، یہی اسے دیا بھی گیا ہے اور قرآن نے اسے ”تسخیر کائنات“ سے تعبیر کیا ہے۔

سائنس اور مذہب کے حدود

الحاصل جب سائنس کا سارا زور مشاہدات اور محسوسات پر ختم ہو جاتا ہے، تو خود اندازہ کرو کہ جن سوالات پر مذہب کی بنیاد قائم ہے، مثلاً: عالم کا نقطہ آغاز کیا ہے، جیسا کہ بکسلے نے کہا تھا کہ سائنس کا قدم آغاز اشیاء کی جانب چند قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، تو پھر آخری نقطہ تک اس کی رسائی کیوں کر ہو سکتی ہے۔ پس سچ یہ ہے کہ سائنس جہاں اپنی تحقیقات ختم کر دیتا ہے، مذہب وہیں سے اپنا درس شروع کرتا ہے، سائنس صرف عالم شہادت (عالم محسوسات) کے چند واقعات محسوسہ کو کلیات کی شکل میں پیش کر کے اپنے بازو ڈال دیتی ہے، محسوسات کے آگے قدم رکھتے ہی اس پر ریشہ طاری ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ آگے کیا ہے اور مذہب انسان کا یہیں سے ہاتھ پکڑتا ہے اور غیب (عالم غیر محسوس) کے سارے اسرار کو اس کے سامنے بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے، سائنس کچھ نہیں بتا سکتی کہ دنیا کی ابتدا کیوں کر ہوئی، مذہب آتا ہے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتا ہے، انسان مرنے کے بعد کہاں جاتا ہے اور اس پر کیا گزرتی ہے؟ سائنس اس کے جواب سے عاجز ہے اور مذہب اس کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ دنیا کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائنس متحیر

ہے کہ اس کا کیا جواب دے، مذہب آتا ہے اور اس حیرت کو مناد دیتا ہے۔ سائنس یہ تو بتاتی ہے کہ عالم کس کے لیے ہے، لیکن خود انسان کس کے لیے ہے، اس مقصد کو متعین کرنے سے یہ عاجز ہے۔ مذہب آتا ہے اور اس مسئلہ کو بھی صاف کر دیتا ہے۔ الغرض مذہب کا جس عالم سے تعلق ہے، سائنس کی ہدایت کا چراغ اس کے حدود تک پہنچتے ہی گل ہو جاتا ہے۔ میلن ایڈورڈ کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کہ عالم کے ان قوانین کی نسبت یہ کہنا ہے کہ یہ محض بخت و اتفاق کے نتائج ہیں، یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں ہیں، جسے لوگوں نے محسوسات کا لقب دے رکھا ہے، فزیکل سائنس جاننے والا ہرگز اس قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

(بحوالہ الکلام از مولانا شبلی)

اس کے بعد عوام الناس کا یہ خیال کہ سائنس کی جدید تحقیقات نے مذہب کی بنیادیں ہی ہلا دی ہیں، جیسا کہ گنیزو نے غایت گستاخی کے ساتھ لکھا ہے کہ ہم نے خدا کی عارضی خدمات کا شکریہ ادا کر کے اس کو سرحد پار پہنچا دیا۔ (نعوذ باللہ تعالیٰ شانہ) کس درجہ جاہلانہ اور مضحکہ خیز ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ ”اگر خشکی کی ٹرین سمندر کے جہاز سے ٹکرا سکتی ہے، تو سائنس بھی مذہب سے ٹکرا سکتی ہے“۔ مطلب یہ ہے کہ جب دونوں کے حدود جدا جدا ہیں، ایک کی تنگ و دو محسوسات کے تنگ دائرہ تک محدود ہے اور دوسرا فضا کا شہباز ہے، تو ان دونوں میں تصادم کا کیا مطلب ہو سکتا ہے...؟

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس اور مذہب بالکل دو جداگانہ چیزیں ہیں، نہ ان دونوں میں اختلاف ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ ہم سائنس کے ذریعہ آسمان کے تاروں کو گن سکتے ہیں، آفتاب کو ناپ سکتے ہیں، ہوا کو تول سکتے ہیں، سمندر کو خشک کر کے بادل بنا کر پانی برسا سکتے ہیں، بلکہ ممکن ہے کہ آئندہ مردوں کو زندہ کرنے کی تدبیر بھی معلوم ہو جائے، جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ”احیاء موتی“ (مردے کو زندہ کر دینے) پر بھی آدمی قادر ہو جائے گا، بلکہ زندہ کرے گا، دوسرے لفظوں میں اس کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ انسان زندگی کے قانون سے بھی واقف ہو جائے گا اور سائنسدانوں کا بھی بیان ہے کہ ہم نے ”ختم حیات“ (پروٹوپلازم) کا پتہ چلا لیا ہے۔ کیمیا والے کہتے ہیں کہ ختم حیات کاربن، آکسیجن، نائٹروجن کی باہمی ترکیب سے تیار ہوتا ہے۔ تو سائنس یہ سب کچھ کر سکتی ہے اور ہم منتظر ہیں

کہ وہ ایسا کرے، کیونکہ ہمارے بہت سے ایمانی دعوؤں کی توثیق انہیں انکشافات پر موقوف ہے، لیکن یائیں ہمہ مذہبی سوالات کے حل میں سائنس اس طرح عاجز رہے گی، جس طرح پہلے تھی اور اس وقت تک ہے۔

فرض کیجئے کہ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے ہم نے زندگی کو پیدا بھی کر لیا، تو اس سے یہ مسئلہ کہاں حل ہوا کہ ان عناصر کی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے کہ زندگی کا راز کسی زمانے میں یوں حل کیا گیا تھا کہ زراور مادہ کے باہمی اختلاط کا یہ نتیجہ ہے، لیکن اس وقت بھی یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس اختلاط سے یہ نتیجہ کیوں نکلتا ہے؟ اب یہ سوال اسی طرح باقی رہے گا کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ، آکسیجن اور ہائیڈروجن کی باہمی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ جو شخص اس سے واقف ہے کہ تخم کو مٹی میں ملانے اور پانی دینے سے پودا پیدا ہو جاتا ہے، کیا اس نے سوال کو حل کر لیا کہ پودا کیوں پیدا ہوتا ہے؟ پروفیسر سٹڈل نے بلفاسٹ کے لکچر میں ایک موقع پر کتنی اچھی بات کی کہ لیکن کیوں؟ اس کا جواب ہمیشہ کے لیے اسی طرح ناممکن رہے گا، جس طرح کہ پہلے رہا ہے۔ امجد حیدر آبادی نے بھی اس مضمون کو ایک شعر میں ادا کیا ہے۔

امجد ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں
ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

الحاصل کسی شے کے آغاز کا پتہ چلانا اور اس کے آخری انجام تک پہنچنا سائنس کی رہنمائی میں ناممکن ہے، چند قدم چل کر اس کو اپنی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، علی الخصوص جب حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور یہی حال انجام کا ہے کہ آئندہ کیا ہوگا، موجودہ قوانین کا آئندہ کیا حال ہوگا، ان کے آثار و نتائج کیا ہوں گے؟ اس کا بھی کوئی قطعی جواب سائنس نہیں دے سکتی۔ وہی ہکسلے جس نے آغاز کے متعلق انسان کے جاہل ہونے کا اعتراف کیا تھا، اب انجام سے متعلق بھی اسی اعتراف کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے: "عالم تو بڑی چیز ہے، سائنس کا معمولی قانون یہ ہے کہ جو پتھر بے سہارا ہوگا، اس کو زمین پر گر پڑنا چاہئے، لیکن ہمیشہ کیا یہی ضرور ہوگا۔"

اس کے نزدیک یہ قانون نہیں، بلکہ انسان کا وہی اضافہ ہے، اس کا اپنے الفاظ یہ

ہیں۔ ”وہ ڈراؤنا لزوم اور ضروری ہونے کا قانون کیا ہے؟ جس نے لوگوں کو اس قدر خائف اور وحشت زدہ بنا رکھا ہے، سچ پوچھو، تو یہ ہمارے واہمہ کا ایک گھڑا ہوا بھوت ہے، سائنس ہی کا یہ قانون ہے کہ پتھر جب بے سہارا ہوگا، تو اس کو زمین پر گر پڑنا چاہئے، لیکن آئندہ وہ ہمیشہ گر ہی پڑے گا، یعنی: اس کے خلاف ہونا ناممکن ہے، یہ ایک ایسی زائد شے کا اضافہ ہے، جس کا نہ تو مشاہدہ اور واقعات میں نشان ملتا ہے اور نہ کہیں اس سے پتہ چلتا ہے۔“ (ماخوذ از فزیکل سائنس آف لائف) یعنی: یہ ایسا حکم ہے، جس کی شہادت ہمارے حواس نہیں دیتے۔

سائنس کی یہ رائے تو انجام کے متعلق تھی۔ رہا آغاز اس کے متعلق میں نے چند اقوال پہلے بھی درج کئے ہیں، لیکن آخر میں بکسلے ہی کے قول کو پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔ وہ اپنی کتاب ”اصول و نتائج“ میں لکھتا ہے: ”وجود کی علت اولیٰ کا مسئلہ میرے حقیر قویٰ کی دسترس سے باہر ہے، جتنی لائینی ہرزہ سرائیوں کے پڑھنے کا مجھے موقع ملا، ان میں سب سے بدتر ان لوگوں کے دلائل ہوتے ہیں، جو آغاز عالم کے متعلق موشگافیاں کرتے ہیں، مگر ان لوگوں کے مہملات ان سے بھی زیادہ بڑھ جاتے ہیں، جو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں ہے۔“

مذہبی سوالات اور فلسفہ

مذہب جن سوالات کو حل کرتا ہے، میں نے بتایا کہ ان میں اہم ترین سوال عالم کے آغاز و انجام ہی کا تھا، باقی سوالات انہیں دو سوالوں کی ذیلی اور تفصیلی شکلیں ہیں، سائنس تو یہ کہہ کر اکھاڑے سے نکل گئی کہ ان سوالات کا تعلق غیب سے ہے اور ہماری بحث کا دائرہ چونکہ صرف محسوس قوانین تک محدود ہے، اس لیے غیر محسوس قوانین کے سوالوں کے جواب ہمارے فرائض میں داخل نہیں۔ اب فلسفہ کی اونچی دکانیں سامنے آتی ہیں، آؤ! ذرا ان کی بھی سیر کر لیں۔ سنا جاتا ہے کہ اس علم میں محسوسات کی چار دیواریوں کو پھاند کر، محسوس قوانین کے دائرہ سے نکل کر ان امور کا بھی پتہ چلایا جاتا ہے، جو مشاہدہ اور تجربہ کی گرفت سے باہر ہیں اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے، فلسفہ کے شعبہ مابعد الطبیعیات (فزکس) والوں

نے ان سوالات کو بھی چھیڑا ہے، جن کی گرہ کشائی کا محض مذہب حق دار تھا اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی علم سے اگر مذہب کی لکر ہو بھی جاتی ہے، تو وہ محض فلسفہ ہے، بلکہ فلسفہ کی صرف ایک شاخ مابعد الطبعیات ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ تاریخ، ریاضی، ہندسہ، کیمیا، طب اور دیگر میکانکی علوم، یا صنائع نے نہ کبھی مذہب کے میدان میں قدم رکھا اور نہ کبھی ان سے مذہب کو اختلاف ہوا، صرف فلسفہ ہی ایک ایسا علم ہے، جس میں غیبی حقائق اور مذہبی امور کو عقلی گرفت میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کوشش میں کبھی کبھی وہ مذہب سے متصادم ہو جاتا ہے، یہی معمولی تصادم ہے، جس کی بنیاد پر اس زمانہ میں ہنگامہ برپا کر دیا گیا کہ علم نے مذہب کی بنیادیں ہلا دیں، حالاں کہ میں بتا چکا ہوں کہ اگر ”علم“ سے مراد بعد الطبعیات کے سوا کوئی اور علم ہے، تو اس سے زیادہ بے بنیاد، گندہ اور فریبہ جھوٹ ممکن نہیں اور اگر صرف ”مابعد الطبعیات“ مراد ہے، تو اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک حد تک درست ہے، لیکن فلسفہ کے نادان مرید اپنے پیروؤں کو جتنی بلندی پر لے جا کر اڑانا چاہتے ہیں، واقعات بتائیں گے کہ وہ قطعاً اس کے مستحق نہ تھے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مابعد الطبعیات میں جن امور کے متعلق رائے قائم کی جاتی ہے، چونکہ ان کا تعلق مشاہدات اور تجربات سے نہیں ہوتا، اس لیے کچھ قیاسات اور تخمینے، ظنون اور اندازے ہوتے ہیں، جن کے بل پر رائے قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے اور یہی ہونا بھی چاہئے کہ ان رایوں میں اختلاف اور شدید اختلاف پیدا ہو جائے، ہر شخص اپنی دماغی خصوصیت، موروثی اثرات اور ماحول کے غیر شعوری تاثرات کے تحت ایک تجویز پیش کرتا ہے، جو دوسرے سوچنے والوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے، اس کا صحیح اندازہ فلسفہ کی تاریخ پڑھنے سے ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند اندھے ہیں، جو آنکھ سے ہاتھی کو دیکھ نہیں سکتے اور صرف چھو کر اس کی شکل و صورت کے متعلق رائے قائم کر رہے ہیں۔ ہر ایک نئی مثالوں اور جدید تشریحوں کے قالب میں اپنے نتائج کو ڈھال کر پیش کر رہا ہے۔ بہر حال یہ آپس میں جتنا چاہیں الجھیں، مجھے اس سے کیا بحث! میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ فلسفہ اور مذہب کے اختلاف کا بظاہر اس زمانہ میں بڑا ڈنکا پینا جا رہا ہے، دیکھیں تو سہی اس طبل بلند بانگ کے اندر بھی کچھ ٹپ۔ یا نہیں؟

رسول اکرم ﷺ کی مدنی زندگی

سید مناظر احسن گیلانی

جن کوتاہ بینوں نے ”دل“ کا اقرار کیا تھا، لیکن ”دماغ“ پر ان کو اب تک شک تھا، اب ان ہی تنگ نظروں کے لیے دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے، جس میں ”دل“ سے زیادہ ”دماغ“ ہی کی نمائش ہوگی، تاکہ وہ وہی شوشہ بھی مٹ جائے، جس کی آڑ میں جاننے کے بعد نہ جاننے کے لئے چھپنے والے چھپ رہے ہیں۔

اور دیکھو کہ دماغی تجربات پینہ کی اسی کش مکش سے وہ ترشی بھی نچوڑی جائے گی، جس سے ان خود بینوں کا نشہ پھاڑا جائے گا، پھٹ جائے گا، جن کے پاؤں ”سر بلندی و علو“ کے نمار کے ہاتھوں جاننے کے بعد بھی ماننے سے اب تک ڈگمگا رہے ہیں، تاکہ حجت پوری ہو:

﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ﴾

(الأنفال: ۴۲)

”جو مرنا چاہے، وہ کھلے بندوں سب کچھ دیکھ کر مرے اور جو جینا چاہے، وہ بھی کھلے بندوں سب کچھ دیکھ کر جئے۔“

مدنی زندگی کے شروع میں جو یہ دکھایا گیا ہے کہ ”ہوانی علی الناس“ کے

فریادی کو ”الناس“ اور ”ناس“ کے ساتھ جو کچھ ہیں، سب پر اس کو وزن بخشا جا رہا ہے، یا طائف کی گلیوں میں جو رد کیا گیا تھا، ”سلع“ پہاڑ کے دامن میں سب اسی پر رد کئے جا رہے ہیں، بھوکوں کیلئے روٹی لے کر دوڑے آتے ہیں، پیاسوں کے لیے پانی لے کر دوڑے آتے ہیں، گاتے ہیں، بجاتے ہیں، باہم ایک دوسرے کو لاکارتے ہیں، ابھی ابھی جس کی جمادی چٹانیں ”ہلم الی یا رسول اللہ“ کے ساتھ پکار رہی تھیں، اسی کو انسانی زبانیں آگے آگے بڑھ بڑھ کر ٹھیک اسی طرح:

”یا رسول اللہ ہلم الی القوة و النعمة“

”اے اللہ کے رسول! زور اور حفاظت کی طرف آئیے۔“

عرض کرتے ہوئے جان حاضر کرتے ہیں، مال حاضر کرتے ہیں، تو یہ مدینہ کا نہیں، بلکہ قرن الثعلب کے موڑ پر طائف سے نکلنے ہوئے جس عمل کا ردِ عمل ”ملاءِ اعلیٰ“ سے شروع ہوا تھا، یہ اسی تسخیری قوت کا ظہور ہے، جو ”مکہ“ میں بھی ظاہر ہوا، ”ثور“ میں بھی ظاہر ہوا۔

”ثور“ سے نکلنے کے بعد بھی ظاہر ہوا، ”قبا“ میں بھی ظاہر ہوا، جہاں خالق کا جو دروازہ مخلوقات کے لیے بند تھا، صدیوں کے بعد پہلی دفعہ قبا کی مسجد بنا کر کھولا گیا، تاکہ جس کسی کو جہاں کہیں زمین پر قابو بخشا جائے، پہلا کام یہی کرے اور اب مدینہ میں بھی اسی ردِ عمل کا ظہور ہو رہا ہے، آئندہ ہوتا رہے گا، اسی کا ظہور ”کوفہ“ میں بھی ہوگا، ”دمشق“ میں بھی ہوگا، ”بغداد“ میں بھی ہوگا، ”غرناطہ“ میں بھی ہوگا، ”قاہرہ“ میں بھی ہوگا، ”غزنی“ میں بھی ہوگا، ”دہلی“ میں بھی ہوگا اور کیا بتاؤں کہ کہاں کہاں ہوگا، کب تک ہوگا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابد تک اب تو صرف اسی کا ظہور ہے، اسی کو نمود ہے، اسی لئے ”مدنی زندگی“ کے اصلی عناصر یہ واقعات نہیں ہیں، بلکہ یہ تو ”مکہ“ ہی کے آثار ہیں، جنہیں تم اب ”مدینہ“ میں دیکھ رہے ہو، بلکہ ”مدنی“ زندگی میں تم کو وہ باتیں تلاش کرنی چاہیں، جن میں ”دل“ سے زیادہ ”دماغ“ کا ”اخلاق“ سے زیادہ ”عقل“ کا تجربہ ہو۔

”مکہ“ میں جس طرح دیکھا گیا تھا کہ اس ”دل“ سے بہتر کوئی دل نہیں، اسی طرح ان باتوں کا مطالعہ ”مدینہ“ میں کرو، جن کو دیکھ کر کہا جائے کہ اس ”دماغ“ سے بہتر کوئی ”دماغ“ نہیں۔ ظاہر ہے کہ مدینہ میں سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ مسجد نبوی بنائی گئی اور اسکے ساتھ ”صفہ“ کا مدرسہ بنایا گیا، لیکن کیا صرف مسجد نبوی بنائی گئی اور مدرسہ بنایا گیا، مسجد اور مدرسہ کون نہیں بناتا اور کہاں نہیں بنتے، پھر اس میں بڑائی کیا ہے، باوجود استطاعت و قدرت کے پختہ اینٹ کے اور پتھر سے نہیں بنائی گئی، بلکہ کھجور کے تنوں اور شاخوں اور کچی اینٹوں سے بنائی گئی، بلاشبہ اس میں یہ نمونہ ضرور ہے کہ مسلمان جس آبادی میں پہنچیں، سب سے پہلے، وہ اپنے گھر سے بھی پہلے، وہاں خدا کی عبادت کی مسجد کی نیوکھودیں کہ مسجد ہی اسلام کی میخ ہے، اسلامی آبادی بناتے ہوئے سب سے پہلے چاہئے کہ اس میخ کو ہر مسلمان اس جگہ گاڑ دے، جہاں وہ آباد ہوتا ہے، تعمیری تکلفات کا بیج سے وقت نہ ہو، اس لئے

سب سے پہلی مسجد کا نمونہ وہ رکھا گیا، جسے ہر شخص گاڑ سکتا ہے، ہر جگہ گاڑ سکتا ہے، آخری تعمیری سامان کے لحاظ سے جو مسجد بھی ہوگی، اس سے کیا کم ہوگی جو مسلمانوں کی سب سے پہلی مسجد تھی.....؟! اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسجد مدرسہ کے ساتھ ہو۔ ”علم“ دین ہے، ”دین“ علم ہے، عملاً اس نمونہ سے اس کی تعلیم دی گئی۔

میں نہیں کہتا کہ اس مسجد و مدرسہ کے بنانے میں یہ مصالح بھی پیش نظر نہیں تھے، یا آئندہ مسلمانوں کو اس نمونہ کے پیچھے نہیں چلنا چاہئے، لیکن دیکھا گیا، پر سوچنا نہیں گیا، آخر مسجد عرب میں بنتی ہے، عرب میں کعبہ موجود تھا، جو صرف عرب جاہلیت ہی میں نہیں، بلکہ اسلام میں بھی محترم تھا، لیکن بایں ہمہ اس مسجد کا قبلہ عرب سے باہر فلسطین کے سلیمانی ہیکل کو کیوں ٹھہرایا جاتا ہے.....؟

لوگ سمجھے کہ صرف قبلہ مقرر ہوا، لیکن یہ کسی نے نہیں دیکھا کہ ”وطنیت“ کا جو بت عرب میں صدیوں سے پوجا جاتا تھا اور اس زور و شور سے پوجا جاتا تھا کہ اس کا پجاری اپنے سوا سب کو ”عجم“ اور گونگا سمجھتا تھا، دیکھو کہ صرف ایک اسی مخفی ضرب نے اس بت کو پاش پاش کر دیا۔ جب قرآن میں ہے کہ ابتداء عربوں پر یہ ”غیر ملکی“ قبلہ گراں گزرا، تو یہی غور کرنا تھا کہ کیوں گراں گزرا؟ لیکن اب تو گرائیوں کے برداشت کا انہوں نے عہد کیا تھا، جھجکے، مگر اسی کے ساتھ ہی آگے بھی بڑھ گئے، اور جو ادا گیا، لا دلیا، سترہ مہینے تک اس وطنیت شکنی کی مشق نے جب ان کیلئے عرب اور غیر عرب کو ایک بنا دیا، تو اس سے بھی عجیب اور عجیب تر تماشا پیش ہوتا ہے۔

بیت المقدس کو قبلہ بنا کر عرب کے باشندے عرب سے الگ کئے گئے، لیکن اب عرب نہیں، بلکہ عرب اور غیر عرب خدا کی ساری زمین سے یہ عرب اور غیر عرب کا قصہ ہی ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا جاتا ہے، سترہ مہینے کے بعد قبلہ بدلتا ہے اور بجائے سلیمان کی ہیکل کے سلیمان علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام اور اسمعیل علیہ السلام کے باپ ابراہیم علیہ السلام کے بنائے کعبہ کو ”قبلہ“ ٹھہرا کر حکم دیا جاتا ہے:

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾

”اور جہاں سے تم نکلے، اسی جگہ سے تم اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف (منہ) موڑ دو، اور جہاں کہیں (انے مسلمانو!) تم ہو، اپنے چہروں کو اس طرف موڑ دو۔“

کیا مقصد ہے اس کا؟ یہی کہ جو کعبہ سے باہر کئے گئے ہیں، وہ بھی کعبہ کے اندر ہیں اور جو کعبہ سے باہر تھے، اپنے کو کعبہ کے اندر سمجھیں، پہلے غریب عرب کو عرب کا قبلہ بنایا گیا اور جب یہ ہو چکا تو پھر عرب اور غیر عرب سب کو منا کرنے عرب ہی رہا، نہ غیر عرب رہا، بلکہ خدا کی جو ایک دنیا تھی، وہ ایک ہی دنیا کی شکل میں واپس آگئی، کعبہ دنیا کی مسجد کی دیوار ٹھہرایا گیا اور بسط زمین اسی دیوار کا صحن قرار پایا، یہی ہر مسلمان سمجھتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہے، وہ افریقہ کو بھی کعبہ میں سمجھتا ہے اور امریکہ کو بھی اسی کے صحن کا ایک حصہ قرار دیتا ہے، ایشیا بھی اس کو کعبہ کی دیواروں کے نیچے نظر آتا ہے، یورپ میں بھی جب اس کو نماز کی ضرورت ہوتی ہے، تو کعبہ کے آنگن میں کھڑا ہو کر وہ اپنی نماز ادا کرتا ہے، اور سٹ اسی کے صحن کا ایک ٹیلہ ہے اور ”بحر محیط“ اسی صحن کا ایک حوض، بحر قلزم اسی صحن کی ایک نالی ہے، ایک مسلمان اپنی زندگی کے ہر دن میں پانچ وقت اس نظریہ کی عملی شکل میں مشق کرتا ہے، اسی کو یہی بتایا گیا ہے، صحیح حدیث میں ہے:

”جعلت لی الارض مسجداً“

”پوری زمین میری (لیے) مسجد بنائی گئی ہے۔“

”وطنیت“ کے اس صنم اکبر کو توڑنے کے ساتھ اب ”قومیت“ اور ”نسلیت“ کا بت سامنے آتا ہے، کس قدر سرسری طور سے لوگ گزر جاتے ہیں، جب سنتے ہیں، یا کہتے ہیں کہ ”مدینہ“ میں انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ کرایا گیا تھا، ان میں عقد موآخات قائم کیا گیا تھا، لیکن اسکا نتیجہ کیا ہوا، مہاجرین قریش اور قریشی نسل کے ساہوکار کعبہ کے کلید بردار تھے، اور انصار قبیلہ اوس و خروج کے کسان اور کاشت کار تھے، حالانکہ دونوں انسان تھے، لیکن جس طرح آریائی نسل والوں نے سامی نسلوں کو اور سام نسلوں نے تورانی نسلوں کو، یا برہمنوں نے شوروں کو، بے رنگوں نے رنگینوں کو، پھیکوں نے نمکنیوں کو، آدمی کو نہیں، بلکہ گھوڑوں کی اولاد تیل کی نسل سمجھا اور اسی قسم، بلکہ ان سے بدتر نسلوں کو انہوں نے ان لوگوں

کے ساتھ روارکھا، جوان کے ہم نسل، ہم قوم نہ تھے۔

قریش کو اپنے نسب پر اپنے حسب پر بڑانا ز تھا، نسبی فخر ایک دیوتا تھا، جو صدیوں سے ان میں پوجا جاتا تھا اور اس طرح پوجا جاتا تھا کہ غیر قریشی عربوں کے ساتھ یہ لوگ حج کرنے میں بھی اپنی اہانت محسوس کرتے تھے، جس طرح آج بھی اُجلے کالوں کے ساتھ دعا مانگنے میں اپنی ذلت سے ڈرتے ہیں، قریشی اس قبرستان میں بھی دفن ہونا تنگ خیال کرتے تھے، جس میں کوئی غیر قریشی بیچارہ دفن ہوتا، جس طرح آج بھی شوروں کی مسان برہمنوں، چھتریوں کے مرگھٹ سے دور ہوتی ہے، یہی مواخات کا گزر تھا، جس نے اس بت کو بھی ڈھیر کر کے رکھ دیا، قریشی سردار انصاری کسان کے آگے جھکا ہوا تھا، وہ اس کے ہاتھ چومتا تھا، اور یہ ان کے قدم لیتا تھا، یہ اسکو اپنا سب کچھ، بلکہ تم نے سنا ہو گا طلاق دے کر ایک بیوی تک دینے پر اصرار کرتا تھا اور وہ شکر یہ کے ساتھ انکار کرتا تھا۔

اور یوں مخلوقات، بلکہ اپنے خود ساختہ مخلوقات کے بچوں سے آزاد ہو کر مدینہ والوں نے اپنے کھوئے ہوئے رب قیوم کو پالیا تھا، اسی کے بعد منادی کرادی گئی کہ اب دنیا ایک ہے، اس کا معبود ایک ہے، ان کا رسول ایک ہے، ان کی کتاب ایک ہے، ان کا کعبہ ایک ہے۔

اور دیکھو کہ دن کے پانچ وقتوں میں کڑک کڑک کر، گرج گرج کر بلند میناروں سے پکارنے والے مشرق میں، مغرب میں، زمین کے آخری کناروں تک یہی پکار رہے ہیں، پکارتے رہیں گے، کیا ناقوس سے، بوق سے، قرنا سے، گھنٹوں سے، طبل سے، نقاروں سے یہ بات ممکن تھی، جس کی ابتداء اذان کے عجیب و غریب ندائی طریقہ سے اسی کے بعد زمین پر اسلام کی سب سے پہلی مسجد میں کی گئی، متعدد وطنوں کا بت ٹوٹ گیا، متعدد نسلوں کا صنم پُور پُور ہو گیا۔

جو توڑے گئے، جٹ گئے، جو بکھیرے گئے تھے، سٹ گئے، الغرض جو ایک تھے، وہ ایک ہی ہو گئے اور اسی یکتائی کا خلاصہ وہ ہے، جس کا اعلان اذان کی شکل میں پانچوں وقت کیا جاتا ہے، محض فکر و خیال میں نہیں، بلکہ واقع میں عملی طور پر مدینہ میں دنیا کا یہ نقشہ قائم ہو گیا، انسانیت کی آزادی کا یہی عالمگیر نقشہ تھا، جس کو عالم پر منطبق کرنے کیلئے ”کسافہ

للناس“ کا بشیر و نذیر اب ”کافة الناس“ کی طرف بڑھتا ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)
 اس کو اختیار تھا کہ ”قرن الثعلب“ کے پاس اس کو جو ”اخشین“ (۲ پہاڑ) دیئے گئے
 تھے، ان ہی کو لے کر آگے بڑھتا، لیکن یہ تو پھر دل کا امتحان ہو جاتا، حالانکہ اب تو صرف
 ”دماغ“ ہی کا تجربہ کرانا مقصود ہے، دکھایا جاتا ہے کہ جس کے دماغ کے یہ کارنامے ہیں،
 اس کو مجنون کہنے والے کیا خود مجنون نہیں ہیں، جس کی عقل، جس کے فہم کے یہ کرشمے ہیں،
 اس کے عقلی توازن میں نقص نکالنے والے کیا ایسے بد بخت خود عقلی توازن سے محروم نہیں
 ہیں.....؟

راستہ اگر صاف ہوتا، تو اس وقت جو کچھ دکھانا ہے، باطل طور پر دکھایا نہیں جاسکتا تھا،
 لیکن دیکھو! راہ میں کانٹوں کے جو گھنے جنگل چپ و راست اوپر اور نیچے ہر طرف سے
 گھیرے ہوئے ہیں، وہ تصداً ان ہی میں گھس کر نکلتا ہے اور کتنے شاندار طریقہ سے نکلتا
 ہے۔

بیابان کے ایک نخلستانی قصبہ کے ان کسانوں کی آبادی سے یہ تحریک عالم کی طرف
 یلغار کرتی ہے، جو یہودی سا ہو کاروں کے سود و سود کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، ان
 کی زمینوں میں پیدا ہی کیا ہوتا ہے، لیکن جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے، پیدا ہونے کے ساتھ
 یہودی قرض خواہوں کے گھراٹھ کر چلا جاتا ہے، زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ اس چھوٹی سی
 آبادی کے دو خاندان اپنی خانہ جنگلی میں رہے سبے جوانوں اور سرداروں کو بھی کھو چکے ہیں،
 ان کے ساتھ اپنے دھن سے، وطن سے پھڑے ہوئے کچھ لوگ اور بھی شریک ہیں، جن کی
 تعداد سو سے زیادہ نہیں ہے، ان کا یہ حال ہے، دوسری طرف سارا عرب ایک کمان بن کر اس
 تحریک کو اور تحریک والوں کو نشانہ بنائے ہوئے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا
 ہے، یہودی اپنی مہاجنی کی کساد بازاری سے گھبرا کر ان تمام قلعوں اور قلعوں والوں کو مخالفت
 کے نقطہ پر جمع کر رہے ہیں، جن کا سلسلہ مدینہ سے شروع ہو کر شام کے حدود تک پھیلا ہوا
 ہے، مشکلات کا خاتمہ اسی پر نہیں ہو جاتا ہے، بلکہ بتدریج مخالفت کی یہ آگ بڑھتے بڑھتے
 اس وقت کی سب سے بڑی مشرقی طاقت (ایران) اور سب سے بڑی مغربی قوت (روم)
 دونوں طاقتوں کو مدینہ کی بربادی پر آمادہ کر دیتی ہے۔

رومیوں کے گھوڑے مدینہ سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر غسانوں کے حدود پر ہنہار ہے ہیں اور کسریٰ کے چراسی وارنٹ لئے مدینہ پہنچ کر دھمکا رہے ہیں کہ مدینہ کے کسانوں کے سردار کو دربار شاہی میں گرفتار کر کے حاضر کیا جائے، یہ ان کے شہنشاہ کا فرمان ہے، جو یمن کے گورنر باذان کے توسط سے مدینہ تک پہنچا ہے۔

اس وقت کا سماں ہے، جس وقت مدینہ میں ”دماغ“ کے تجربہ کے لئے نسلِ انسانی کو دعوت دی جاتی ہے، پھر کیا ہوتا ہے، قیداء کی ساری حشمت جیسا کہ یسعیاہ نبی نے کہا تھا کہ ایک سال ٹھیک مزدوروں کے ایک سال کے اندر بھس کی طرح جل کر راکھ ہو جاتی ہے، علو کبریائی کا جو نشہ ان کے قدم کو جمنے نہیں دیتا تھا، پھٹ کر ہوا ہو گیا، جو سب سے بڑا تھا، سب سے چھوٹے کے ہاتھوں قتل ہوا، قریش کے ستر سوار مارے گئے اور یوں قیداء کی حشمت خاک میں مل گئی۔

وہی عرب جو ایک کمان سے تیر بن کر اس کونے کے پتھر پر گرے تھے، جیسا کہ کہا گیا تھا جو اس پر گرتا ہے، پتھر پتھر ہو جاتا ہے، پتھر پتھر ہو کر اس طرح بدلے کہ جو دشمن تھے، وہ دوست ہو گئے، جن پر تلوار چلائی، وہ نہیں، بلکہ جنھوں نے تلوار چلائی انہوں نے مسلمان ہو کر ان جھوٹوں کو جھٹلایا، جنھوں نے بازاروں میں پھیلا یا تھا کہ جو کچھ پھیلا یا گیا، تلوار کے زور سے پھیلا یا گیا، مکہ میں جن سے چھینا گیا تھا، سب کچھ چھینا گیا، پانی چھینا گیا، کھانا چھینا گیا، گھر چھینا گیا، در چھینا گیا اور آخر میں جینے کا حق بھی چاہا گیا تھا کہ چھینا جائے اور کتنوں سے چھینا گیا، دہکتی ہوئی آگ، چمکتی ہوئی تلواروں، کھنچی ہوئے کمانوں کے نیچے سے بھاگے ہوئے، پھر چمکتی ہوئی تلواروں اور کھنچی ہوئی کمانوں، تنے ہوئے نیزوں کے ساتھ فتح کا پھریرا اڑاتے ہوئے مکہ میں داخل ہوتے ہیں، لیکن لیتے ہوئے نہیں، دیتے ہوئے، اکڑتے ہوئے نہیں، جھکے ہوئے، بدلہ چکاتے ہوئے نہیں، عط و غفو کرتے ہوئے

﴿ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ﴾

”شہر کے دروازے میں سر جھکائے اور عط (یعنی: گناہوں اور قصوروں کو

جھاڑتے ہوئے، معافی مانگتے ہوئے) داخل ہونا“۔

کی تعمیل کرتے ہوئے، تفسیر کرتے ہوئے، رحم و کرم، صفح و اعراض، مغفرت و درگزر،

امن وامان کے پھول برساتے ہوئے:

”الیوم یوم برو و فاء، الیوم انتم الطلقاء“

”آج صلہ رحمی اور وفا کرنے کا دن ہے، آج تم لوگ آزاد کئے گئے۔“

کے موتی نچھاور کرتے ہوئے زمین پر انسانوں کیلئے جو پہلا گھر، مخلوق کی نہیں، بلکہ خالق کی، صرف خالق کی عبادت کیلئے بنایا گیا تھا، اس میں ”لا الہ الا اللہ، الحمد للہ وحدہ، نصر عبدہ و حزب الاحزاب وحدہ“ کہتے ہوئے سر بسجود ہو گئے۔ ابراہیم علیہ السلام کا بیت ایل پتھر کی کھودی ہوئی صورتوں کی گندگی سے پاک ہو گیا اور حیرت ہے کہ بکھرا ہوا وحشی عرب جس میں وثنی، بت پرست، یہودی، عیسائی، صابئی، عقل پرست سبھی ہیں، ان مختلف اقوام و قبائل کے باہمی انتشار، جنگ و جدال کو ختم کر کے ایک پر امن آئینی نظام سلطنت کے ساتھ وابستہ کرنے میں جھوٹوں نے جس قدر بھی جھوٹ چاہا پھیلا دیا، لیکن واقعہ صرف اس قدر اور اسی قدر ہے کہ دس لاکھ مربع میل کی طویل و عریض سر زمین کا پایہ تخت جس وقت کسانوں کا وہی قصبہ ہو گیا، تو دس سال کی اس لمبی اور دراز مدت میں دینیوں (عربی ہندوؤں)، یہودیوں، عیسائیوں، مسلمانوں سب میں سے امن وامان کی اس جدوجہد میں طرفین کے جتنے آدمی کام آئے، ان کی تعداد کروڑ، لاکھ، بلکہ دو ہزار چار ہزار بھی نہیں، اتنی بھی نہیں جتنی ”نیویارک“ کی سڑکوں، یا ”لندن“ کی شاہراہوں پر موٹر کے نیچے سے روزانہ اٹھائے جاتے ہیں، یا ہندوستان کی معمولی جھڑپوں میں لاشوں کی جوفہرست تیار ہوتی ہے، بلکہ کل لے دے کر سب کی کل تعداد ایک ہزار اٹھارہ ہے، یہ ہے ”خونی پیغمبر“ کا بہایا ہوا خون، یا قصابوں کی وہ دکان جس کے شور سے گنبد گرداں بھی تھرا اٹھا ہے، غیر تو غیر اپنے بھی پریشان ہیں۔

اُف! برکنندہ باد آنکھوں سے بد اندیشوں کو صرف وہیں خون نظر آیا، جہاں سے انسانیت کی مردہ لاش میں زندگی کا خون دوڑایا گیا، جہاں موت ہے، مردوں کو، دل کے مردوں کو وہاں زندگی نظر آرہی ہے اور جہاں سے صرف زندگی نئی، بٹ رہی ہے، انصاف کرنے والوں نے کیسا انصاف کیا، جب موت کی وادی کے نام سے انہوں نے دنیا میں اس کا پروپیگنڈا کیا، ایک ہزار اٹھارہ تعداد تو اس وقت ہے، جب اس میں بلا وجہ بنی قریظہ

کے ان یہودیوں کو بھی شریک کر لیا جائے، جن کو خود ان کی کتاب اور ان کی شریعت نے ان ہی کی مرضی سے اپنے ہی قانون کی دوسے اس وقت ناپید کیا، جب سمجھا گیا کہ اس چھوٹی سی جماعت کی زندگی سے سارے عرب، بلکہ ممکن ہے کہ عرب کے اطراف کی بڑی جماعت کی موت پیدا ہوگی، آخر جب کروڑوں مقتولوں والی عالمگیر جنگ کی آگ یہودی پھونک کی سلگائی ہوئی مانی جاتی ہے، تو اگر ان ہی یہودیوں کے متعلق یہ سمجھا گیا، تو کیا غلط سمجھا گیا اور صرف یہی نہیں، اسی ایک ہزار اٹھارہ میں بیچارے ان شہید معلوموں کو بھی شمار کر لیا گیا ہے، جن کو نجد والے اپنے ملک میں وعظ و تلقین، تعلیم و تذکیر کیلئے لے گئے، اور ”معوٰنہ“ نامی کنویں پر ستر آدمیوں کو شہید کر دیا گیا، ان ہی میں وہ دس مبلغ بھی ہیں، جنہیں بے دردی کے ساتھ بلاوجہ ”رجیع“ کے مقام پر ذبح کر دیا گیا، یہ تو مسلمانوں کی طرف سے شہید ہوئے، اسی طرح فریق ثانی کے ان مقتولوں کو بھی اسی تعداد میں شریک کر لیا گیا، جو بجرم قصاص، یا ڈاکہ، یا چوری مارے گئے، یا گرفتاری کے سلسلہ میں قتل ہوئے، لوگ سوچتے نہیں، ورنہ دس سال کی اس طویل مدت میں اگر جنگ کا اطلاق کسی معرکہ، یا مہم پر ہو سکتا ہے، تو وہ ”بدر“ ہے، جس میں بائیس مسلمانوں اور ستر قریش کے، اسی طرح ”احد“ میں ستر مسلمانوں اور تیس قریشیوں کے آدمی کام آئے، بشرطیکہ ہزار پندرہ سو آدمیوں کے مجمع اور ان کی باہمی آویزش کا نام بجائے جھڑپ کے جنگ اور ”پینل“ رکھا جائے۔

بہر حال قریشیوں سے جو کچھ چھڑ چھاڑ ہوئی، وہ اسی پر ختم ہو گئی، نہ ”خندق“ میں بازارِ قتال گرم ہوا، نہ مکہ میں خونریزی ہوئی، اسکے بعد ایک دو معرکے یہودیوں سے ہوئے، جن میں خیبر سب سے اہم ہے، اس میں اٹھارہ مسلمان شہید اور ترانوے یہودی مارے گئے۔ ”عیسائیوں“ سے ”موٰتہ“ میں گھسان کی جنگ ہوئی، لیکن اس گھسان میں بھی مسلمانوں کے کل بارہ شہیدوں کا حال معلوم ہوا، اس کے سوا کچھ ڈاکوؤں کا تعاقب ہے، چوروں کا پیچھا کیا گیا، باغیوں کی سرکوبی کے لئے کوئی دستہ روانہ کیا گیا تھا، جس میں اکثر مواقع میں جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی، بہر حال اگر خالص لڑائی اور جہاد کے شہیدوں اور مقتولوں کا حساب کیا جائے، تو ان کی تعداد پانچ چھ سو سے زیادہ اس کل دس سال کی مدت کے اندر سارے ملک عرب میں ان شاء اللہ ثابت نہ ہوگی، حالانکہ مقابلہ

میں عرب کے وحشی قبائل، طاقتور جمہوریتیں، اور بعض سلاطین بھی تھے، لیکن جس کو طائف کے بعد سب کچھ دے دیا گیا تھا، کیوں سوچا جاتا ہے کہ اس کو کیوں کر ملا، اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا، جس کی زندگی کا ہر واقعہ اس کے کلمہ دعوت و دعویٰ ”لا الہ الا اللہ“ کی دلیل ہے، آخر ان واقعات میں بھی اسی کو کیوں ڈھونڈا جاتا.....؟

الغرض یہ ہیں کل دس سال اور وہ سارے جنگ و جدال جن کے خون کا افسانہ ہزار ہا بولکوں، رنگوں سے رنگین کر کے دنیا کو سنایا جاتا ہے۔

اب دیکھو کہ جہاں انسان مجبور ملا نہ کہ انسان کی جان ایک مچھر اور مکھی سے بھی زیادہ قیمت نہیں رکھتی تھی، اس کی جان تو بڑی چیز ہے، اس کے کپڑے کا دھاگا بھی رات کی اندھیروں میں کوئی نکال نہیں سکتا، امن و امان کا دور دورہ ہے، عالم پر منطبق کرنے کیلئے انسانی زندگی کے جس آئین و دستور کا نقش مدینہ کے پرچم میں گاڑا گیا تھا، اس کے نیچے چلے آتے ہیں، بے تابانہ چلے آتے ہیں، آدم کے بچے ہر چہار طرف سے چلے آتے ہیں، فوج در فوج چلے آتے ہیں، فود کا تانتا بندھ جاتا ہے۔

پھر کیا مدینہ میں جو پایہ تخت قائم ہوا، وہاں منبر کی جگہ تخت بچھایا گیا، وہی منبر ہے، وہی مسجد ہے، وہی جھوپڑے ہیں، وہی چڑے کا اکہرا گدا ہے، نہ حاجب ہیں، نہ دربان ہیں، امیر بھی آتے ہیں اور غریب بھی آتے ہیں، دونوں کے ساتھ ایک معاملہ ہے، عجب دربار سلاطین کہتے ہیں، شاہی دربار تھا کہ فوج تھی، علم تھا، پولیس تھی، جلاد تھے، محتسب تھے، گورنر تھے، کلکٹر تھے، منصف تھے، ضبط تھا، قانون تھا۔

مولوی کہتے ہیں مدرسہ تھا کہ درس تھا، وعظ تھا، افتاء تھا، قضا تہ، تصنیف تھی، تالیف تھی، محراب تھی، منبر تھا۔ صوفی کہتے ہیں خانقاہ تھی کہ دعا تھی، جھاڑ تھا، پھونک تھا، درد تھا، وظیفہ تھا، ذکر تھا، شغل تھا، تخت (چلہ) تھا، گریہ تھا، بکا تھا، وجد تھا، حال تھا، کشف تھا، کرامت تھی، فقر تھا، زہد تھا، قناعت تھی، کنکریاں دی جاتی تھیں کہ کھارے کنوؤں کا پانی میٹھا ہو جائے گا، بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے، جس کو جو کہہ دیا جاتا ہے، پورا ہوتا ہے۔

مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ سب کچھ تھا، اسلئے کہ وہ سب کیلئے آیا تھا۔ آئندہ جس کسی کو چلنا تھا، جہاں کہیں چلنا تھا، جس زمانہ میں چلنا تھا، اسی روشنی میں چلنا تھا۔

یہ تو عرب کیلئے ہوا، عرب ہی کے اندر دیکھو کہ عرب کے باہر کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ اسی دس سال کے عرصے میں مشرق کی سب سے بڑی قوت ”پرشین ایمپائر“ اور مغرب کی سب سے بڑی طاقت ”رومن ایمپائر“ کے ساتھ اطراف و جوانب کے سلاطین کو بھی چونکا دیا جاتا ہے کہ وقت سے پہلے جاگ جاؤ، جو جاگا اس نے پایا، جو سویا اس نے کھویا، ”کسریٰ“ نے خط پھاڑا، اس کا ملک پھاڑ دیا گیا، ”قیصر“ بھی پھاڑ دیتا اور خدا کرتا کہ وہ پھاڑ دیتا، تو وہ بھی پھٹ جاتا، لیکن معاملہ کو ملتوی کر کے اس نے اپنی قوم اور اپنے ملک کی موت کو ملتوی کر لیا اور اتنا ملتوی کیا کہ گویا وہ فوج آج تک واپس نہیں ہوئی اور خدا ہی جانتا ہے کہ کب واپس ہوگی، جسے رومیوں کی طرف روانہ کر کے دماغ کے ان عجیب و غریب تجربات دینے والا پاک وجود پھر ”دل“ کے حالات میں مستغرق ہو کر اس بستر پر لیٹ گیا جس پر لیٹنے کے بعد پھر اٹھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے، اللھم صل علیہ وسلم۔

دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ اس بستر پر لیٹنے کی جو آخری رات تھی، اس کے روشن کرنے والے چراغ میں تیل کسی غریب پڑوسی سے قرض کر کے آیا تھا اور جو چادر اس وقت مرض واپسیں کے مریض پر پڑی ہوئی تھی، جب بعد کو دیکھا گیا، تو صرف پھٹا ہوا ایک ایک سیاہ کبیل تھا، جس کے اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے، اس کی زرہ تیس صاع جو پر ایک یہودی سا ہو کار کے یہاں گروتھی۔

جاننے کے بعد نہ ماننے کیلئے جھوٹ کے بلوں میں پناہ پکڑنے والا! سو جھ رہا ہے، دیکھ رہے ہو، جو اس بستر پر لیٹا ہوا ہے، انصاف کے ٹونیو! کیا یہی مکہ کا وہ فقیر ہے، جس کے متعلق تمہاری گندی زبانوں نے غل چمایا کہ وہ مدینہ کا بادشاہ ہو گیا تھا اور کیا آج ہی اس کا یہ حال ہے، دس سال کی اس مدت میں کس نے اس کے گھر سے روز دھواں اٹھتے دیکھا؟ ایسے بادشاہ کس دنیا میں گزر رہے ہیں، جن کے منہ کو جو کے بے چھنے آٹے کی روٹی بھی میسر نہ آئی؟ فقیروں نے بھی کبھی دو دو تین تین مہینے تک صرف پانی اور خشک چھوہاروں پر زندگی گزاری ہے؟ فاقہ مستوں نے بھی کبھی بھوک کی شدت میں پیٹ پر دو دو پتھر باندھے ہیں؟ بادشاہوں کی لڑکیوں کے ہاتھ میں پینے کا گٹھا اور گردن میں پانی بھرنے کے نشان دیکھے گئے؟ ایسی شاہزادی زمین کے کس خطہ میں پائی گئی، جس کو، جس کے بچوں کو دو دو تین تین

دن بھوک کی شدت میں دن کورات اور رات کودن کرنا پڑا ہے؟

بادشاہوں کا قصر کیا اسی کو کہتے ہیں، جن کے کھجوروں کے پتوں کی چھت سے بھی آدمی کا سر لگتا ہو؟

”مدینہ“ کے بادشاہ کا شاہی محل تو اس وقت بھی موجود ہے، اس کے طول و عرض کو تو اب بھی ناپ سکتے ہو، باہر میں اس کے کچھ بھی ہو، لیکن اندر تو اس کا وہی ہے، جو پہلے تھا۔ بہر حال دس سال تک ”دماغ“ کا بھی اسی طرح کھلی روشنی میں تجربہ کرایا گیا، جس طرح تیرہ سال تک ”دل“ کے مشاہدات پیش کئے گئے۔

اور تم دیکھو کہ اسی عرب میں ایک طرف ان کا نشہ اتارا گیا، جن کی بڑائی میں خدا کی کبریائی کی بھی گنجائش نہ تھی، تو دوسری طرف ان ہی میں ایک اور نشہ پیدا ہو گیا کہ خدا کی بڑائی کے سوا ان کے اندر کسی کی بڑائی باقی نہ رہے، یہی وہ گروہ تھا، جو ”سینا“ کی روشنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملائکہ قدوسیوں کی شکل میں نظر آیا، وہی دعویٰ جس کی دلیلیں مسلسل خود اپنے اندر سے اس دعوے کا مدعی اعلان سے پہلے چکارہا تھا، اسی دعوے کے نسخہ کو ان پر بھی پیش کیا گیا، جنہوں نے جان کر اس کو مانا تھا، یہ نسخہ ان کو پلایا گیا۔

اور کسی جنگل، یا پہاڑ کے غاروں میں نہیں، تلوار کی چھاؤں میں اس کی مشق کرائی گئی، پلا کر بھی دیکھایا جاتا تھا اور چھڑا کر بھی دکھایا جاتا تھا۔ ”بدر“ میں جب پی کر اترے، تو اس کے نتائج بھی ان کے سامنے تھے اور ”احد“ میں جو کچھ ہوا، ان ہی کی بدولت ہوا، جن سے پینے میں کچھ کوتاہی ہوئی، مکہ جب فتح ہوا، تو سب اسی نشہ میں سرشار تھے، ”حنین“ میں جب میدان چھوٹا، تھوڑی دیر کے لئے چھوٹا، تو تم اس کے میدان کے نقشے میں اور اس کی گھاٹیوں، پہاڑیوں میں اس کے اسباب کو کھوجو، لیکن میں کیا کروں کہ قرآن نے اس نشہ کی کمی کا ان میں نشان دیا ہے، جس کا ان کو تجربہ کرایا جا رہا تھا۔

تم کہتے ہو کہ وہ ان تیر اندازوں سے بھاگے، جو اندر نہیں، بلکہ باہر گھاٹیوں میں چھپے ہوئے تھے اور قرآن کہتا ہے کہ وہ ”بجاریٹی“ اور اکثریت کے اس اعتماد سے بھاگے جو ان کے اندر چھپا ہوا تھا۔

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبْتَكُمْ كَثُرَتْكُمْ فَلَمَّ تَغْنِبْ عَنْكُمْ شَيْئًا﴾

”اور جنین کے دن جب اپنی کثرت تعداد نے تم کو مغرور کر دیا، لیکن یہ کثرت تعداد تم کو فائدہ نہ پہنچا سکی۔“

کا مطلب اسکے سوا اور کیا ہے؟

اگر یہ مقصود نہ تھا، تو جس کو طائف سے واپسی کے بعد سب کچھ مل چکا تھا، اس کو اس ”لاؤ“ اور اس ”لشکر“ کی کیا ضرورت تھی، یوں بھی تو اس کا داہنا ہاتھ عجیب و غریب کمالات دکھاتا تھا، یہ غرض نہ ہوتی، تو کیا صرف اسی سے وہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا اور جب جی چاہا، تو کیا خاک کی مٹھی سے اسی نے وہی کام نہیں لیا، جو ”ہوٹرز“ کے لوگوں سے لیا جاتا ہے۔

اندھے ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ خون بہتا تھا، جس کا خون بہایا گیا، جس کی داڑھی خون سے دھوئی گئی، جس کے دانت توڑے گئے، جس کی پیشانی میں ”زِرہ“ کی کڑیاں چھائی گئیں۔ نابیناؤ! اسی پر الزام دھرتے ہو کہ اس نے خون بہایا۔ چورو! کو تو ال ہی کو اُلٹے ڈانٹتے ہو، بکف چراغ ہو کر ڈانٹتے ہو، حالانکہ ترسٹھ سال کی طویل مدت عمر میں کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ خونبوں میں پلنے والے اس انسان نے خون تو کیا، کسی کا بال بھی توڑا تھا۔

اُف! اگر وہ خون بہانا چاہتا، تو پھر ہزاروں کے خون کو صرف ایک کے خون سے کیوں بچاتا، قطرہ بہا کر سمندر کو کیوں باندھتا، یہی یہودی جن کا خون ہر زمانہ اور ہر ملک میں تقریباً ہر صدی میں ارزاں رہا ہے اور اب تک ہے، جب خون کے مستحق ہو چکے تھے اور ہر اعتبار سے ہو چکے تھے، لیکن ان کے ہزاروں کے خون کو صرف کعب بن اشرف اور رافع بن حقیق، دو ہی آدمیوں کے خون سے کیوں محفوظ کر دیا گیا، بہت بڑا خیر وہ شر ہے، جس کے ذریعہ سے کسی عظیم و جلیل شر کا سد باب ہوتا ہو، قصاص میں زندگی ہے، آخر اس قانون میں اور کیا ہے، بلاشبہ ان دونوں کی موت میں ان تمام یہودیوں کی زندگی کی ضمانت تھی، جو ان کے بعد زندہ رہے، پھلے پھولے، ورنہ جو منصوبے ان دونوں نے پکائے تھے، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عرب سے یہودیوں کا اسی وقت نام و نشان جاتا رہتا، جیسا کہ ہمیشہ اسی قسم کے بد باطن یہودیوں نے اپنی قوم پر ہر ملک میں ہر زمانہ میں زندگی تلخ کی ہے، جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ بنی قریظہ کی چھوٹی جماعت اگر چہ ان ہی کی شریعت ان ہی کے حکم سے منائی گئی، لیکن اسی کے ساتھ کیا اس چھوٹی جماعت کی موت میں عرب کے سارے

یہودیوں کی زندگی مستور نہ تھی....؟ سنگ دل اور ظالم ہے وہ جراح جس نے ایک انگلی کیلئے پورے جسم کو سڑنے دیا۔

آخر میں ان تجربات کے سلسلہ میں نادر ترین تجربہ یہ ہے کہ یہی دس سال کا زمانہ ہے، اس کے بھی چند سال گزر چکے ہیں اور اب وہی جو عرب کیلئے بھی تھا، عجم کیلئے بھی تھا، مردوں کیلئے بھی تھا اور عورتوں کیلئے بھی تھا، زندگی کے آخری دنوں میں ارادہ فرمایا جاتا ہے کہ جس طرح مردوں میں قد و سیویں کی یہ آخری جماعت پیدا کی گئی ہے، سارے جہاں کی عورتوں نے لئے قیامت تک نسل انسانی میں جو عورتیں پیدا ہونے والی ہیں، ان سب کیلئے ان کی تعلیم کیلئے، تربیت کیلئے ان کے نمونہ کے لئے عورتوں کی بھی ایک جماعت تیار کی جائے، شاید یہ قدرت کی طرف سے تھا اور اس کی کون سی بات قدرتی نہ تھی کہ جہاں سے دنیا کے اس عالمگیر نقشے، اور حیات انسانی کے کامل دستور العمل کا جھنڈا اٹھایا جاتا ہے، وہ نہ ”لندن“ ہے، نہ ”پیرس“ حتیٰ کہ ”بہمی“ بھی نہیں اور ”کلکتہ“ بھی نہیں، بلکہ سوچو تو بیابان کی اس کوردہ آبادی کی تمدنی و عمرانی لحاظ سے وہ حیثیت بھی نہیں، جو ہندوستان کے معمولی اضلاعی شہروں اور قصبوں کی ہے، لیکن دنیا کے اسی دور افتادہ، وزیران، ریگستان، نخلستان میں حیرت ہے کہ سارے جہاں کے ”مذہب و ادیان“ اسلئے اس کے آگے پیش ہو جاتے ہیں کہ تردید و تکذیب نہیں، بلکہ سب کی تصدیق، سب کی تصحیح، سب کی تکمیل عملی شکل میں ممکن ہو کہ وہ ”مکذب“ نہیں، بلکہ ”مصدق“ تھا اور یہی اسکے دعویٰ کا سب سے بڑا امتیازی نشان ہے۔

ہندو مذہب تو ”وثنیت“ کی شکل میں ”مکہ“ ہی میں موجود تھا۔ ”مدینہ“ آنے کے بعد اس کے آگے دنیا کا دوسرا عالمگیر مذہب ”یہودیت“ بھی سامنے آ گیا، اس کے ساتھ خود ”مدینہ“ میں اطراف مدینہ میں وہ ”نصرانیت“ بھی موجود تھی، جس کے زیر اثر دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ اس وقت بھی تھا اور اس وقت بھی ہے، اس کے حلقہ میں ”مجوسی“ اور ایران کے آتش پرست ”زردشتی“ بھی شریک تھے اور اردگرد میں ایک فرقہ ”صابیوں“ کا بھی تھا، جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ عرب کے ان ”صابیوں“ کا تعلق ”بودھ مذہب“ کے ”سادھوؤں“ سے تھا، یا ان کے سوا کوئی اور فرقہ تھا، جسے دیباہ نہیں جانتی ہے۔

الغرض کوہستان کی اس چھوٹی سی بستی میں یہودیت، عیسائیت، ہندویت، یا وثنیت،

مجوسیت، اور اگر چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ بودھیت اپنے ان تمام مفاسد کے ساتھ موجود تھی، جن کے دھونے اور جن سے پاک کرنے کے لئے وہ اٹھایا گیا تھا، پس اس نے ان سب کو دھویا، ان سب کو پاک کیا، صاف کیا، جس میں جو کمی تھی سب کو پورا کیا اور قیامت تک کیلئے پورا کیا۔ اور جس طرح دنیا کے ہر مذہب کے مردوں میں قدرت نے اس کو کچھ لوگ دیئے، دیکھو کہ قریب قریب کچھ اسی طرح سے زندگی کے آخری دنوں میں تقریباً دنیا کے ان تمام بڑے مذاہب کی عورتوں میں سے ایک ایک نمائندہ اس کی خدمت میں قدرت ہی کی جانب سے حاضر کی جاتی ہے، عورتیں اسکی خدمت میں اگر عورتوں کی حیثیت سے آتیں، تو کیا وجہ تھی کہ جب مکہ میں ہر قسم کی یہی عورتیں اس کے آگے پیش کی گئیں، تو اس بزرگ خاتون کے مقابلہ میں جو عمر میں ان سے پندرہ سال بڑی تھیں، پچاس سال کی عمر تک کسی کو پسند نہیں کیا، پچیس سال کی جوانی سے پچاس سال کی عمر تک تم میں کون نہیں جانتا کہ بجز حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے آپ نے کسی سے نکاح نہیں فرمایا، جو نکاح کے وقت چالیس سال کی ہو چکی تھی اور اس سے پیشتر ان کے دو شوہروں کا انتقال ہو چکا تھا، جو عورت کو عورت کی حیثیت سے اپنے گھر میں لاتا ہے، کیا چالیس سال کی بیوہ کے ساتھ پچاس سال کی پوری زندگی گزار سکتا ہے۔

ہاں! جب سب کچھ ہو چکا ”دل“ کا بھی تجربہ ختم ہو چکا۔ ”دماغ“ کے تجربات بھی دنیا کے سامنے آچکے، قتل و خون، فتنہ و فساد کا متلاطم سمندر ملک عرب، امن و امان، راحت و آسائش کی چھاؤں کے نیچے زندگی کی قیمت حاصل کرنے لگا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگرچہ عرب کا اکثر حصہ ہمیشہ سے کسی غیر عرب کا محکوم نہ تھا، لیکن باہم ان میں بڑوں نے چھوٹوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور پھر سب مل کر وہی مخلوقات کی غلامی کی رسیوں میں گھسیٹ رہے تھے، اس غلامی سے ان کو حقیقی آزادی میسر آئی، انسانیت اپنے فطری مقام سے ہٹ کر مروج کھائی ہوئی ہڈی کے مانند بے چین تھی، بے کل تھی، پھر اس کو اپنا وہ اصلی مقام نصیب ہوا، جس پر پہنچے بغیر قلوب انسانی مطمئن نہیں ہو سکتے، ایسی صورت میں پھر یہ کیسا بداندیش اور خبیث خیال ہے کہ آزادی کی اس نعمت سے ایک پورے طبقہ، نصف حصہ کو محروم رکھا جاتا ہے، یہ سچ ہے کہ ان کا، ان بے زبانوں کا کسی نے خیال نہیں کیا، رحم کی نگاہ

کسی کی ان پر نہیں پڑی، لیکن کیا کہتے ہو کہ ”رحمۃ للعلمین“ کی نظرِ کرم سے بھی یہ بے چاریاں محروم رہتیں، جس طرح اب تک تھیں، ایسا نہیں ہو سکتا تھا، جو سب کیلئے تھا، وہ سب ہی کیلئے ہوا اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا، اس نے بے سمجھ، خام فہم، نا تجربہ کار عورتوں کا انتخاب نہیں کیا کہ ان کو دوسروں کیلئے نمونہ بنایا تھا اور دیکھو! وقت بھی کم ہے، فرصت تنگ ہو رہی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ چین چین کر مختلف طبائع اور مزاج، مختلف مذاہب اور ادیان کی سن رسیدہ، فہمیدہ و سنجیدہ بیوہ عورتیں زندگی کے سرد گرم کا تجربہ کر چکی تھیں، ان کی ایک برگزیدہ، پاک منتخب جماعت کو مختلف اسباب و وجود کے پردہ میں قدرت نے اس کی خدمت میں اس وقت مہیا کیا، جب اپنے فرض سے سبکدوشی کا وقت آخر ہو رہا تھا، اس کی زندگی کا یہ آخری کارنامہ تھا، کھل چکا تھا کہ مکہ فتح ہوتا ہے، خدا کی زمین کا ”مرکز“ جھوٹے خداؤں کی نجاست سے پاک ہوتا ہے، جس کے بعد اس کا کام ختم ہو جاتا تھا۔

میں بتا چکا ہوں کہ ”غیب“ اور اس کے ”آیاتِ کبریٰ“ جس وقت کھولے گئے تھے، آخر میں بانی کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دیکھنا اسی کی دلیل تھی کہ کعبہ کی تطہیر اس کا آخری کام ہوگا۔ ”مرکز“ اور ”ام القرائی“ پر قبضہ دلانا اصل کام تھا، اس کے بعد مفصلات اور ”ام القرائی“ کے ”قری“ جو کعبہ کے چاروں طرف زمین کے آخری حدود تک پھیلے ہوئے ہیں، ان کا کام آنے والوں کے سپرد کر دیا جائے گا اور اسی غیبی مکاشفہ میں نہیں، بلکہ مسلسل ایسے مکاشفے مختلف پیرایوں میں ہو رہے تھے، جن کا مطلب یہی تھا کہ کام ختم ہو رہا ہے، پس اس کام کو کامل طور پر ختم کرنے کیلئے مردوں کے ساتھ چند عورتوں کی تعلیم و تربیت کا کام اپنی آخری زندگی میں اس کو اپنے سر لینا پڑا، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عورتیں خدمت مبارک میں اسی حیثیت سے رہتیں، جس حیثیت سے مردوں کی ایک منتخب اور چیدہ جماعت ساتھ رہتی تھی، لیکن ”دماغ“ کی بیداری کا یہ کیسا روشن تجربہ ہے کہ اس نے مصنوعی مذہبی مقتداؤں اور روحانی پیشواؤں کی ان مجرمانہ پیش قدمیوں کا راستہ ان عورتوں سے نکاح کر کے ہمیشہ کیلئے مسدود کر دیا۔

ہیکل کی خدمت کیلئے عمران کی عورت نے صرف ایک لڑکی پیش کی تھی، پھر دیکھو! اسی ایک کنواری کے آڑ میں چرچوں پر، گرجاؤں پر، ان کے اماموں پر، خطبوں پر، رہبانوں پر،

بطریقوں پر کتنی کنواریاں روز بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ خدا نخواستہ اگر کسی ایک اجنبی عورت کو نزدیکی کی وہ حیثیت دی جاتی، جو باہر مردوں کو حاصل تھی، تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ بعد کو آدم روابلیسوں کیلئے قرب و نزدیکی کا یہ حیلہ کن خباثوں اور شرارتوں کی بنیاد بن جاتا، جب کوئی نمونہ نہیں موجود ہے، اس وقت تو بغیر نمونہ کے زندگی گزارنے والوں نے فتنے برپا کئے، خدا نخواستہ اگر ”نیم بیضہ“ بھی میسر ہو جاتا، تو پھر سیخ میں کتنے ہزار مرغ گھتے جاتے، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟

الغرض ان عورتوں کو ”بیوی“ کا مقام عطا کیا اور جس کو انسان سوچ نہیں سکتا، اس حد تک ان کے ساتھ حقیقی عدل اور برابری کا نمونہ اس نے پیش کیا، جس کا ”دماغ“ عالمگیر حکومت، عالمگیر سیاست، ہمہ گیر تعلیم و تربیت کی الجھی ہوئی سچ در سچ گتھیوں کے سلجھانے میں اسی وقت مصروف تھا، جس وقت عالمی اور خانگی زندگی کی ژولید گیوں کو بھی بہ کشادہ پیشانی حل کر رہا تھا، اور اس آسانی کے ساتھ حل کر رہا تھا کہ خواہ اس کی مدت کتنی ہی کم ہو، لیکن بداندیشوں، یا وہ خیالوں کو دور سے زندگی ایسی سلجھی ہوئی خوشگوار لذیذ نظر آئی کہ بدبختوں نے اپنے اندر برے خیالات پکائے، گویا سچ سچ اس خیر میں کوئی شر نہیں اور اس راحت میں کوئی زحمت نہیں تھی، ایک بیوی کے تعلقات کی شیرینی کو مسلسل تلخیوں سے بدلنے والے کیا یہ سوچ سکتے ہیں؟ البتہ اس کا اندازہ وہ ضرور کر سکتے ہیں کہ چند بیویوں کو خوشگوار رکھنا فطرتِ انسانی کے اعجاز نہیں ہے، تو اور کیا ہے؟ بلاشبہ یہی ایک عالمی تجربہ بھی ان بددماغوں اور بد عقلوں کیلئے کافی ہے، جو جاننے کے بعد ماننے سے اسلئے ہچکچاتے تھے کہ دل میں تو نہیں، لیکن ”عقل“ اور ”دماغ“ کے نظم میں ان کو بد نظمی کا اندیشہ ہوا، جس کی زندگی کا ہر شعبہ شخص، عالمی، خاندانی، قومی، سیاسی، صرف ضبط اور نظم ہے، اس کے متعلق یہ دوسرے خود سوچنے والوں کی کیا عقلی بد نظمی کی کھلی دلیل نہیں ہے؟ یہی نہیں، بلکہ سچ یہ ہے کہ زندگی کے اس قلیل حصہ کا کوئی دقیقہ، کوئی نکتہ ایسا نہ تھا جو نگاہ سے اوجھل ہو۔ دیکھ چکے کہ دنیا کی عورتوں کیلئے جو نمونہ بنائی گئیں، ان میں سے سب کی سب سن رسیدہ تجربہ کار بیوہ عورتیں ہیں، جیسا کہ مردوں کیلئے جو جماعت نمونہ بنائی گئی، ان میں بھی زیادہ تر تجربہ کار، سرد گرم چسیدہ لوگ تھے، ایک ایک ان میں ایسا تھا، جو ملکوں پر بھاری، قوموں پر گراں ثابت ہوا۔

لیکن دقیقہ سنجیوں، نکتہ نوازیوں کے اس سلسلہ میں انتہا اس وقت ہوتی ہے، جبکہ ایک طرف اگر مردوں کے نمونہ میں ایک ایسا نمونہ ہے جس کا دل، جس کا دماغ، جس کا ظاہر، جس کا باطن ہر قسم کے اجنبی اثرات سے قطعاً آزاد ہے، اسی صحبت میں اس نے آنکھیں کھولیں، ان ہی کی گود میں اس نے ہوش سنبھالا، آخر وقت تک وہ اسی حال میں رہا۔

پھر جس طرح مردوں کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شکل میں ایسا نمونہ دیا گیا، جو دو سال کی عمر سے اس وقت خدمتِ مبارک سے علیحدہ ہوئے، جب لوگوں نے مرقد انور سے ان کو نکلتے دیکھا، کیا ظلم نہ ہوتا اگر بے زبان عورتوں کو اس بے نظیر، ناگزیر نمونہ سے محروم رکھا جاتا، یہی وجہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ سن رسیدہ اور ادھیڑ، بلکہ بعض بوڑھی عورتوں کے اسی مجمع میں ایک وہ طاہر طیبہ، صدیقہ کنواری بیوی صاحبہ بھی ہیں، جن کو آپ نے اپنے زیر اثر سات ہی سال کی عمر سے لے لیا تھا اور قبل اسکے کہ ان کا دل، ان کا دماغ کسی غیر نبوی اثرات کو غیر شعوری طور پر جذب کرے، نوے سال کی عمر میں اپنی رفاقت میں لے لیا، عموماً سفر و حضر میں ساتھ رکھا، پھر دیکھو کہ جس طرح مردوں کے اس ”مظہر عجائب و غرائب“ وجود سے دنیا کو اگر وہ سب کچھ ملا، جو کسی دوسرے سے نہیں ملا، تو کیا ٹھیک اسی طرح اس عجیب و غریب ذہن و ذکا، فضل و کمال، تقویٰ و عفت کے سرچشمہ سے دنیا کو جو دولت تقسیم ہوئی، صرف عورتوں ہی میں نہیں کہ وہ تو ان کا گروہ ہی تھا، غالباً مردوں کو بھی کسی دوسرے سے اتنا نہیں ملا؟

محدثین سے پوچھو! کہ وہ کیا کہتے ہیں؟

الغرض ہر قسم کے شکوک و شبہات، وساوس و اوہام کی تاریکیوں، ادنیٰ سے ادنیٰ تاریکیوں کو چیرتا پھاڑتا ہوا دعویٰ کا وہ آفتاب، جس کی صبح کا سپیدہ حراء کے دامن سے پھوٹا تھا، مکہ کے افق سے چڑھتا ہوا تیس سال کی مدت میں مدینہ کے سمت الراس پر پہنچ کر انتہائی کمال و جمال کے ساتھ دیکھو کہ کس شان، کس آن کے ساتھ چمک رہا ہے۔ آفتاب! دعویٰ کا یہ عجیب و غریب آفتاب جس کے طلوع سے پہلے بھی روشنی تھی اور جس کے ساتھ بھی روشنی ہے، جس کے باہر بھی روشنی ہے، جس کے اندر بھی روشنی ہے، وہ خود بھی نور ہے، جس سے نکلا وہ بھی نور ہے۔ ”نور علیٰ نور“ کا یہی نوارنی نظارہ جس کو دنیا کی آنکھوں کے نور نے

کبھی نہیں دیکھا تھا، لیکن اب ہمیشہ دیکھتی رہے گی، سب کو دکھایا جائے گا، سب دیکھ رہے ہیں، ”ظاہر“ کے، ”باطن“ کے، ”دل“ کے، ”دماغ“ کے تجربات بینہ کی شعاعوں سے ”آسمانی علم“ اور ”لاہوتی عرفان“ کا یہ آفتاب دمک رہا ہے، چمک رہا ہے، بلکہ سچ پوچھو! تو بھسک رہا ہے، لہک رہا ہے، پھلک رہا ہے۔

عرب کا وسیع صحرا اس کیلئے تنگ ہے، وہ بڑھنا چاہتا ہے، طوفان کی طرح بڑھنا چاہتا ہے، آندھی کی طرح بڑھنا چاہتا ہے اور دیکھو کہ وہ بڑھ گیا، چڑھ گیا، ساری دنیا پر پھیل گیا اور اب تک اسی آب و تاب، جاہ و جلال کے ساتھ کائنات، ساری کائنات کے افق پر اسی طرح چمک رہا ہے، جس طرح وہ اس وقت چمک رہا تھا جب وہ عرب سے نکلا تھا، یقین و قطعیت کی تیز اور ٹھنڈی روشنی میں اس کو آج والے بھی اسی طرح پار ہے ہیں، جس طرح کل والوں نے اس کو اس وقت دیکھا تھا، جس وقت وہ ان کو، ان کی ایک بڑی جماعت کو اپنی زندگی کے عمیق سے عمیق، باریک سے باریک پہلوؤں کا کھلے بندوں علانیہ تجربہ کر رہا تھا۔

گلیلی جھیل کے چند ماہی گیر، یا مگدھ دیش کے گداگر بھکشو نہیں، بلکہ ہزار ہا انسان ایسے انسان جن پر اس عہد کی ساری بڑائیاں ختم ہوتی تھیں، ان میں بادشاہ بھی تھے اور دنیا کے سب سے بڑے بادشاہ ان میں کمانڈر بھی تھے اور دنیا کے سب سے بڑے کمانڈران میں دماغ والے بھی تھے، سب سے زیادہ بیدار دماغ والے، ان میں دل والے بھی تھے، سب سے زیادہ روشن دل والے، الغرض انسانیت کی جتنی اونچی سی منزلیں سوچی جاسکتی ہیں۔

تجربہ کاروں کی یہ جماعت ان کی آخری بلندیوں پر ساری دنیا کے آگے مضبوطی کے ساتھ قدم جما کر اس کا ثبوت پیش کر رہی تھی کہ اس وقت کی دنیا میں ان سے اونچا کوئی نہیں ہے، کہیں نہیں ہے۔

نبوت! اور کیسی عجیب نبوت! تجربہ! اور کیسا عجیب تجربہ! کتنا روشن تجربہ، کتنا نکھر ہوا صاف تجربہ، ہر قسم کی آلائشوں اور کدورتوں سے پاک و صاف تجربہ، کتنی عظیم دانائیوں کا پرکھا ہوا تجربہ، کتنی نازک ذہانتوں کا جانچا ہوا تجربہ، کتنی روشن فطرتوں کا ناپا ہوا تجربہ، کتنی بے رعب، بے جھجک طبیعتوں کا بے لاگ تجربہ، کتنے متوازن معتدل دماغوں کا نپا تلا تجربہ، چند

نہیں، فوج در فوج، نسل آدم کی غٹ کی غٹ، جوق در جوق افراد کا تجربہ، اتنے افراد کا تجربہ کہ دنیا کے کسی مسئلہ، یا حقیقت کیلئے نہ آج تک انسانوں کی اتنی بڑی جماعت اکٹھی ہوئی اور نہ شاید آئندہ ہو سکتی ہے۔

تجربات و مشاہدات کا یہی حیرت انگیز ذخیرہ تھا، جس کی حفاظت و نگرانی کا فرض کسی خانقاہ کے درویشوں، یا کسی مدرسہ کے معلموں، یا کسی انجمن کے ممبروں، یا کانفرنس کے دستریوں، یا کسی افسانہ نگار مورخ کی انگلیوں کے سپرد نہیں کیا گیا، بلکہ سب جانتے ہیں کہ زمین پر روئے زمین پر اس زمانہ کی جو سب سے بڑی قاہرہ سلطنت تھی، اس نے اپنا پہلا فریضہ بھی اسی کی حفاظت و تبلیغ قرار دیا اور اس کا آخری فریضہ بھی یہی تھا، درمیان کے جتنے مقدمات تھے، وہ صرف اسی مقصد کے حصول کے ذرائع تھے۔ دنیا کی اس سب سے بڑی سلطنت نے اپنی ہر قسم کی قوتوں کو صرف اسی کی نگرانی اور نشر و اشاعت کیلئے مخصوص اور محدود کر دیا۔

طاقت کی ان آہنی زنجیروں کی بندش میں حکومت ہی کی سرپرستی میں اس کی تاریخ کا آغاز ہوا اور دیکھو کہ مسلسل اسی طرح ایک حکومت دوسری حکومت کو یہ ودیعت سونپتی چلی آئی، حالانکہ زمانہ کی اس طویل و دراز مدت میں زمین کے مختلف علاقوں میں باہم ان سلطنتوں کے دوسرے اغراض و مقاصد میں خواہ جس قدر بھی اختلاف رہا ہو، لیکن اس ”آسمانی ودیعت“ ان درختوں ”تجربات بینہ“ ان ”یعنی مشاہدات“ کی غور و پرداخت، تبلیغ و حفاظت میں، سب کی نقاط و ارادے قطعی طور پر متحد تھے، بلکہ ہر حکومت نے کوشش کی کہ سعادت کے اس سلسلہ میں جتنا زیادہ حصہ اس کو مل سکے، اس کے حصول میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا جائے، اس کیلئے مدارس کھولے گئے، خانقاہوں کا جال بچھایا گیا، مجلسیں ترتیب دی گئیں، حلقے قائم ہوئے، تصنیف و تالیف کا باب کھولا گیا اور بڑے بڑے عظیم پیمانوں پر کھولا گیا، ایسے پیمانوں پر کھولا گیا کہ شاید دنیا کے کسی ایک فن، ایک علم کے متعلق نہ کبھی دنیا میں اتنے بڑے بڑے عظیم الشان مدرسے کھلے، نہ تصنیفی کوششوں کا اتنا عظیم حصہ انسانی تاریخ میں کسی ایک علم، یا فن کو ملا، جتنا کہ اس عجیب و غریب نبوت کے تجربات و مشاہدات کو ملا اور یوں ہی مسلسل بغیر کسی انقطاع اور کسی وقفہ کے ایک قرن سے دوسرے قرن تک، ایک نسل سے دوسری نسل تک نبوت کا یہ لازوال ابدی، سرمدی، قیم خزانہ منتقل ہوتا رہا اور اس

وقت تک ہو رہا ہے، ہوتا چلا جائے گا، صرف یہی نہیں، بلکہ ہر پچھلے طبقہ میں تم دیکھو گے کہ نبوت کے اس تجربہ کی گواہی ادا کرنے والوں میں اضافہ ہوتا رہا ہے اور کیسا اضافہ؟ ایک اور دو کی نسبت نہیں اور ایک اور تین کی نسبت نہیں، دگنے اور تنگنے کی حد تک کا اضافہ نہیں، بلکہ بلا مبالغہ ایک اور لاکھ کی نسبت سے یہ اضافہ بتدریج بڑھتا رہا اور بڑھ رہا ہے، بڑھتا رہے گا، تاہیں کہ ساری نسل انسانی اس کی گواہ بن جائے۔

اور اسی تدریجی اضافہ کی نسبتوں کے ساتھ سلطنتوں کے پر جلال، پر شوکت جلو، بادشاہوں کے شاہانہ اور کڑے پہرے، علماء کی سخت ترین ماہرانہ چوکسی، فقر صوفیہ کی باوقار، پر عظمت نگرانی اور امت مرحومہ اسلامی کی فطری بیدار دماغی، طبعی ذکاوت حسی کے حصار میں صدیوں اور سالوں کا کیا ذکر ہے، بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے اور کہنا چاہئے، اس کے سوا جو کچھ کہا جائے گا، جھوٹ ہو گا کہ ایک لمحہ، ایک پل کے ادنیٰ ترین حصہ کے انقطاع کے بغیر ٹھیک اسی آن بان، اسی سچ دھج کے ساتھ امت کے ان افراد کو ملتا رہا، اس وقت تک مل رہا ہے، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے رسول کی صحبت سے فیض یاب نہیں ہیں، لیکن اسی کے ساتھ نہ ان کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک سیکنڈ کیلئے ان سے اوجھل ہوا اور نہ وہ اپنے رسول ﷺ سے غائب ہوئے، سعادت صحبت سے بہرہ مند اگر کہہ سکتے تھے اور ان کو کہنے کا حق تھا کہ وہ اپنی نمازوں میں وہی پڑھتے ہیں، جو ان کا رسول پڑھتا تھا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں، جس طرح وہ کھڑا ہوتا تھا، اسی طرح جھکتے ہیں، جس طرح وہ جھکتا تھا، اسی طرح زمین پر پیشانی رکھتے ہیں، جس طرح وہ پیشانی رکھتا تھا، تو قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ جن کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی، ہر قرن، ہر صدی، بلکہ اس وقت بھی جہاں کہیں ہیں، قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی وہی پڑھتے ہیں، جو ان کا رسول پڑھتا تھا، اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں، جس طرح وہ کھڑا ہوتا تھا، اسی طرح جھکتے ہیں، جس طرح وہ جھکتا تھا، اسی طرح زمین پر پیشانی رکھتے ہیں، جس طرح وہ رکھتا تھا، سمجھوں نے تو خدا کی تصویر کھینچی، لیکن ایسا کون ہے، جس کی بندگی کی تشکیل اس طرح کی گئی ہو، ”ہوبہ“ ”من وعن“ جیسا کہ وہ تھا، وہ مشکل کیا گیا، کیا جا رہا ہے اور کامل یقین کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ اس کے ساتھ قطعاً وہ واقعات پیش نہیں آئے۔ ہاں!

جس طرح پہلوں کی کتاب چھینی گئی، ان کو ان کے رسولوں، اوتاروں سے جدا کیا گیا، کیا کوئی دکھا سکتا ہے ان کے ساتھ بھی سال دو سال کیلئے نہیں، روز دور روز، گھنٹے دو گھنٹے، سیکنڈ دو سیکنڈ کیلئے کبھی (لا فعلہ اللہ) ایسا واقعہ پیش آیا اور جس نے دنیا کے کسی گوشہ میں کبھی ایسا ارادہ کیا، کیا مسلسل نہیں دیکھا گیا کہ جس نے چھیننا چاہا، وہی چھینا گیا، جس نے جدا کرنے کا خیال پکایا، وہی جدا کیا گیا، یہی ہوتا رہے گا، جس پر یہ گریں گے، وہ بھی ٹوٹے گا اور جو ان پر گرے گا، وہ چکنا چور ہوگا، پھٹے ہوئے نہیں، بلکہ تاریخ کے کھلے ہوئے مسلسل اوراق میں یہی لکھا ہوا ہے، یہی لکھا جائے گا، بہر حال یہ سلسلہ یونہی جاری رہا، تا ایں کہ بالآخر تاریخ کے اس عجوبہ طراز عہد میں نسلِ انسانی داخل ہو گئی، جس میں ہر بعید قریب، ہر دور نزدیک، بلکہ شاید ہر غائب حاضر ہو گیا، مکانی فاصلے حذف ہو گئے اور وہی دنیا جو کبھی متعدد دنیا سمجھی جاتی تھی، ایک دنیا، بلکہ اگر کہو تو کہہ سکتے ہو کہ ایک بستی ہو گئی، زمانی مسافتیں کم ہو گئی، بلکہ شاید زمانہ کے تین قسموں اور تین حصوں میں سے ایک حصہ ماضی کا تقریباً قابل ذکر نہیں رہا کہ اب جو گزرتا ہے، وہ نہیں گزرتا ہے اور جو غائب ہوتا ہے، حاضر ہی رہتا ہے، وہی نہیں جنہیں دنیا میں کچھ اہمیت حاصل ہے، بلکہ دنیا کی ادنیٰ ادنیٰ پیداوار جو کبھی پیدا ہونے کے ساتھ ہی مٹ جاتی تھی وہ بھی اب انمٹ ہو گئی، قدرت نے اپنی پوشیدہ طاقتوں کا خزانہ، پریس، تار، برق، لاسکی فون وغیرہ کی شکلوں میں فیاضی کے ساتھ وقت عام فرما دیا ہے، آخر آج کون گن سکتا ہے ان ذرائع اور وسائل کو، جن کے ذریعہ سے دنیا کے حوادث و واقعات، تحریریں، تقریریں محفوظ ہو رہی ہیں، بزن و بازار میں آج یہ چیزیں ماری پھرتی ہیں اور ہر اعلیٰ و ادنیٰ کو میسر ہیں، آج کوئی ”امانت کی اندر سبھا“ اور ”شرز“ کے ناول کو مٹا نہیں سکتا، پھر یہ اندیشہ اب کون کر سکتا ہے کہ تجربات کے ان ذخیروں کو اب دنیا کا کوئی حادثہ فنا کر سکتا ہے؟

ان ساز و سامانوں کے بعد کس قدر عجیب ہے، اگر کہا جائے کہ جو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب میں پیدا ہوئے تھے، وہ عرب ہی میں پیدا ہوئے تھے اور جس کی ولادت چھٹی صدی ہجری میں ہوئی تھی، وہ چھٹی صدی ہی میں ہوئی تھی۔

اس زمانہ کے جب ہر غائب کو حاضر اور ہر بعید کو قریب سمجھا جاتا ہے، کیا وجہ ہو سکتی

ہے کہ پھر ان تمام غائبوں میں جو سب سے زیادہ حاضر اور ایسا حاضر کہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اتنا حضور ہم میں سے کسی کو خود اپنے سامنے نہیں ہے، ان تمام بعیدوں میں جو سب سے زیادہ قریب اور اتنا قریب ہے کہ خود ہم اپنے سامنے اپنے کو اس قدر قریب نہیں پاتے۔ آخر ہم میں کون ہیں؟ جس کے دماغ میں اپنی پیدائش، طفولیت، شباب، کہولت، خلوت، جلوت کے تمام واقعات اور اس کے تمام پہلو اتنی صفائی کے ساتھ موجود ہوں، جتنی تابناکی کے ساتھ دنیا اس شخص کے متعلق جانتی ہے، جو اگرچہ آج سے صدیوں پہلے عرب میں ظاہر ہوا، لیکن جس کے ظہور کی شدت ہر پچھلی صدی میں پہلے سے زیادہ محسوس کی گئی، کی جارہی ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ اسی بڑھتی ہوئی اشد ادی کیفیت کے ساتھ محسوس کی جائے گی کہ قدرت نے اب جن سامانوں کو پیدا کیا ہے، ان کا یہ لازمی نتیجہ ہے اور شاید اس ہستی مبارک کے اسی غیر منقطع ارتقائی تسلسل کا نتیجہ ہے کہ اس کے بعد نبوت کا دعویٰ دور از کار ہے، اس دعویٰ کا ہر مدہی فالتو اور زمین کی پشت کا بالکل ہی غیر ضروری بار ٹھہرایا گیا، چھٹی صدی عیسوی کے بعد زمانہ کے ہر حصہ میں ٹھہرایا گیا، دنیا کے ہر خطہ میں ٹھہرایا گیا۔

اور جن بد بختوں کے دل میں کبھی اس منصب کی جھوٹی ہوک اٹھتی ہے، یا اٹھوائی جاتی ہے، تم دیکھو! خلاف دستور بنی آدم کتنی بد سلوکیوں کے ساتھ آخر وقت تک اس کو در راتے، دھتکارتے رہے، اٹھنے کو تو یہ اٹھ جاتے ہیں، لیکن چند مغالطی پینتروں کے بعد ہی ان کو خود یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کیلئے دنیا میں کوئی کام نہیں، بنی آدم کی بستیوں میں ان کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے، پھر یوں ہی بازاری بے روزگاروں کی طرح بالآخر سرگردانی کے ساتھ بھٹکتے، بھٹکاتے بہ ہزار حسرت و ناکامی، نامرادی کے گڑھوں میں ہمیشہ کیلئے مدفون ہو گئے، تاریخ شاہد ہے کہ بوالہوسیوں کے ہتھیاروں سے بے چین و مدہوش ہو ہو کر اگر کوئی نبوت کا نام لے کر کبھی اٹھا بھی، تو قدرت کے انہیں ہاتھوں نے جلتی ہوئی گھاس کے خاکستر کی مانند اس کو وہیں بٹھادیا، چودہ سو سال کا یہ تجربی مشاہدہ ہے، حالانکہ اس سے پہلے تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا کہ چار پانچ سو سال کے اندر کوئی نبی نہ آیا ہو، اس کی ضرورت نہ پیدا ہوئی ہو۔ اگرچہ کھلے کھلے صاف غیر مبہم لفظوں میں بار بار اس کی منادی بھی کر دی گئی تھی اور نبوت و رسالت کے سلسلہ میں یہ پہلی منادی تھی کہ اب آسمان کا پیغام لے کر زمین والوں

کے پاس کوئی نہیں آئے گا، یہی وجہ ہے کہ ختم نبوت کی اس سنگین مہر سے جو بھی ٹکراتا ہے، وہی پاش پاش ہو جاتا ہے اور قدرت کی چٹان پر سر مارنے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔

بالفرض اگر یہ اعلان نہ بھی ہوتا، جب بھی آخر دنیا کیا کرتی؟ آنے والے تو ہمیشہ اسی وقت آتے ہیں، ان میں آتے ہیں، جب جانے والا بھی جا چکے، لیکن ایسا آنے والا، جو اس شان کے ساتھ آیا کہ بجائے جانے کے وہ آگے ہی بڑھتا رہا، بڑھ رہا ہے، گنجائش ہی کیا ہے کہ اس کی جگہ دوسرا آئے۔ جس طرح وہ بھیجا گیا، جن صفات و کمالات کے ساتھ بھیجا گیا، اسی شان، اسی آن کے ساتھ چمکتے ہوئے آفتاب اور دھندے ہوئے سورج کے مانند ہم میں وہ اسی طرح موجود ہے، ہر جگہ موجود ہے، ہر خطے میں موجود ہے، اس کا وجود مغرب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے، جس طرح مشرق میں وہ آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے، شاہوں کے قصور اور غریبوں کے گلہبائے دیجور دونوں کو روشنی بانٹ رہا ہے اور یکسانی کے ساتھ بانٹ رہا ہے، وہ سب کیلئے برابر ہے، سب کیلئے یکساں ہے، وہ فضا میں بھری ہوئی ہوا ہے، جس میں سب سانس لیتے اور وسعت کون و مکان کا وہ نور ہے، جس میں سب چلتے ہیں، پلتے ہیں، پھولتے ہیں، پھلتے ہیں، یقیناً اس کی ضرورت جتنی چھٹی صدی کے باشندوں کو تھی، اتنی ہی ضرورت اس وقت تک باقی ہے، پھر جب تک پیاس ہے، پانی پھلکے گا اور جب تک بھوک ہے، روٹی معدوم نہ ہوگی، آخر اس وقت تک کیا تھا، جواب نہیں ہے، یہ سچ ہے کہ دنیا اپنے خالق سے ٹوٹ کر اس زمانہ میں مخلوقات کے اندر غرق تھی، لیکن کیا آدم کی اولاد تباہی کے اس گرداب سے نجات پا چکی؟

بلاشبہ جنہیں اس کی برکت میسر آئی ہے، ان میں اکثروں کا جو مرتد، یا منافق نہیں ہیں، ان کا بیڑہ خطرہ ہے انشاء اللہ نکل چکا ہے، لیکن کون کہتا ہے کہ سب کا نکل چکا ہے؟

پھڑ پھڑا رہے ہیں، ہندوستان کے ایک قطعہ اراضی میں اتنے پھڑ پھڑا رہے ہیں کہ ان کا شمار صد ہزار سے نہیں، بلکہ کروڑوں سے کیا جاتا ہے اور یہ تو صرف ہندوستان کا حال ہے، اس ملک سے باہر بھی کیا کام پورا ہو گیا ہے؟

آباد جزیروں کے اس جنگل میں جہاں آفتاب نکلتا ہے اور مشرق کا وہ گنجان خطہ جہاں بنی نوانسان کی سب سے بڑی آبادی ہے، کیا چین و جاپان کے ان باشندوں کی اپنے

مالک سے صلح ہو چکی ہے؟ یقیناً ایک گروہ وہاں بھی ایسا پیدا ہو چکا ہے، جس نے مخلوقات کی بندگی کا جو گردن سے پھینک کر حقیقی اور سچی زندگی حاصل کی ہے، لیکن کون نہیں جانتا کہ ان ممالک کی اکثریت ابھی اسی طرح اپنے مالک سے روٹھی ہوئی ہے، جس طرح اس کے آباؤ اجداد روٹھے ہوئے تھے۔ غریب مشرق تو پسماندگان کا ملک ہے، لیکن جن کی پیش گامیوں کا ڈھنڈورا اس زور سے پیٹا جا رہا ہے، کیا یورپ کے ان باشندوں کی سمجھ سیدھی ہو چکی ہے۔ ”باپ بیٹے“ کے قدیم افسانے کو تو چھوڑو، لیکن جن خلقتوں کی ایجاد و تخلیق کی انہیں توفیق بخشی گئی، بجائے توفیق بخشے والے کے خود اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے ان مخلوقات کو اپنے دلوں میں نہیں بٹھائے ہوئے ہیں؟ یقیناً ان کے قلوب ان جدید مخلوقات کی انتہائی عظمت سے اسی طرح لبریز ہیں، جس طرح ان کے بزرگوں کے دل پرانی مخلوقات کے احترام سے معمور تھے۔

پہلوں کی عقل کو سورج کی شعاعوں اور آگ کے شعلوں نے خیرہ کیا تھا، تو کیا پچھلوں کے سینوں میں برقی قوتوں، اسٹیم کی طاقتوں، پٹرول کی توانائیوں نے چکا چونڈ نہیں لگائی ہے، بزرگوں کے کارناموں، سوراخوں کی اولوالعزمیوں نے اگر پہلوں کو ان بزرگوں کی پتھر کی کھودی ہوئی صورتوں کے آگے جھکایا تھا، تو پچھلوں کے لیڈروں، زعمیوں اور قائدوں کے کاموں نے ان کے اسٹیچو اور فوٹو کے ساتھ ان کی ساری قومی عزت و فلاح کو وابستہ نہیں کیا ہے؟

پرانوں کے دیوتاؤں کی گنتیوں کو سن کر تم قہقہے لگاتے ہو، ہنستے ہو، جب سنایا جاتا ہے کہ احمق ہندوستان، خالق سے ٹوٹ کر چالیس کروڑ دیوتاؤں اور معبودوں کے ساتھ جکڑا ہوا تھا، مگر کوئی ہوتا، جو ان نئے دیوتاؤں کی فہرست بتاتا، جن کے ساتھ فرزانہ و دانا یورپ کی روح اس طرح خالق سے بیگانہ ہو کر ڈوبی ہوئی ہے، آخر بتایا جائے ان دونوں نئے اور پرانے طبقوں میں کیا فرق ہے، خالق سے یہ بھی دور، وہ بھی دور، مخلوقات کے بوجھ سے یہ بھی چور، وہ بھی چور، کچھ فرق اگر ہے، تو صرف اس قدر ہے کہ پرانوں کے معبود بھی پرانے تھے اور نئے کے معبود بھی نئے ہیں، پرانوں کے پرانے معبودوں میں عجائب و غرا ب اور نئے نئے فوائد نظر آئے تھے اور نئے کونئی مخلوقات میں عجائب و غرائب، نئے نئے فوائد

نظر آرہے ہیں۔ مظاہر احترام اور تعظیم کے بیرونی قالبوں کی خصوصیتوں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے، تو ناپ لیا جاسکتا ہے، اگر قلبی احساسات اور ذہنی کیفیات کے ناپنے کا کوئی آلہ ہوتا کہ پرانوں کے دلوں میں پرانے معبودوں کے متعلق جو کچھ تھا، انہوں کے قلوب میں معبودوں کے متعلق وہی کچھ، بلکہ شاید کہ اس سے بھی زیادہ ہو۔

پرانے بھی تنہا خدا کے نام پر پھر جاتے تھے، انہوں کے سامنے جا کر آج خدا کا تہنا کیا، بلکہ ان کے معبودوں کے ساتھ ملا کر بھی نام لو، پھر دیکھو کہ ان کی پیشانی کی کھال کس طرح سکڑتی ہے اور منہ سے کتنے تو لے کف کے اڑاڑ کے بیچارے نام لینے والے کے چہرے پر پڑتے ہیں، تحریروں میں، تقریروں میں، گفتگو میں، تذکروں میں، کیا انہوں کا یہ گروہ اپنے معبودوں کا نام لئے بغیر کبھی گزرتا ہے، برق کا، بھاپ کا، تار کا، ربل کا، سیاروں کا، طیاروں کا، فیکٹریوں کا، ملوں کا، بنکوں کا، سرمایوں کا، ان کی مختلف شکلوں، مثلاً انشورنسوں، ریسیوں اور خدا جانے کن کن خداؤں کا نام آج دلچسپی کے ساتھ جس ذوق و شوق کے ساتھ لیا جاتا ہے، مشکل ہے کہ خالق کے پوجنے والوں نے اتنے ذوق و شوق کے ساتھ ”بسم اللہ، سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ“ کا ذکر کبھی کیا ہو۔

یہ حمد بھی کرتے ہیں، تو ان ہی خداؤں کی، نعت بھی لکھتے ہیں، تو ان ہی کی، پھر میں کیا غلط سمجھا جب میں نے کہا کہ جو پرانے تھے، وہی نئے ہیں، چند مخلوقات کے گرد پالتیاں مارے وہ بھی بیٹھے تھے اور ٹھیک اسی طرح فطرت کے چند نوامیس و قوانین کے آگے یہ بھی مجھ رقص و راہ مشگرمی ہیں، وہ ان کا بھجن گاتے تھے، یہ ان کا شکر کرتے ہیں۔

﴿اتُوا صَوَابًا بِهٖ بَلَّ هُمْ قَوْمًا طَٰغُوْنَ﴾

تم کہتے ہو کہ پہلوں نے انسانیت کو ذلیل کیا: جو سب سے اونچا تھا، وہ سب سے نیچا اور ”اسفل سافلین“ کے درجہ پر پہنچایا گیا۔

بلاشبہ یہی ہوا، یہی ہونا بھی چاہئے کہ خالق ایک ہے اور مخلوقات لامحدود ہیں، پس جس نے ایک کو چھوڑا، اس کو ہر ایک سے جوڑنا پڑے گا، جو ایک سے نہیں ڈرے گا، اس کو ہر ایک سے ڈرنا پڑے گا، جو جھکنے ہی کیلئے ہے، اسکو جھکنا ہی پڑے گا، لیکن ایک کے آگے جھکا، تو سب اس کے آگے جھکیں گے اور جس نے ایک کے آگے سر ٹیکنے سے انکار کیا، دیکھو! وہ

ہر ایک کے آگے سر ٹیکے پڑے ہیں، ملائکہ کے آگے، جن کے آگے، انس کے آگے، حیوانات کے آگے، نباتات کے آگے، جمادات کے آگے اور میں کیا دکھاؤں کہ جو دیکھا نہیں جاسکتا، اس کے آگے۔

یہی وہ عذاب ہے، جو آخرت سے پہلے ان کو دنیا میں چکھنا پڑا، چکھ رہے ہیں، برضا و رغبت چکھ رہے ہیں۔

مگر کیا انسانیت کی یہ توہین صرف پہلوں میں تھی، پر انوں نے خالق کے معبود ہونے سے انکار کیا، بیشک اس کے صلہ میں انہیں بندروں کو معبود بنانا پڑا، لیکن جن لوگوں نے اپنے تئیں خدا کی مخلوق ہونے میں شک کیا تھا، آج بندر کے مولود ہونے کا اپنی زبانوں میں کیوں اقرار کر رہے ہیں، جس نے بندر کو معبود بنایا، کیا شبہ ہے کہ اس نے انسانیت کو رسوا کیا، لیکن جس نے خدا کی مخلوق ہونے سے انکار کر کے بندر کے مولود مسعود ہونے پر فخر کیا، کتا میں لکھیں، دلائل قائم کیے، کر رہے ہیں، کیا انسانیت کی خواری میں انہوں نے کوئی کمی کی ہے اور صحیح تو یہ ہے جو ہر چیز کی قیمت لگاتے ہوئے یکا یک چیخ اٹھتے ہیں کہ نفسانیت کی کوئی قیمت نہیں ہے، سب انسان کیلئے ہیں، لیکن انسان کسی کیلئے نہیں، کسی مقصد کے لئے نہیں، کیا اس نے انسانیت کو ان غفونتوں اور غلاظتوں سے بدتر نہیں ٹھہرایا، جن سے انسانوں کے کتنے مقاصد وابستہ ہیں، جب انہوں نے کہا کہ انسان اپنے خدا اور خالق کیلئے نہیں ہے، تو کیا اس کے بعد یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انسان کسی کیلئے بھی ہے، پانی کا کیا بگڑے گا اگر آدمی نہ ہوں؟ ہوا کیوں رک جائے گی، اگر آدمی نہ ہوں؟ آفتاب میں کیا داغ آجائے گا اگر آدمی نہ ہوں؟ حتیٰ کہ سڑک کے کسی سنگریزہ اور جنگل کے کسی تنکے کا کیا نقصان ہے، اگر کوئی نہ ہو، تمہارے بڑے نہ ہوں، چھوٹے نہ ہوں، کوئی نہ ہو، بے شک سب ان کیلئے ہیں، لیکن مخلوقات کے اس طویل و عریض سلسلہ میں انسان کسی کیلئے نہیں، اب اگر وہ خالق کیلئے ہی نہیں، تو اس سے زیادہ عبث و بے نتیجہ فضول و مہمل، بیہودہ ہستی اور کس کی ہو سکتی ہے؟ اس رسوائی سے بڑی رسوائی اس ہتک سے بڑی ہتک اور کیا ہو سکتی ہے؟

اور یہ ایمان کا حال ہے، عمل کے میدان میں ان جاہلوں کے پاس کیا تھا، جو آج کے عالموں کے پاس نہیں ہے۔

عرب کے جہل نے کیا پیدا کیا تھا، جو آج کے علم سے نہیں پیدا ہو رہا ہے، جاہل شراب پیتے تھے، مردار کھاتے تھے، زنا کرتے تھے، سود خوار تھے، جواری تھے، ایک کا خون دوسرا پیتا تھا، اطلاق و افلاس کے اندیشہ سے لڑکوں کو، لڑکیوں کو گور میں زندہ دفن کر دیتے تھے، لیکن یہ قصہ کن کا سنایا جا رہا ہے، کیا عرب کے جاہلوں کا، یا یورپ کے عالموں کا؟ وہاں کیا دکھاتے ہو، جسے یہاں ہم اپنی آنکھیں سے دیکھ رہے ہیں، عرب سے باہر ایران میں ایک طرف ”مزدک“ زر، زمین، زن کو سب سے چھین کر سب کو دے رہا تھا اور دوسری طرف ”مانی“ اور اسکے شاگرد ہاتھوں میں استرے لئے پھرتے تھے کہ جس راہ سے یہ برائیاں آئی ہیں، ان ہی کا قلع قمع کر دیا جائے، وہ انسانوں کو انسانوں میں آنے سے روکتے تھے، یہی ان کا فلسفہ تھا، لیکن یہ تو ایران میں ہو رہا تھا، آج تو یورپ کے ایک حصہ میں پھر وہی ”مزوک“ ”زندہ ہو کر ”بالشوئیک“ کے نام سے کیا وہی سب کچھ نہیں کر رہا ہے، جو اس نے کیا تھا اور دوسری طرف ”برتھ کنٹرول“ کے نام سے اسی طرح انسانوں کو انسانوں کی سوسائٹی میں شریک ہونے سے روکا نہیں جا رہا ہے.....؟

ایک راستوں کو ڈھاتا اور دوسرا بند کرتا ہے، اسکے سوا اور کیا فرق ہے؟ صحیح ہے کہ ہندوستان میں بدھ مت کے فلسفہ نفس کشی نے بڑی گندی شکلیں اختیار کی تھیں، ”دام مارگی“ پیدا ہوئے تھے، ”ماننگ و دیادام مارگی“ تک پائے جاتے تھے، ”اگھوری“ ہونا آتما کی بڑی پاکی تھی، لیکن آج گندیوں میں صفائی کے مدعی بن کر جولت پتہ ہیں، ”اگھوریوں“ کو بھی قے ہو، اگر ان کا حال سنایا جائے۔ بے پردگی و عریانی نے جنسی لذتوں کو جس حد تک بے جان کیا ہے، اس میں جان ڈالنے کیلئے آج مغرب کا ”اگھوری“ جو کچھ کر رہا ہے، واقعہ ہے کہ اس کے سامنے مشرق کا اگھوری بھی شرمندہ ہے، الحاصل جو کچھ اس وقت تھا، جہاں تک سوچو گے، کسی نہ کسی شکل میں تم اس وقت بھی اس کو پاؤ گے، پس آنے والا کیسے جاسکتا تھا، جب تک کہ وہ سب نہ جاتے، جس کیلئے وہ آیا تھا، بلکہ اسکی ضرورت تو اسکے بعد بھی رہے گی کہ یہ تو تخریب ہے، لیکن کیا تعمیر بغیر معمار کے ممکن ہے؟ اور یہی میرا مقصد تھا، جب میں نے کہتے ہوئے سب سے پہلے کہا تھا کہ ”یہی وہ آنے والا ہے، جو آنے ہی کیلئے آیا“۔ پھر جس طرح آج وہ ہم میں موجود ہے، اس کی ضرورت موجود ہے،

ان کو دیکھ کر اب بھی کوئی شک کر سکتا ہے کہ آنے کے بعد وہ نہیں گیا اور جب اس کی ضرورت ہے، نہیں جائے گا؟ تھا، ہے، رہے گا، ابد تک رہے گا اور اس کیلئے یہی مقدر ہے۔

فَاللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ
وَرَسُولِكَ النَّبِيِّ وَعَلٰى اٰلِهِ وَازْوَاجِهِ اَمَهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ
وَعَلٰى ذُرِّيَّتِهِ وَعَلٰى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِيْنَ
وَالْمُسْلِمَاتِ كَمَا صَلَّيْتَ وَبَارَكْتَ عَلٰى سَيِّدِنَا
اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا اِبْرَاهِيْمَ فِي الْعَالَمِيْنَ اِنَّكَ

حمید مجید

پس اے اخوان عزیز!

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ
عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ
سَمَّاكُمْ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ
شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا
الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ
فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ﴾ (الحج: ۷۸)

”کوشش کرو اللہ کی طرف بلانے میں کوشش کا پورا حق ادا کرتے ہوئے
، اسی نے (اے امت اسلامیہ) تم کو چن لیا ہے اور تم پر دین میں کوئی تنگی
نہیں فرمائی، یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے، اسی نے تمہارا
نام ”مسلمین“ رکھا، پہلے بھی اور اس میں بھی (کوشش کرنے کا نتیجہ یہ
ہوگا) کہ رسول تمہارے نگران رہیں گے اور تم دنیا کے نگران رہو گے، پھر
لوگو! نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اور زور سے پکڑ لو اللہ کو، وہی تمہارا آقا ہے،
پھر کتنا اچھا آقا ہے، کتنا اچھا مددگار۔“

جب جانے کیلئے آنے والے آتے رہے، اشخاص چنے جاتے تھے، لیکن جب وہ
آیا، جو آنے ہی کیلئے آیا، تو اس کے طفیل میں اس کے ساتھ شخص نہیں، بلکہ ایک امت ہی چنی

گئی، پہلے شخص مبعوث ہوتے تھے، اب ایک امت ہی مبعوث ہے، یہ اس امت کا ”اصل منصب“ اور ”فرض حقیقی“ ہے، جب تک وہ اس منصب پر قائم رہیں گے اور انسانوں کی نگرانی کریں گے، اس وقت تک ان کے رسول ﷺ بھی اس امت کے نگران رہیں گے، لیکن جب تم اپنے منصب سے ہٹے، اگر رسول کی نگرانی کو نہیں محسوس کرتے ہو، تو کیا یہی وعدہ نہیں تھا۔

یہ امت مجتبیٰ و مبعوث ہر قوم میں ہے، ہر ملک میں ہے، پس جو جہاں ہے، وہ وہیں مبعوث ہے، اس کی قوم اسی ملک کے باشندے ہیں، مصیبت کی گھڑی وہی تھی، جب اپنی قوم کو ہم نے اپنی قومیت سے نکالا، اسی کے ساتھ ان کا درد بھی دل سے نکلا، حالانکہ اگر حضرت نوح علیہ السلام کے منکران کی قوم تھی، حضرت ہود علیہ السلام کے کافر، ان کی قوم تھی، قریش رسول خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے لوگ تھے، تو کس نے کہا کہ ہندوستان کے ہندو ہندوستان کے مسلمانوں کی قوم نہیں، مصریوں کی قوم مصر کے قبط نہیں، یورپ کے عیسائی یورپ میں رہنے والے ترکوں کی قوم نہیں ہیں، پس جب تک:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ﴾

(البقرة: ۱۹۳)

نہ ہو، تھک کر بیٹھنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ وثیقہ ہے کہ:

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ

عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾

(الصف: ۹)

”اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا،

تاکہ سارے دین پر وہ غالب ہو۔“

اور دیکھو کہ لاندہ بیت پر مذہبیت غالب ہے، چند پیشہ ور کتاب سازوں، یا سابق فروش معلموں کو جانے دو، جو وساوس باقی کی روٹی کھاتے ہیں، عام فطرت انسانی پر مذہب کی گرفت اسی طرح سخت ہے، جس طرح ہمیشہ سے تھی۔ آخر اگر مذہبیت کا اسی قدر زور ہو گیا ہے، تو جس یورپ کے متعلق یہ سنایا جاتا ہے، کیوں نہیں وہاں کے باشندوں نے لاندہب ہونے کا اعلان کیا ہے.....؟

سچ یہ ہے کہ انسانی دماغ کی جو ذہنی ساخت ہے، اس میں اتنی تنگی، یا پستی کس طرح

پیدا ہو سکتی ہے کہ ماضی و مستقبل کے انجام کے فیصلہ کے بغیر وہ اپنی زخمی گزرا رہے، کہاں سے آیا ہوں، کہاں جا رہا ہوں؟ کیوں آیا ہوں؟ چلنے والے کے سامنے ان سوالات کے جواب نہیں ہیں، کیا وہ ایک قدم بھی آگے بڑھ سکتا ہے...؟

بہر حال کم از کم اس وقت تک تو دنیا میں لاندہوں سے زیادہ، بہت زیادہ، بہت ہی زیادہ تعداد مذہبی لوگوں کی ہے، اور مذاہب میں ہر حیثیت سے جو وزن اسلام کو حاصل ہے، کسی کو نہیں ہے۔ پس اس کا منطقی نتیجہ کیا یہی نہیں ہوا کہ لاندہیت پر مذہب غالب اور تمام مذاہب پر اسلام غالب، اس لئے سب پر اسلام غالب ہے۔

جب مسلمان اپنی نگرانی دوسروں کے سپرد کر کے رسول علیہ السلام کی نگرانی سے اس وقت محروم ہیں، اس زمانہ میں بھی اسلام کے غلبہ کا یہ حال ہے، تو کیا حال ہوگا جب دنیا کے نگران بن کر پھر رسول کی نگرانی کی سعادت مسلمان حاصل کر لیں گے، کچھ نہیں، کوئی کام نہیں، جب تک اصل کام نہ ہوگا، کسی کام میں کوئی برکت نہ ہوگی، بہت آرام لے چکے، تھکن مٹ چکی، کام بہت باقی ہے، ہوتا کہ چونکنے والے چونکتے، اور ”درا“ کی اس ”بانگ“ پر چل پڑتے:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد (ا) سے اجالا کر دے
وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

(اقبال)

(نقوش رسول نمبر)

توحید القرآن

آج کی اشاعت میں ”توحید القرآن“ کا دوسرا نمبر شائع کیا جاتا ہے۔ تفصیل و توضیح، تمہید مقدمات، تقریبات مطالب میں بات بہت زیادہ پھیل گئی۔ بہتر ہوگا کہ ناظرین اس کو مختصر لفظوں میں اجمالی طور سے یہیں سمجھ لیں، تاکہ آئندہ پھر استفادہ میں آسانی ہوگی۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ”اثبات واجب“، یعنی: خدا کا وجود اور چیز ہے اور اسکی توحید امر دیگر ہے، مثلاً: جو شخص ”کرورون“ کو واجب الوجود (العیاذ باللہ) مانتا ہے، تو وہ واجب، یعنی: عالم کی علت اور سبب (جو خود بخود موجود ہو) اس کا منکر نہیں ہے، بلکہ اس کی یکتائی کا منکر ہے، اسلئے توحید پر بحث کرتے ہوئے مان لینا چاہئے کہ عالمکے لیے کسی واجب ذات کی تو ضرورت یقینی ہے، لیکن اب سوال ہوتا ہے وہ ایک ہے، یا چند۔ بہر کیف اب سمجھنا چاہئے کہ قرآن اثبات توحید کے متعلق مندرجہ ذیل طریقے اختیار کرتا ہے۔

(۱) مشرک، یعنی: چند خداؤں کا قائل مدعی ہے اور موحد شریک کا منکر ہے، اسلئے بارِ ثبوت مشرک کے سر ہے، موحد کے لیے صرف انکار کافی ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿أَنتُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ آلِهَةً أُخْرَى قُلْ لَا أَشْهَدُ﴾

(الأنعام: ۱۹)

”کیا (اے مشرکین) تم گواہی دے سکتے ہو کہ خدا کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے۔ (اے محمد) فرمادے کہ میں نہیں گواہی دیتا (اگر تمہارے پاس دلیل ہے، تو لاؤ)۔“

اور مختلف طور پر سمجھا دیا گیا کہ دنیا کی کوئی قوت دوسرے خدا کے وجود پر دلیل نہیں لاسکتی، جس کی بشریح گذشتہ نمبر میں بخوبی کی گئی ہے۔

(۲) اس کے بعد فرماتا ہے کہ عالم کے موجود و خالق میں ذوا احتمال پیدا ہو سکتے ہیں۔

۱: تمام عالم کی علت صرف ایک ذات ہو۔

۲: یا اسکے ہر ہر جزء کے لئے الگ الگ علتیں ہوں۔

ان شقوں میں سے دوسری شق اس وقت تک متعین نہیں ہو سکتی، جب تک یہ ثابت نہ کر لیا جائے کہ ایک خدا عالم کے ایجاد و خلق، حفاظت و نگرانی کے لیے کافی نہیں ہے، کیونکہ اگر ایک ہی کافی ہے، تو دوسرے کی کیا ضرورت...! جیسا کہ آیت:

﴿أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ﴾ (الزمر: ۳۶)

۱: میں نے اس پہلو کی طرف دونوں نمبروں میں اشارہ کیا ہے البتہ آیت لکھ سکا تھا انشاء اللہ اس کی تفسیر

آئندہ کی جائے گی ۲

”کیا خدا اپنے بند کے لیے کافی نہیں“

جب اس میں بھی مشرکین کو ناکام و خاسر ثابت کر چکا، تو اب تیسرے پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس کی تفصیل آج کے نمبر میں درج ہے۔ محض اس کا صرف اس قدر ہے کہ توحید کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد انسان کی فطرت اس کے ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے اور یہ بالکل نیا دعویٰ ہے۔

اخیر میں قرآن نے پھر مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ دوسرے خدا کا وجود باطل اور عقلاً بالکل محال ہے۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں بشرط زندگی و توفیق اس پر بھی بحث کی جائے گی۔

اسی طرح تناخ کے متعلق آج جو کچھ لکھا گیا، یا پہلے لکھا جا چکا ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے ناظرین اس پر غور و توجہ کے ساتھ نظر ڈالیں کہ جن تحقیقات جدیدہ پر یہ تحریر مبنی ہے کہ ارض پر شاید اس سے پہلے کبھی نہیں سنی گئی۔ واللہ اعلم و فوق کل ذی علم علیم شاذ و نادر کبھی کبھی ہم سے شکایت کی جاتی ہے کہ اس قسم کے مضامین سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے، اس لئے بہتر ہے کہ میں اپنی مطمح نظر باتوں کو ظاہر کر دوں، تاکہ ارباب علم و مطالعہ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ”القاسم“ کے مطالعہ میں مصروف ہوں۔

(۱) مسلمانوں کے دل و دماغ میں ایسے معلومات اتارنا چاہتا ہوں کہ وہ دنیا کے ہر ایک مذہبی مجالس و علمی مذاکروں میں نہایت جرأت کے ساتھ اپنی صداقت کا اعلان کر سکیں۔

(۲) ہندوستان مختلف فرق و مذاہب کا گہوارہ ہے، عموماً مسلمانوں کو اپنی وطنی اور دنیاوی تعلقات کی وجہ سے ان کے ساتھ رہنا پڑھتا ہے، دیکھا گیا ہے کہ باتوں باتوں میں دوسرے مذاہب کا آدمی کسی مسلمان کو کبھی اسلام سے باہر نکال دیتا ہے، ورنہ کم از کم ایمان میں ضعف پیدا کر دیتا ہے۔ ”القاسم“ کے مضامین انشاء اللہ تعالیٰ اس کا بخوبی انسا د کر سکتے ہیں۔

(۳) تدریجاً مسلمانوں کی دماغی قوتوں کو ان مضامین سے ترقی دینی منظور ہے۔ ضرورت ہے کہ لوگ اسکے عادی ہوں، جو مضمون ایک دفعہ کے پڑھنے سے نہیں سمجھ میں آیا، پھر پڑھیے اور پھر پڑھیے، انشاء اللہ انشراح صدر ہو جائے گا اور اس کے بعد ایسے

مضامین پیدا کرنے کی آپ میں خود صلاحیت پیدا ہو جائی گی۔

ہم سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آسان مضامین بھی ساتھ ساتھ کیوں نہیں شائع کیے جاتے، جو اباً عرض ہے کہ عموماً ہم اس کا خیال کرتے ہیں، لیکن اس کے لئے زیادہ حصہ نہیں دے سکتے کہ ۳۲ صفحات کی مختصر ضخامت میں مختلف قومیتوں کے مضامین کثرت سے نہیں سما سکتے ہیں۔ اگر ایسا کیا جائیگا، تو اصل مقاصد کی برہادی کا اندیشہ ہے۔

ہمیں تجارت مقصود نہیں کہ خواہ مخواہ روپے کھسیٹیکے لیے فسانے، نادلوں، عائشخانہ، غزلوں سے ”القاسم“ کو بھر دیں۔ ہاں! یہ صورت ممکن ہے کہ رسالہ کی ضخامت بڑھا دی جائے، لیکن ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں قیمت بھی بڑھ جائے گی، اس لئے میرا خیال ہے کہ جن حضرات کو علمی مذاق کے علاوہ عامیانہ مضامین سے بھی دلچسپی ہو، وہ اسی قیمت میں ”القاسم“ کے ساتھ کوئی اور معتدل رسالہ بھی منگوا یا کریں، جس کی ملک میں کمی نہیں۔ ”القاسم“ کے مضامین سے بھی اکتا جائے، تو بطور ضمیمہ کے اسی کو پڑھ لیا کریں۔ آخر یہ بھی کیا کاہلی ہے کہ ایک کتاب اٹھالی، تو اب دوسری نہیں اٹھا سکتے، یہ تو ایسا ہوا کہ صاحب گوشت، دال، چٹنی، مٹب ہی کے شائق تھے، لیکن دسترخوان پر مختلف پیالوں کی طرف ہاتھ بڑھانے میں انہیں تکلیف ہوتی تھی، اسلئے سب کو ایک ہی میں ملا دیا، جس سے سب کا مزا برباد ہو گیا۔ علم کی کسمپرسی کا کیسا دردناک سانحہ ہے کہ ۳۰ دن کی دراز مدت میں ہندوستان کے ۸ کروڑ مسلمانوں میں ۱۳ علمی صفحوں کا پڑھنے والا بھی نہیں ملتا۔

فيا لصيغة العلوم و المعارف

پس افسوس و حسرت علم و معارف کی برہادی پر

حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے، تو ابھی تک حقیقی معنوں میں کوئی خالص اور رقیق علمی

مضمون شائع بھی نہیں ہوا اور اسی قدر نہیں، بلکہ مجھے مسلمانوں کی اس لاپرواہی پر زونا آ گیا کہ باوجودیکہ عربی زبان ان کی مذہبی زبان ہے، ان کا قرآن ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں، ان کی فقہ، الغرض انک کے تمام تر علمی سرمائے اسی پاک زبان میں محفوظ ہیں، لیکن پھر بھی مجھ سے شکایت ہے کہ تم ایسے الفاظ عربی کے استعمال کرتے ہو، جو اکثروں کی سمجھ میں نہیں آتے، اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا کہوں کہ رع

ابوالقاسم محمد زندہ بودے (صلی اللہ علیہ وسلم)

کثرتِ کار اور تنگی وقت کا شکوہ فضول ہے۔ آہ! تم میں کتنے ہیں، جو دن بھر میں چار پانچ گھنٹے محض گانوں اور اخباری تذکرات، واہیات، مذاق و ہنسی میں صرف نہیں کرتے.....؟

﴿بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۚ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ﴾

(القیامۃ: ۱۳، ۱۴)

”بلکہ انسان اپنے نفس (کے واقعات) سے خبردار ہے، اگرچہ معذرتوں کا پردہ ڈال رہا ہے۔“

پھر کیا عربی کا سیکھنا اس سے بھی بدتر ہے.....!؟

﴿فَمَا لَهُمْ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا﴾

(النساء: ۷۸)

”اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ بات سمجھنے کے گرز بھی نہیں پھلتی۔“

کسی گذشتہ اشاعت میں قرآنی براہین و حج کے متعلق جس عمومیت و کمال احاطہ و افادہ کا دعویٰ کیا گیا ہے، اس سے صرف اس قدر مقصود ہے کہ علماء قرآن کی دلیلوں میں اس طرز سے بھی غور فرمائیں۔ فقیر نے ایک نظیر ”القاسم“ کی گذشتہ اشاعت میں اثبات واجب کے متعلق پیش کی تھی، گرچہ اس کے دلائل قرآن میں بکثرت ہیں اور اس اعتبار سے ان پر پوری روشنی پڑتی ہے، تاہم، بنظر افادہ ”اثبات واجب“ کے بعد آج ”توحید“ کی ایک دلیل درج کی جاتی ہے۔ آئندہ اگر فرصت ہوئی، تو رفتہ رفتہ سب پیش کئے جائیں گے۔ وباللہ التوفیق۔

ہومر کی مشرکانہ کتبوں، دیوی اور دیوتا کی تعظیم و احترام سے لبریز بھجوں نے جب یونان کے عام مجالس و محافل میں رواج پایا، تو کہا جاتا ہے کہ شرک و گمراہی کی ایک لہر اٹھی، جس نے یونانیوں کے قدیم مذہبی عقیدوں کی بنیادوں کو ہتزلزل کر دیا۔

..... عربی میں اسکو امیزوس کہتے ہیں سرنا (ازمیر) میں پیدا ہوا اور وہیں مدرس ہوا، شاعری اسی مقام سے شروع کی، جوانی میں اندھا ہو گیا تھا، اس کی وہ نظمیں ”ایلیاڈہ اوڈیسی“ مشہور ہیں۔

موحدیں کی جماعت میں برہمی پھیل گئی تھی، عام طور پر پتھروں اور فرضی معبودوں کے آگے پیشانیاں جھکنے لگیں، برفانی چوٹیوں کے گانے والے، ناپنے والے دیوتاؤں کی محبت میں یونانی اس درجہ مبہوت وارفنہ ہوئے کہ کسی کی کچھ سننا نہیں چاہتے تھے، اندھے ہومرنے خدا جانے کیا افسوں پڑھا تھا، جس سے دنیا کی آنکھیں اندھی، کان بہرے، دل ٹھٹھرے ہو گئے تھے۔

اس وقت وہاں کے ایک پر مغز اور منطقی حکیم اکنیوفاں نے ”توحید“ پر عقلی دلائل قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

چونکہ ضرورت شدید تھی، اسلئے عام خیال ہے کہ اس نے اپنے قومی عقلیہ پر بہت زیادہ زور ڈالا اور مختلف پہلوؤں سے اس مسئلہ کو مدلل کیا ہے۔ اکنیوفاں کی بہترین دلیل جو آج کل کتابوں میں نقل کی جاتی ہے، اس کا خلاصہ صرف اس قدر ہے:

”خدا جب ہر چیز پر قادر ہے، تو وہ ایک ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ اگر چند ہوا، تو ہر چیز پر قادر نہیں رہ سکتا اور جو ہر چیز پر قادر نہیں، وہ خدا نہیں۔“

اس مجمل و مبہم دلیل کی غایت سے غایت اگر شرح کی جاسکتی ہے، تو میرے خیال میں اس سے زیادہ ممکن نہیں، جس کی توضیح کو ذیل کے مقدمات کے بعد پڑھنا چاہیے۔

(۱)..... وجود کی دو قسمیں ہیں: (۱) خود بخود ہو، غیر کا محتاج نہ ہو، جیسے: وجود واجب۔

(۲) غیر کا محتاج ہو، جیسے: وجود ممکنات۔

(۲)..... وجود اور ذات کوئی دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ وہ عین ذات ہے، مثلاً:

زید کا وجود (ہستی) اس کی ذات، یعنی: گوشت پوست دل و دماغ، ادراک و قوی، بدوح وغیرہ سے کوئی الگ چیز نہیں، بلکہ زید خود آپ اپنا وجود ہے، یا مثلاً: پتھر کا وجود پتھر کی حقیقت سے کوئی علیحدہ چیز نہیں۔

(۳)..... ذات کا پیدا کرنا یقیناً صفات کے پیدا کرنے سے مشکل اور صعب ہے، آدمی

موم کو لمبا چوڑا گول کر سکتا ہے، لیکن خود موم کی ذات کو پیدا کرنا مشکل ہے۔

(۴)..... جو وجود کے خود بخود ہو، لامحالہ وجود محتاج سے اعلیٰ و اکمل ہے۔

(۵)..... قدرت ایک صفت ہے اور اسکے بھی دو درجے ہیں: (۱) ایک تو سب پر شامل اور

سب پر محیط ہو،۔ (۲) دوسرے یہ کہ بعض چیزوں پر تو اسے تسلط ہو اور بعض چیزوں پر نہ ہو۔
 (۶)..... اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قدرت کی پہلی قسم، یعنی: محیط، لامحالہ دوسری قسم سے
 اکمل ہے۔

ان مقدمات کی تمہید کے بعد کہا جائے گا کہ خداوند تعالیٰ، یا ”واجب الوجود“ جب
 ذات کے اعلیٰ فرد (یعنی: خود بخود موجود ہونے والی ذات) کے ساتھ موصوف ہے، تو کوئی
 وجہ نہیں کہ قدرت جو ذات نہیں، بلکہ صفت ہے، اس کے درجہ کاملہ کے ساتھ وہ موصوف نہ
 ہو، کیونکہ بتایا جا چکا ہے کہ ذات کا معاملہ صفات سے بہت زیادہ مشکل ہے، پس جس شخص
 نے خدا کو ذات کے اعلیٰ فرد کے ساتھ متصف کیا، وہ صفات کے اعلیٰ مرتبہ کو تو اس کے لئے
 بدرجہ اولیٰ ثابت کریگا۔

پس معلوم ہوا کہ جو واجب الوجود (یعنی: جو غنی وجود) ہے، وہ بلاشبہ ہر چیز پر علاوہ اپنی
 ذات کے قادر ہوگا کہ قدرت کا اعلیٰ مرتبہ یہی ہے۔

اس کے بعد اب اکسنیو فان کے دعویٰ کی حقیقت بہت زیادہ روشن ہو جاتی ہے کہ اگر
 دو واجب الوجود ہوں گے، تو آیا انہیں سے ایک خدا دوسرے کو معدوم کر سکتا ہے، یا نہیں؟
 اگر نہیں کر سکتا، تو اس کی قدرت اعلیٰ قدرت نہ ہوئی کہ اعلیٰ قدرت ہی ہے، جو اپنی ذات کے
 علاوہ اور ہر ایک شے پر قادر ہو اور اگر معدوم کر سکتا ہے، تو پھر دوسرا خدا نہیں رہتا کہ خدا
 معدوم نہیں ہو سکتا، خدا تو اعلیٰ قدرتوں کا مظہر ہے اور جب اسم میں اتنی بھی قدرت نہیں کہ
 کسی غیر کے تصرف کو روک لے، تو وہ خدا کس طرح ہو سکتا ہے!.....؟!

تھوڑی دیر کے لیے ہم مان لیتے ہیں کہ اکسنیو فان کی دلیل تام ہے اور ”اثبات
 توحید“ میں اس کی حجت قاطع ہے، لیکن پھر بھی تم میں کتنے ہیں، جو وجود اور ماہیت
 (ذات) کی حقیقت کو سمجھتے ہوئے ہیں، یا صفات و ذات کی باہمی تفاوت کو سمجھ سکتے ہیں، ان
 کے مدارج کی تعیین کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں جس پر اسکی دلیل مبنی ہے۔

بلاشبہ فلسفہ اشراق کے مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک وجود عین ماہیت ہی ایک
 بدیہی مسئلہ ہے، لیکن آج اس کے مطالعہ کرنے والوں کی تعداد کتنی ہے اور آج کیا دنیا جب
 سے قائم ہے، انسانوں کے ایک ”شرذمہ قلیلہ“ (چھوٹی جماعت) کے علاوہ ان مزخرفات

کی طرف متوجہ ہونے کی کس کو فرصت ملی۔

یامثالاً: ارسطاطالیس کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ وہ توحید کے متعلق کہا کرتا تھا: ”ہو نہیں سکتا کہ مفہوم واجب کا دو ذاتوں پر مجہول ہو سکے، کیونکہ مفہوم واجب یا دونوں کے لیے ذاتی ہوگا، یا دونوں کے لیے عرضی، یا ایک کے لیے ذاتی اور دوسرے کے لیے عرضی۔ اگر دونوں کے لیے ذاتی ہے، تو مفہوم وجوب مشترک ہوا، ضرورت ہے کہ ان دونوں کو آپس میں ممتاز کرنے والی چیز اور ہو کہ بغیر امتیاز کے دو ہو کر موجود نہیں ہو سکتے، پس وہ خصوصیت جو ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہے، ناممکن ہے کہ مفہوم واجب کی عین یا جزء ہو کہ اشتراک عین وکل دوسرے عین و جزء کے اشتراک کو مستلزم ہے، پھر خصوصیت خصوصیت نہیں رہتی، بلکہ وہ لامحالہ مفہوم وجوب پر زائد ہوگی اور اس کے ساتھ مل کر حقیقتہً واجبہ کو ممتاز کرے گی، پس یہ خصوصیت اگر دونوں واجبوں میں ہے، تو دونوں محتاج ہوئے کہ کل جزو کی طرف محتاج ہوتا ہے، گویا واجب اپنے موجود ممتاز ہونے میں اس خصوصیت کا رہن منت ہوگا، حالانکہ وہ غنی ہے اور اگر صرف ایک میں ہے، تو جب ہی اسکے اندر دو جزء ہوئے:

(۱) وجوب شرک۔

(۲) خصوصیت، اور یہ بھی وہی احتیاج ہے۔

اسی طرح اگر مفہوم وجوب کا عارض ہوا، تو عارض اپنے عروض میں غیر کا محتاج ہوتا ہے، تو پھر لازم آتا ہے کہ واجب اپنے واجب ہونے میں غیر کا محتاج ہو جائے، جو احتیاج وجود کو مستلزم ہے، حالانکہ واجب اسی ذات کو کہہ سکتے ہیں، جو کسی چیز میں دوسرے کا محتاج نہ ہو، چہ جائیکہ وجوب وجود میں محتاج ہو۔

تمہارے سامنے کیا کہا گیا تم نے کچھ بھی سمجھا اور تمہاری کیا حقیقت ہے وہ جو اس وقت تحصیل فلسفہ میں اپنے سرکھپا رہے ہیں، سالہا سال اسکے اندر اپنی عمر برباد کر چکے ہیں، اس دلیل کو نہیں سمجھ سکتے، جب کہ ذیل کے مقدمات متخ نہ کر لیں۔

(۱) امر مشترک بلا امتیاز کے تحقق نہیں ہو سکتا۔

(۲) عین، یا جزء کا اشتراک کل اور عین آخر کے اشتراک کو مستلزم ہے۔

(۳) عروض عارض بغیر کسی علت ناممکن ہے کہ نفس ذات انکے لئے منشاء انشراح

نہیں ہوتی۔

(۴) خصوصیتہ فخصصہ امر سلبی نہیں ہو سکتی کہ دو بسیط، مثلاً: ایک ”آ“ ہے اور دوسرا ”

ب“ ہے۔ یوں بھی ممتاز ہو سکتے ہیں کہ آ، ب نہیں ہے اور ب، آ نہیں ہے اور اگر امر سلبی
فخصص ہو جائینگے، تو وہ مستلزم ترکیب و احتیاج نہیں ہیں۔ ۱۔ وغیرہ وغیرہ۔

اور جس طرح یہ خاصی دلائل کے نزدیک ہرزہ سرائی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے،

جبکہ یہی حال عامیانہ دلیلوں کا فیلسوفوں کے نزدیک ہے۔

مثلاً: ایک عام بات بیان کی جاتی ہے کہ دوسرے خدا کو مان کر اس کے ابطال کی

کوشش کی جاتی ہے، اسے محال ٹھرایا جاتا ہے، لیکن قرآن مجید نے استدلال کا پہلو بدل دیا، وہ

مشرکین سے پوچھتا ہے کہ تم چند خداؤں، چند معبودوں، چند دیوتاؤں کی تصدیق کرتے ہو،

بتاؤ کہ تمہارے پاس ان کے وجود کی کیا دلیل ہے؟ کیا تم گواہی دے سکتے ہو کہ معبود واحد

کے ساتھ اور بھی کوئی اللہ ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ صرف یہی ایسا سوال ہے جس سے شرک کی دیوار فوراً منہدم ہو جاتی

ہے، آخر اس سوال کا جواب کیا ہو سکتا ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کے اوپر کوئی گواہی تو اسی

وقت دے سکتا ہے کہ اس نے اس چیز کو کان سے سنا، یا آنکھ سے دیکھا، یا ہاتھ سے چھوا

ہو، ناک سے سونگھا، یا عقل سے پہچانا ہو۔

دنیا میں کون ہے جو کسی دوسرے خدا کے متعلق اس قسم کا دعویٰ کر سکتا ہے، کیونکہ جو اس

سے تو ایک ہی خدا معلوم نہیں ہوتا، چند کہاں تک معلوم ہو سکتے ہیں، ایک کو بھی ہم عقل کے

ذریعے سے جانتے ہیں، مگر اس دوسرے خدا کو کس نے دیکھا، کس نے چھوا، کس نے سنا،

۱۔..... شارح کلام ارسطو نے کہا کہ سلب غیر ترکیب اضافی ہے اور ترکیب اضافی میں ایسے مواقع پر مضاف بعد

مضاف الیہ کے ہوتا ہے، پس لامحالہ غیر کے بعد ہوگا اور اس میں واجب ممکن ہو جانے کا کہ واجب کا ہونا امر سلبی پر

موقوف ہے اور سلب غیر پر موقوف، پس واجب غیر کی طرف محتاج ہو گیا ۱۲۔

۲۔..... تو اگر پر یقین کرنے کی وجہ بھی عقل ہی ہے اور اسی طرح انبار کی خبروں کی تصدیق عقل کی وجہ سے کی جاتی ہے

کہ عقل کے نزدیک ان کی صداقت ہو چکی ہوتی ہے۔ ۱۲۔

۳۔..... اس کی تفصیل القاسم ”وامعات“ نمبر ۳ میں پڑھنی چاہئے۔ ۱۲۔

یا کم از کم عقل اس کی ضرورت کس لئے تسلیم کرتے ہیں؟ وجود ممکنات کے اندر جو کچھ دقتیں ہیں، خواخواہ میں، یا بقاء میں وہ ایک خدا کے مان لینے کے بعد حل ہو جاتی ہے، پھر اس دوسرے کی کیا ضرورت ہے؟ اور جب عقل و حواس کوئی اس کی شہادت نہیں دیتے، تو ہم کس طرح گواہی دے سکتے ہیں اور جو شہادت پر آمادہ ہو، وہ دلیل لائے۔ عزیز حکیم نے ہمیشہ اپنے نیک بندوں کے دلوں میں اسی حجت کو ڈالا ہے۔ اصحاب کہف نے اپنی قوم مشرک کے مقابلے میں یہی کہا:

﴿هَؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً لَوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِم بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ﴾
(الکھف: ۱۵)

”میری اس قوم نے خدا کے علاوہ معبود اختیار کئے ہیں، کیوں نہیں دوسرے معبود پر کوئی بین دلیل پیش کرتے ہیں“ (حتیٰ کہ فیصلہ ہو جائے)۔

اور یہ تو اس کی قطعیت تھی، لیکن مجھے تو دراصل اس کی عمومیت دکھانا ہے۔ امت مرحومہ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ کاش وہ سمجھے اس کو، جس کے نہ سمجھنے والا کبھی سمجھدار نہیں ہو سکتا۔

فرض کرو کہ تم دو ایک گاؤں میں جو کسی ایک زمیندار کا ہے ”اشاعتِ توحید“ کے لیے پہنچتے ہو، ایک لنگوٹ بند گنوار مشرک تمہارے سامنے سے گزرتا ہے، اس کو بلاؤ اور کہو کہ اس گاؤں کے دوسرے زمیندار نے مجھے مال گزاری وصول کرنے کے لیے یہاں بھیجا ہے، لوگوں کو خبر کر دو۔ گنوار کہے گا کہ دوسرا زمیندار کون ہے؟ ہم تو اس کو نہیں جانتے، تم اس سے پوچھو کہ کیوں نہیں جانتے؟ کہے گا کہ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا، کبھی نہیں سنا۔ اس کے علاوہ نوکر و ملازم جس قدر بھی آئے، وہ صرف ایک ہی زمیندار کا نام لیا کرتے تھے، ان باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے گاؤں کا ایک ہی مالک ہے۔

پس اس سے پوچھو کہ اے نیک مرد! اسی طرح دوسرے خدا کو تیری آنکھ نے کب دیکھا، تیرے کان نے کب سنا، تیری عقل نے کب سمجھا، آخر کس دلیل سے دوسرے معبود کو مانتا ہے...؟ اے قابلِ رحم شخص! جس کے وجود پر تیرے پاس کوئی دلیل نہیں، اس کے ماننے کی کیا ضرورت ہے، انکے آگے کس لئے جھکتا ہے، کیوں اس کی پوجا کے لئے تکلیف اٹھاتا

ہے اور روپے برباد کرتا ہے؟ یوں ہی تجربہ کر کے دیکھ لو، اور آزماؤ کہ اس کا اثر کیا ہوتا ہے، جاؤ! اور گنواروں کو خدا کے راستے کی طرف بلاؤ کہ ان کی تعداد بہت ہے۔

اسی طرح فرض کرو کہ تم کسی شہر، یا قصبے میں پہنچتے ہو، سامنے سے ایک مشرک تاجر گذرتا ہے تم اسے خبر دو کہ فلاں گاؤں میں گئے ہوں بہت سے بک رہے ہیں۔ سیٹھ جی! اگر آج تم نے گاڑی وہاں بھیج دی، تو دو گنے کا فائدہ وہاں رہی گا۔ وہ تم سے پوچھے گا کہ تم کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ جواب میں کہو کہ سیٹھ جی! میں نے نہ آنکھ سے اس گاؤں کو دیکھا، نہ میں نے اس خبر کو کسی سے سنا، نہ اور کسی ذریعے سے مجھے علم ہوا، حتیٰ کہ عقل سے بھی نہیں، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہاں اس سال سیرابی ٹھیک طور پر ہوئی تھی، یا نہیں؟ پس یوں ہی کہتا ہوں۔ اندازہ کر سکتے ہو کہ وہ سیٹھ جو اپنے ایک منٹ کی قدر کرتا ہے، تمہاری اس احمقانہ گفتگو سے کیا طیش میں نہیں آئے گا؟ وہ تم کو گالیاں دیتا ہوا، بڑبڑاتا ہوں، اپنی دکان کی طرف چلتا بنے گا، مگر نہیں، تم اس کے ساتھ رہو، ذرا لپک کر ہاتھ تھام لو اور پوچھو کہ سیٹھ جی! آپ مجھ پر صرف اس لئے خفا ہوئے کہ میں نے ایک چیز کی شہادت دی، جس کو نہ دیکھا تھا، نہ سنا تھا، نہ عقل سے سمجھا تھا، مگر بتائیں تو سہی کہ ایشور کے ساتھ آپ جن دیوی اور دیوتاؤں کو شریک کرتے ہیں اور ان پر شہادت دیتے ہیں، اس کو اپنی آنکھ سے دیکھا، کان سے سنا، یا عقل سے اسکی ضرورت ثابت ہوئی؟ کھلانے پلانے، روزی دینے، بال بچے دینیکے لیے کیا ایک ایشور کافی نہیں؟ بتاؤ سیٹھ جی! اب میں تم پر کس درجہ غصہ کروں کہ بغیر کسی علم کے دیوی اور دیوتاؤں کی خبر دیتے ہو۔

ذرا یہ کر کے دیکھو! خود معلوم ہوگا کہ کیا ہوتا ہے۔ فہل من مد کر

بہر کیف عوام کے سیکڑوں طبقات ہیں، میں کہاں تک مثالیں دوں، مقصود اس قدر ہے کہ بغیر جانے ہوئے گواہی دینی عام فطرت انسانی کے خلاف ہے اور شرک ٹھیک اس جھوٹی شہادت کا مظہر ہے، البتہ ایران کا ”فلسفہ“ تھوڑی دیر کے لیے مقابلہ پر آمادہ ہو سکتا ہے اور آتشکدہ کا کوئی ”موید“ کہہ سکتا ہے کہ دوسرا خدا، یعنی: ہرمن کے وجود پر بھی عقلی شہادت موجود ہے، اگرچہ حسی نہیں، کیونکہ ”دنیا میں دو طرح کی چیزیں ہیں، برائی اور بھلائی دونوں کا خالق ایک نہیں ہو سکتا، پس معلوم ہوا کہ خدا دو ہے۔“

اس کا جواب خود قرآن مجید نے دیا ہے، میں اسی کو ذکر کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ قرآن مجید نے دعویٰ کیا کہ

﴿تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾

(الملك: ۱)

”برکت والی وہ ذات ہے، جس کے ہاتھ ملک ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

خدا کی تمجید ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے، شبہ یہاں کہ ہر چیز میں تو بری چیزیں، مثلاً: موت، بیماری بھی داخل ہیں، یا نہیں؟ اگر نہیں ہیں، تو خداوند تعالیٰ کی قدرت کامل نہیں، مثلاً: فرض کرو کہ ایک شعبہ گرتہ نازے سامنے خلق کا دعویٰ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ہر چیز بنا سکتا ہوں اور یہ کہہ کر اس نے ایک چٹکی خاک کی لی اور چھو کر کے ایک خوبصورت کبوتر اپنے جھولے سے نکال دیتا ہے، پھر خرگوش، پھر گلاب کے پھول وغیرہ پیدا کرتا ہے، تم اس سے کہتے ہو کہ کیا تم سانپ بھی بنا سکتے ہو، بچھو بھی پیدا کر سکتے ہو، وہ اس کا جواب اگر نفی میں دے گا، تو کیا اس کا شعبہ بہ نسبت دوسرے شعبہ گر کے جو گلاب کے پھول کے ساتھ سانپ کے پھن بھی دکھاتا ہے، ناقص نہیں؟ بلاشبہ اگر خداوند تعالیٰ صرف حیات پر قادر ہوں اور موت پر نہ ہوں، تو ان کی قدرت اسی طرح ناقص سمجھ جائی گی، قدرت تمام اسی وقت ہو سکتی ہے کہ دونوں پر قدرت ہو اور اگر یہ چیزیں تحت قدرت داخل کی جاتی ہیں، تو لازم آتا ہے کہ خدا خالق شر ہو جائے، قرآن مجید نے دوسری شق اختیار کی اور اس کے بعد فرمایا:

﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ﴾ (الملك: ۲)

”جس نے پیدا کیا موت کو اور حیات کو۔“

بس صرف لفظ ”خلق“ سے اعتراض کا جواب ہو گیا، کیونکہ ”خلق“ اور ”اتصف“ میں بہت فرق ہے، بیشک خدا موت کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتا، مگر پیدا کرتا ہے۔ خرابی شر کے ساتھ ملوث ہونے میں ہے، نہ کہ پیدا کرنے میں، خلق تو دونوں ہی کا کمال ہے، گلاب کے پھول دکھانے میں شعبہ گر کی چابک دستی اور کمال مشق کی اگر دلیل ملتی ہے، تو ہمیشہ یہی سانپ کے پیدا کرنے میں بھی ہے۔ الحاصل خلق شر و خیر دونوں کمال ہیں۔ نقص، شر کے ساتھ اتصاف میں ہے اور خدا اسکے ساتھ متصف نہیں، صرف ان دونوں کا خالق ہے، یا یوں

کہو کہ بشر کے مصدر ہونے میں خرابی ہے، نہ کہ خالق ہونے میں، مجھ سے حضرت الاستاذ جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مدرس دارالعلوم دیوبند نے ایک دفعہ فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے ”صدر“ اور ”خلق“ کے تفرقے کو ان لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿إِنْ تَصِبْهُمْ حَسَنَةً يَقُولُوا هَذِهِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَإِنْ تَصِبْهُمْ سَيِّئَةً يَقُولُوا هَذِهِ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ فَمَا لَهُمْ لَهْزُلًا الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا﴾

(النساء: ۷۸)

”اگر ان کو کوئی اچھائی پہنچتی ہے، تو کہتے ہیں یہ خدا کی جانب سے ہے اور اگر کوئی برائی پہنچتی ہے، تو کہتے ہیں تیری جانب سے ہے۔ کہو کہ سب کچھ خدا کی جانب سے ہے۔ اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ بات سمجھنے کے گرد بھی نہیں پھٹکتے۔“

اس آیت میں تو خداوند تعالیٰ نے حسنت (اچھائیاں) اور سیئات (برائیوں) کے خلق کو اپنی طرف منسوب فرمایا اور خلاف مرغوبات کفار تعلیم دی۔

﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾

”سب خدا کی جانب سے ہے۔“

اور پھر ارشاد کیا کہ خلق شر و خیر میں کوئی برائی نہیں، بلکہ عین کمال، بلکہ اس کے خلاف ہونا نقص ہے۔ ارشاد ہے:

﴿فَمَا لَهُمْ لَهْزُلًا الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا﴾

”آخر اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ بات سمجھنے کے گرد نہیں پھٹکتے۔“

البتہ اگر نقص ہے، تو شر کا مصدر ہونا ہے اور مصدر شر کا انسان ہی ہے، جیسا کہ اسی کے

بعد فرمایا:

﴿مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ

(النساء: ۷۹)

﴿فَمِنْ نَفْسِكَ﴾

”اچھی بات جو تجھے پہنچتی ہے، تو خدا سے ہے اور جو بری بات پہنچتی ہے، تو

وہ تیرے نفس سے۔“

کیونکہ پہلی آیت میں لفظ ”من“ ”عند“ پر داخل ہے اور ”عند“ لفظ اللہ پر، اس سے مقصود یہی ہے کہ خداوند تعالیٰ کی صفتِ خلق سے دونوں چیزیں موجود ہوئیں اور دوسری آیت میں نفس ذات پر ”من“ داخل کیا۔

﴿مَا أَصَابَكُ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ﴾

”جو اچھائیاں پہنچتی ہیں، وہ خدا سے ہیں۔“

یعنی: نفس ذات البیہ مصدرِ خیر ہے، یعنی: خداوند تعالیٰ کی ذات خیر و حسنات کی مصدر ہے۔ شرکی مصادر مخلوقات کی ذاتیں ہیں، کما قال عز من قائل:

”فمن نفسک“ ”تیری طرف سے ہیں۔“

یعنی: نفس ذات امکانی مصادرِ سینات ہیں کہ وہی مدخول لفظ ”من“ ہیں۔

اور خالق و مصدر میں جو فرق ہے، وہ ظاہر ہے۔ آفتاب روشنی کا مصدر ہے، خالق نہیں، شعبہ گرسعبدہ کی چیزوں، مثلاً: روپیہ، کبوتر، سانپ کا خالق (مجازاً) ہے، مصدر نہیں، پس یہی حال وہاں بھی ہے۔ آتش کدوں کے موہدوں سے جو کچھ غلطی ہوئی ہے، وہ صرف مصدر و خالق کے باہمی فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔

بہر کیف شریک واجب کے اثبات کی انتہائی دلیل جو کچھ بھی تھی، وہ صرف یہی ہے، قرآن مجید نے جبکہ اس کا جواب دے دیا ہے، تو بتاؤ کہ تمام عالم کو مخاطب کرتے ہوئے، جس میں ایک معمولی گنوار سے لے کر کیا نیوں اور ساسانیوں کے دربار کے فیلسوف بھی شریک ہیں، اگر قرآن مجید کے سوال:

﴿أَأَنْتُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ آلِهَةً أُخْرَى﴾ (الانعام: ۱۹)

”کیا تم گواہی دے سکتے ہو کہ خدا کے ساتھ اور دوسرا معبود بھی ہے؟“

کا جواب پوچھیں تو بتاؤ کہ شہادت کی کسی میں جرات ہو سکتی ہے؟

ارسطو بھی تمہارے سامنے آیا اور اپنے ژولیدہ و پریچ بیانات میں ”توحید“ کو مدلل

۱:..... یعنی عند سے اشارہ ہے کہ ذات کو ان سے لگاؤ نہیں بلکہ خدا کی صفتِ خلق جو اس کی ذات کے نزدیک ہے اس

کرتے ہوئے رخصت ہوا، اکسائی فون بھی اپنی تمام دماغی نتائج و ثمرات کے ساتھ ظاہر ہوا اور اس مسئلہ کے متعلق اسے جو کچھ بھی کہنا تھا اسے بھی تم سن چکے، ان دونوں کے کلام کی توضیح و شرح میں جن جدید کاوشوں سے مجھے کام لینا پڑا، اسے بھی تم نے دیکھا، اخیر میں ان سب کے بعد تم نے ”کتاب کامل، صحف قیمہ“ کے ان چند سلیس اور صاف نکھرے ہوئے بیان کو بھی پڑھا، جس نے مشرکین کی زبانوں پر ہمیشہ کے لئے تالے ڈال دیئے۔

انصاف شرط ہے، بتاؤ کہ مباحثہ کی اصلی راز سے حقیقی نقاب کشائی کا کام سہولت کے ساتھ کس نے انجام دیا؟ یہ سب حکماء تھے، فلسفہ دانی کے مدعی تھے، لیکن بشری نقصانات کا کیا علاج ہے کہ ابتداءً بحث میں جس چیز کو طے کر لینا چاہئے تھا، اس کی طرف کسی کو توجہ نہیں ہوئی، حالانکہ بحث و تحقیق میں سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہی ہوتی ہے کہ فریقین میں کون مدعی اور کون منکر ہے، کس کے لیے دلیل کی ضرورت ہے اور کون صرف انکار پر قناعت کر سکتا ہے۔

قرآن تھا جس نے بتایا کہ موحد و مشرک میں دعوے کے منصب پر مشرک ہے، موحد دوسرے خدا کا انکار کرتا ہے اور مشرک اسے ثابت کرنا چاہتا ہے، اس لیے بارِ ثبوت مشرک کے سر ہے کہ عقل و قانون، فطرت و آئین کا نہ ٹوٹنے والا قطعی فیصلہ ہے کہ ”دلیل مدعی لائے، منکر کے لیے صرف اس کا انکار کافی ہے۔“

اسی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن نے جو چیلنج دیا، تم نے دیکھا کہ شرک کی آبادیوں پر اس کے بعد کیسی ویرانی چھائی، مشرکوں کے دل و دماغ پر یاس و ناکامی کے جتنے دھاوے اس کے بعد ہوئے، ان کے دل سے پوچھ سکتے ہو۔

قرآنی توحید پر دوسری نظر

اگر توحید کی بحث میں قرآن صرف اسی انکارِ مستحکم پر قائم رہتا، تو اس کے لیے کافی تھا، مشرک جب تک دلیل نہیں بیان کرتا ہے (اور کبھی نہیں بیان کر سکتا) اس وقت تک قرآن کو ایک لفظ کے اضافہ کی ضرورت نہیں، لیکن نہیں، اس کا منزل تعالیٰ مجدہ رؤف و رحمن ہے، وہ دماغوں کو صرف بوکھلا دینا نہیں چاہتا، بلکہ صراطِ مستقیم پر لگانا چاہتا ہے، ان کو دارالاسلام کی

طرف کھینچنا چاہتا ہے، اسی نے اس نے مختلف مقامات میں جب مشرکوں کو ہر طرح سے تھکا لیا، ان سے منوالیا کہ وہ اپنے دعویٰ میں دلیل کی جانب محض نادار مفلس ہیں، تو اس کے بعد اب استدلال کے رخ کو پلٹتا ہے اور ایک جدید طرز اختیار کرتا ہے، جس سے مشرک صرف ساکت ہی نہیں، بلکہ ”توحید“ پر مطمئن اور ہمیشہ کے لیے معتمد ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿أَرَبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾

(یوسف: ۳۹)

”کیا متفرق و متعدد خدا کا ہونا بہتر ہے، یا ایک خدا کا جو (عالم کی ہر چیز پر) قہار (وغالب) ہے؟“

غور کرنے والے کے لیے تشفی و تسکین کے جتنے پیغام نشاط اس سوال کے جواب میں مستور ہیں، حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی کسی دلیل میں تم نہیں پاسکتے ہو اور پاؤ گے بھی، تو وہ بھی قرآن ہی کا کوئی برہان ہوگا۔

زندگی نے وفا کی، تو انشاء اللہ وہ بھی آتا ہے۔ بہر کیف پہلے اسے تو سمجھ لو، بات تو کھلی ہوئی ہے، لیکن سمجھانے کے لیے چند ضروری امور کو بطور تمہید کے میں مقدم کرتا ہوں:

(۱)..... فطری طور پر انسان میں کچھ قوتیں ہیں، جن کے آثار و اعمال پر وہ ہر طرح اطمینان و بھروسہ کرتا ہے، مثلاً: اس میں بینائی کی قوت ہے، جس چیز کا علم اس کے ذریعہ سے اس میں آتا ہے، اس پر وہ یقین کرتا ہے، جب تک اس کے خلاف میں کوئی قوی اور نہایت زبردست دلیل نہیں قائم ہو جاتی ہے، اس کی کبھی تغلیط نہیں کرتا۔

(۲)..... انسان کی فطری قوتوں میں سے ایک قوت یہ بھی ہے کہ جب اس کے سامنے دو ایسی چیزیں پیش ہوں، جن میں ایک اچھی اور ایک بری ہو، تو وہ اچھی چیز کے اختیار کرنے

..... تعلیم اور صرف تعلیم، بلکہ ہر کام کا یہ اصولی طریقہ ہے کہ ناسد چیزوں کو برباد کر کے پھر اچھی چیزوں کی بنیاد قائم کی جاتی ہے۔ ایک خراب مکان کی جگہ خوبصورت مکان اس وقت تعمیر ہو سکتا ہے، جبکہ پہلے مکان کو ڈھا دیا جائے۔ اسی طرح قرآن نے پہلے شرک کی دیواروں کو ڈھا دیا، اس کے بعد نہایت بہل الوصول طریقے سے اب توحید کی بنیاد جماتا ہے۔

..... یہ جملہ اس لئے پڑھا گیا کہ جو اس کے معلومات کبھی دلیل کے بعد غلط ثابت ہو جاتے ہیں، مثلاً: یورپ کہتا ہے کہ اگر چہ زمین دیکھنے میں ساکن معلوم ہوتی، جب دلیل سے متحرک ہوتی ہے، تو اپنے دیکھنے کو غلط سمجھنا چاہئے۔ ۱۲ عنہ

پر اپنے کو مجبور پاتا ہے، مثلاً: فرض کرو! کہ تمہارے سامنے دو گلاس رکھے جاتے ہیں، جن میں سے ایک تو قند و گلاب سے لبریز ہے اور دوسرا یا تو زہر ہلاہل سے مملو ہے، یا نہیں تو کم از کم اس میں زہر کے ملنے کا تم کو شبہ ہے، اس کے بعد تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ ان میں سے جس گلاس کو چاہو، چڑھا جاؤ، ظاہر ہے کہ تمہارا ہاتھ قند و گلاب والے غیر مشکوک گلاس کی طرف اضطراباً بڑھ جائے گا۔ بتاؤ کہ کس نے تم کو اس پر مجبور کیا؟ آخر وہ کون سی قوت تھی جس نے زہر کے گلاس سے تمہارا ہاتھ روک دیا اور دوسرے گلاس کی طرف بڑھا دیا؟ دراصل یہ ایک فطری قوت ہے، جو ہر ایک انسان میں (اگر وہ ماؤف الدماغ نہیں ہے) موجود ہے کہ جب خیر و شر کا مقابلہ ہوگا، تو وہ اسے خیر کی طرف متوجہ کر دے گی۔

قرآن مجید کی اس دلیل کا مدد اسی قوت فطریہ پر ہے، اب تم اس قوت کو زندہ کر لو اور اس تلاش میں نکلو کہ عالم کرب، کردگار، خالق، پروردگار ایک ہے، یا چند، ظاہر ہے کہ اس علمی سفر میں تمہارے سامنے کل دو صورتیں پیش آ سکتی ہیں:

(۱) ایک تو یہ کہ ہر موجود، ہر ہستی کا خالق و پروردگار الگ الگ ہے، مثلاً: زید کا پیدا کرنے والا اور ہے، عمر و کا خالق اور ہے، پانی کا برسانے والا اور ہے، غلہ کا پیدا کرنے والا اور ہے، ہوا ایک خدا کے ہاتھ میں ہے، تو آگ دوسرے کے، آفتاب تیسرے کے، اہی غیر ذلک۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے اڑماہ، تا یماہ ہی صرف ایک اور ایک ہی قوت تمہارے زیر فرمان ہیں۔

شرک و توحید کے یہ دو مرقع ہیں، جس کو قرآن تمہارے سامنے پیش کر کے صرف اس قدر پوچھتا ہے کہ بتاؤ کہ ان دونوں میں کون خیر و بہتر ہے اور کون سراسر خبط و بد عقلی کا مظہر ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر پہلی صورت تسلیم کی جاتی ہے، تو جس مہربان و کریم پالنہار کی تلاش میں تم نکلے تھے، وہ ملتا نہیں، بلکہ کھویا جاتا ہے۔ آخر جب زید کا کرب اور ہوا اور تمہارا رب اور ہوا، تو تم اپنے خدا کو اب کہاں پا سکتے ہو اور کس طرح پا سکتے ہو؟ خدا حواس سے تو محسوس نہیں ہوتا، البتہ عقل اس کی ضرورت ثابت کرتی ہے کہ ہمارے لئے ایک پیدا کرنے والا بننا

چاہئے، لیکن وہ یہ کس طرح بتا سکتی ہے کہ ان ستر ہزار معبودوں میں تمہارا خدا کون ہے کہ اس کی تعین اس کے اختیار میں نہیں، پھر اندازہ کرو کہ اس صورت میں تم نے اپنے مالک کو (جس کی جستجو تمہیں صرف اس لئے تھی کہ اس کے آگے اپنی حاجتیں پیش کروں گا، روؤں گا، اس سے اپنی دنیا و آخرت کی بھلائی طلب کروں گا) اسے تم نے اس جھیلے میں پایا، یا گم کیا اور صرف یہی نہیں، بلکہ اگر تک آ کر تم نے خواہ مخواہ بلا کسی دلیل کے (جیسا کہ مشرکین کرتے ہیں) کسی ایک معبود سے لو لگائی اور فرض کرو کہ وہ تمہارا مالک نہ ہو، تو اس وقت تمہارے اصلی معبود پروردگار کے دریاے غیظ و غضب کبھی تھم سکتے ہیں؟ پھر کیسا اس وقت ’صلانہ شد، بلا شد‘ کے مصداق بننے کے لیے تمہیں تیار نہیں ہونا چاہئے۔

بخلاف اس کے کہ اگر تم تمام عالم کو ایک ہی قوت قاہرہ یزدانیہ کے ماتحت کر لو اور سمجھو کہ تمام عالم کا رب، پروردگار ایک ہی ہے، تو اس وقت ان تمام دقتوں کی کیا کبھی نوبت آ سکتی ہے، کسی خطرہ کی گنجائش بھی باقی رہتی ہے؟ اور جبکہ نہیں رہتی، تو اب دوسری صورت کے خیر و بہتر ہونے میں کیا شر ہے؟ صرف اس پر غور کرو، یا اس طرح مثلاً تمہارے سامنے دو قوتیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) ایک تو ایسی جس سے تم اپنے تمام مقاصد کو حاصل کر سکتے ہو، اگر اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے، تو نہ صرف دنیا، بلکہ عقبی کا بھی ہر معاملہ آسانی سلجھ سکتا ہے۔ الغرض ذرہ سے لے کر آفتاب تک پر اس کے ذریعے سے حکومت کر سکتے ہو اور اگر زیادہ سنجیدگی سے تم نے کام لیا، تو تمام کائنات پر متصرف ہو سکتے ہو۔

(۲) دوسری قوت، ایسی ہے جس سے بجز معدودے چند چیزوں کے اور کوئی کام نہیں نکل سکتا۔ کیا اس میں سے پہلی صورت خیر نہیں؟ اور جبکہ ہے، تو کیا یہ نسبت متفرق معبودوں اور خدائے واحد قہار کے درمیان نہیں؟ آخر متفرق معبود جبکہ بجز اپنی زیر اثر مخلوقات اور کسی دوسرے پر متصرف نہیں کر سکتے، تو پھر ان کے پوجنے والوں کو ان موجودات کے علاوہ اور کس پر قدرت ہوتی ہے، بخلاف خدائے واحد قہار کے۔ جب تمام نظام عالم اسی کے زیر نگیں ہیں، تو اس کو راضی کر لینے کے بعد ہو سکتا ہے اور ہوا کہ تم چاند کے ٹکڑے اڑا سکتے ہو، آفتاب کو تقویم بکتے ہو، ہوا کو روک سکتے ہو، وغیرہ ذالک۔

پس یہی قرآن کا بھی مطلب ہے کہ شرک و توحید کے دعوؤں کو سامنے رکھنے کے بعد توحید کے علاوہ اور کوئی چیز خیر نہیں ہو سکتی اور اس کے خیر ثابت ہو جانے کے بعد اس کا یقینی ہونا قطعی ہو جاتا ہے، علی الخصوص جبکہ خلاف میں کوئی دلیل بھی نہیں اور اگر اس کے بعد بھی شبہ رہتا ہے، حالانکہ وہ ایک فطری قوت کے آثارِ طبعی میں سے ہے، تو پھر یہی شبہ بینائی اور شنوائی کے معلومات پر کیوں نہیں ہوگا؟ حالانکہ (جب تک ان کے خلاف پر دلیل نہیں قائم ہو جاتی) ان کے آثار پر تمام دنیا نے یقین و جزم کا اطلاق کیا ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ توحید کے عقیدہ پر جو اسی طرح ایک جبلی قوت کے ثمرات میں سے ہے، یقین و ادغان کا اطلاق نہ کیا جائے۔

یہ تو اس آیت کی ایک معمولی توضیح تھی، اب اس کی تعیم کو بھی دیکھ لو:

توحید کا عقیدہ جب خیر و بہتر ٹھہرا اور شرک ایک خراب اور بری چیز قرار پائی، تو پھر کون ہے جو اس پر ایمان لانے سے جھپک سکتا ہے کہ دلیل تو جس احساسِ جبلی پر مبنی ہے، اس سے دنیا کا کوئی سلیم الفطرت انسان خالی نہیں۔

ایک دیہاتی تیل خریدنے کے لیے بازار آتا ہے، اس کے سامنے دو میل آتے ہیں، ایک مضبوط و خوبصورت ہے، اور دوسرا لاغر و بدبیت ہے، ایک چست و چالاک ہے، دوسرا ست و مریل ہے اور فرض کرو اگر قیمت میں پہلا اگر کم نہیں، تو مساوی ہے، ایسی صورت میں وہی جذبہ کیا دہقان میں تموج پرواز نہ ہوگا اور بجلت تمام روپیہ نکالنے پر اسے مجبور نہ کرے گا؟ اور جب کہ دنیا کے ایسے معمولی واقعہ میں اس قوت کی بھی کار فرمائی ہے، تو ایسے مقام میں جہاں پر دین و دنیا کی صلاح و فلاح کی تلاش ہے، اس کی وہی قوت غیر کے اختیار کرنے پر کیوں نہیں مجبور کرے گی؟ اور وہ توحید کے علاوہ اور کیا چیز ہو سکتی ہے....؟

اسی طرح ایک تاج کسی شہر میں دوکان کرایہ پر لیلے کے لیے آتا ہے، اس کے سامنے بھی دو دوکانیں پیش ہوتی ہیں، ایک عام شاہراہ پر واقع ہے اور دوسری کسی کوچہ کے تاریک گوشہ میں ہے، ایک خوبصورت فراخ ہے، دوسری سیاہ اور تنگ ہے اور فرض کر لو کہ کرایہ میں دونوں مساوی ہیں، تو ایسی صورت میں تاج لگایا کریگا؟ کیا خیر کو شہر پر بلا کسی وجہ کے ترجیح دے سکتا ہے اور جبکہ یہاں نہیں دے سکتا، تو شرک و توحید کے ہمتہ میں اس کا یہ احساس کیوں

باطل ہو جائے گا؟

ازیں قبل دنیا کے ہر طبقہ میں اسی اصول پر عمل درآمد جاری ہے، انسان جو کچھ کرتا ہے، اسی احساس کی رہنمائی میں کرتا ہے۔ جو کچھ غلطی ہوتی ہے، وہ خیر و شر کے سمجھنے میں ہوتی ہے اور جبکہ واضح طور پر توحید کی بہتری شرک کے مقابلے میں ثابت ہو چکی، تو اب دنیا کا کوئی فیلسوف بھی اس کا منکر نہیں ہو سکتا کہ وہ بھی صرف اسی لئے حقائق پر نئے سرے سے غور کرتا ہے کہ غلط مسائل میں سے صحیح کو چھانٹ لے، اس کے سامنے بھی جب دو باتیں جن میں ایک غلط اور لغو ہوتی ہے اور دوسری صحیح اور با وقعت ہوتی ہے، پیش کی جاتی ہے، تو وہ صحیح کے اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور غلط کو رد کر دیتا ہے، پھر جبکہ شرک و توحید میں بھی نسبت ہے، تو ”توحید“ کے تسلیم پر اس کی طبیعت کیوں مجبور نہیں ہوگی!... علاوہ اس کے آیت میں ”قہار“ کے لفظ سے دراصل اس دلیل کی طرف بھی اشارہ ہے، جسے میں نے اسکا نیوفون کے خیالات کے تحت میں شرح کے طور پر درج کر دیا ہے۔ بخوفِ طوالت میں صرف اسی پر اکتفا کرتا ہوں، فلسفی کے لیے اس میں بہت کچھ ہے۔

توحید کے خیر و بہتر ہونے کی جو آسان و سہل وجوہات تھیں، وہ گذر چکیں، جس کے اندر انشاء اللہ کلام و گفتگو کی کسی طرح گنجائش نہیں اور اگر ہے، تو اسے ظاہر کرنا چاہیے۔ کافی سمجھ کر میں مضمون ختم کر چکا تھا کہ یکا یک خیال ہوا کہ اگر چند باب کے ماننے والے یہ کہیں کہ ہم ہر ایک معبود کو پوجیں گے، کیونکہ انسان اپنے کھانے پینے، رہنے سہنے، دواء وغیرہ وغیرہ میں ہر ایک موجود کا محتاج ہے اور جب ان کا محتاج ہوا، تو پھر ان کے خالقوں کا تو بدرجہ اولیٰ ہوا، اس لیے سب کو ماننا چاہئے اور اس صورت میں جو گم گشتگی لازم آئی تھی، وہ رفع ہو گئی۔ اس شبہ کا ذہن میں گذرنا تھا کہ میں نے پھر آیات قرآنیہ پر نظر کی، فوراً معلوم ہوا کہ خداوند قدیر جل مجدہ نے اس کا بھی ازالہ فرما دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ
وَرَجُلًا سَلَمًا لَرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ
أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾

(الزمر: ۲۹)

”اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک آدمی (غلام) ہے، جو مختلف

شرکاء میں مشترک ہے اور دوسرا غلام ایسا ہے کہ صرف ایک آدمی کے سپرد ہے، کیا دونوں (بہتری و خیریت) میں برابر ہو سکتے ہیں؟ سب تعریفیں خدا کے لیے ہیں، لیکن (توحید و شرک کے حسن و قبح) کو بہت کم لوگ جانتے ہیں (ورنہ اگر چاہتے، تو توحید کے ماننے پر اپنے کو مجبور پاتے)۔“

یعنی: اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ تمام ”ارباب متفرقوں“ کی عبادت کی جائے، اس کے بعد بھی مقابلہ کر کے دیکھ لو اور اندازہ کرو کہ شرک بہتر رہتا ہے، یا توحید؟ کیونکہ اس وقت بھی وہی دو صورتیں پیش ہوتی ہیں۔

(۱) ایک شخص ہے جو صرف ایک ہی شخص کا غلام ہے اور اسے صرف اسی کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔

(۲) دوسرا شخص ہے جو بہت سے آقاؤں میں مشترک ہے، ان میں ہر آقا اس سے خدمت کا طلبگار ہے۔

بتاؤ کہ اس میں خیر و بہتر کون ہے، امن و اطمینان کس کے لیے ہے؟ ظاہر ہے کہ ایک شخص ایک کام تو انجام دے کر بخوشی زندگی بسر کر سکتا ہے، بخلاف اس کے جس کے سیکڑوں آقا ہیں، کیونکہ کل دو صورتیں ہیں، یا تو وہ سب کا کام کرے، تو اس کا انجام بجز ہلاکت و بربادی کے اور کیا ہے....؟ پھر احتمال باقی ہے کہ پورا ہو، یا نہ ہو اور اگر ایک کا کرتا ہے، تو اور سب آقا اس سے خفا ہو کر اس کے درپے آزاد ہو جائیں گے، پس ہر حال میں پہلا دوسرے سے خیر و بہتر ہے۔ علاوہ اس کے فرض کرو کہ ایسے غلام مشترک کو اگر کبھی کوئی ضرورت پیش آئی، تو بوجہ شرکت کے ہر ایک دوسرے پر نالے گا اور دو ماموں کے بھانجے بھوکے رہ جاتے ہیں، وہ مثل پوری صادق آئے گی۔

پس یہی نسبت ان دونوں میں بھی ہوگی، جن میں سے ایک صرف ایک خدا کو مانتا ہے اور اسی کی عبادت کرتا ہے اور دوسرا متفرق معبودوں کو بلا کسی دلیل کے مانتا ہے اور سب کو پوجنا چاہتا ہے، اس لیے کہ کم از کم اگر کچھ بھی نہیں، تو اس مشرک ان گنت معبود والے انسانوں کی ذمہ داریاں موحد کی ذمہ داریوں سے بہت زیادہ مشکل ہوں گی اور ظاہر ہے سہل و مشکل کاموں میں جب مقابلہ ہو جاتا ہے اور مشکل کے اختیار کرنے کی کوئی وجہ بھی

نہیں ہوتی، تو اس وقت سہل کام سے بہترین چیز اور کچھ نہیں ہوتی۔

پس جب مشرک کے اختیار کرنے میں انسان بہت سی صعوبتوں کا نشانہ بن جاتا ہے اور اس کے اختیار کرنے کی کوئی دلیل بھی نہیں، تو اس صورت میں تو حید سے بہترین چیز اور کیا ہو سکتی ہے.....!

اور یہی مقصد تھا کہ تو حید ہر حال میں شرک سے بہتر ہے اور جو چیز بہتر ہے اس کے ماننے پر انسان کی فطرت مجبور ہے، پس تو حید کے ماننے پر انسان کی فطرت مجبور ہے۔ ہذا والسلام علی من اتبع الهدی (باقی آئندہ)

ذائبہ

اپنی بے بضاعتی کا مجھے ہر طرح اعتراف ہے اور اس لیے بہت ممکن ہے کہ میں نے کلام پاک کی صحیح ترجمانی نہ کی ہو، مگر مقصود صرف اس قدر ہے کہ ارباب علم و فطانت کا شکر! قرآن کی دلیلوں پر غور کرتے اور قاضی و ملاحسن کے مزخرف دلائل میں غرق ہونے کے بجائے قرآنی حجتوں میں ڈوب جاتے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے ہیں، تو باایں ہمہ کم مانگی میں بھی میں نے تو بھی ارادہ کر لیا ہے کہ:

جز صراحی و کتابم نبود یار دندیم

تا حریفان و فارابہ جہاں کم بنیم

(ماہنامہ القاسم، دارالعلوم دیوبند)

قرآن کے طرز استدلال پر ایک سرسری نظر

شیوہ حورو پری، خوب و لطیف است ولے

خوبی آنت و لطف کہ فلا لے دارد

استدلال و احتجاج، قرآن مجید کی پہلی ایجاد نہیں، دعویٰ کو زنجیر دلیل و برہان میں جکڑنا، انسان کی فطری عادتوں میں سے ہے اور یہی فطرت دراصل سنگ بنیاد ہے، ان تمام فلسفی ایوانوں اور خطابي مجلسوں کی، جسے ارسطو و افلاطن، ڈیکارٹ، میلر انس، برکلی، ابن رشد، ابن سینا، شیلانگ، ہیگل کے دماغی ہاتھوں نے تیار کئے۔

قیاس و حجت کی ابتداء معمولی دماغوں سے ہوئی اور بالآخر وہ دنیا کے چیدہ فطانتوں، فیلاسوفی ذکاوتوں کے لیے آماجگاہ بن گئی، اول الذکر طائفہ دوسرے گروہ سے مقصد میں متحد ہے، لیکن ضعف و استحکام کے مراتب و مدارج کے تفرقوں سے پھلا عامیانه استدلال کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا فلسفہ و حکمت کے پرشکوہ لفظوں کا مصداق قرار دیا گیا۔

عجیب بات ہے کہ وہی عامی استدلال، جب فلسفی قالب میں ڈھل جاتا ہے، تو عام ذہنوں کے حق میں، جن کی تعداد بہ نسبت خواص کے بہت ہی زیادہ ہے۔ پریشہ سے بھی زیادہ کم رتبہ ثابت ہوا ہے، واقع میں گو وہ کتنا ہی پر زور ہو، لیکن اس کا علاج کیا ہے کہ عام سمجھ اس کے ادراک سے عاجز حتیٰ کہ سننے سے بھی بیزار ہے۔

آخر تم ایک ایسے دیہاتی کو جو تمدن و تہذیب، تفلسف و تمسطق کی آبادیوں سے دور کسی جھونپڑی میں بستا ہے، کیونکر افلاطن کے ان لفظوں کو سمجھا سکتے ہو کہ ”تمام عالم ممکن ہے اور جو ممکن ہے، وہ بغیر علت کے، لباس وجود حاصل نہیں کر سکتا اور جس طرح یہ ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی بدیہی ہے کہ ہر مابا بغیر کی کسی مابالذات پر انتہا ہو اور دونوں مقدموں کے تسلیم کے بعد یہ یقینی نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ نظام امکانی کا پیدا کرنے والا کوئی مابالذات وجود ہے، جسے ہم خدا کہتے ہیں۔“

یا ارسطو کے اس قول کا مقصد اس معمار کے سینے میں جس کی عمر بجز تعمیر، ترمیم کے اور کسی چیز میں صرف نہیں ہوئی، کس طرح اتارا جاسکتا ہے کہ ”جو زید آج پیدا ہوا ہے، اس سے پہلے جس قدر بھی علل گذرے ہیں، لامحالہ انہیں کسی وجود پر منتہی ہونا چاہئے، ورنہ دور لازم آئی گا، یا تسلسل، اور دونوں کے دونوں محال ہیں، پس وہ وجود جو منہائے علل ہے، اسی کو فلسفہ کی زبان میں علتہ العلیل (کازاف دی کاز) اور واجب کہتے ہیں اور عام لوگ خدا کے نام سے پکارتے ہیں۔“

ہم ہوں، یا تم، کوئی بھی ہو، ابطال لاتنا ہی، تکذیب دور کے دلائل و براہین کی تصویر اس بیچارے کے لوح ذہن پر کس طرح کھینچ سکتے ہیں، جب تک کہ اسے کسی یونانی فلسفہ کے مدرسے میں آٹھ نو برس رہ کر تحصیل حکمت کا موقع نہ دیا جائے، یا مثلاً اس افرنجی فیلسوف پروفیسر فلنٹ کے اس بے معنی کلام کو کس طرح عام لوگوں کے لئے قریب الفہم بنایا جاسکتا ہے کہ ”جو چیزیں ذہن میں آتی ہیں، وہ موجود ہے، اور چونکہ ہستی واجب کا تصور ہم کرتے ہیں، پس وہ موجود ہوئی، اس لئے کہ معدوم کا تصور محال ہے۔“

تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اسپنوزا کی اس تفصیل کو ایک سا ہوکار، سینٹھ کس طرح ذہن نشین کر سکتا ہے کہ ”ہم جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں، تو اس سے پہلے ہم کچھ عوارض و حالات کا انتزاع کرتے ہیں اور دوسری چیز اس میں قائم بالذات نظر آتی ہے، جس پر ان عوارض و لوازم کا پردہ پڑا ہوا ہے اور وہی ان اعراض کی حامل ہے، پس وہ شے جو ان چیزوں کی حامل ہے اور اس کے اندر مستور ہے، وہ خدا ہے اور یہ تمام اشیاء جسے تم رنگ، مزہ، آواز، سختی، نرمی، روح، مادہ، فکر، سوچ وغیرہ کے لفظوں میں تعبیر کرتے ہو، اسی وجود باطن کے مظاہر ہیں۔“

”وہ وجود جسے میں خدا کہتا ہوں، باوجود اس قدر پھیلاؤ کے غیر منقسم ہے، یعنی: غیر محدود ہونے کے ساتھ، وہ ناقابل انقسام بھی ہے، کیونکہ اگر وہ محدود ہو، تو اس کے احاطہ وجود کے بعد اور کوئی وجود بھی ہوگا، جس کے بعد پھر وحدت نہیں رہتی اور اگر منقسم ہوگا، تو پھر اس کے اجزاء باہم الگ الگ ہوں گے، جس سے پھر وحدت مجرد ہو جاتی ہے۔“

الغرض خواہ تم شفاء و اشارات کی ورق گردانی کرو، طوسی اور روانی کے کلمات میں تلاش کرو، باقر داماد کے مدعیانہ لٹریچر میں ٹولو، کیسبل فریریز ہیرس، مارٹینو کی تالقات میں غرق ہو

کراہت واجب کے دلائل مہیا کرو، سب کا خلاصہ صرف اس قدر ہوگا کہ کبھی تو سرے سے وہ الفاظ رہیں منت معنی نہ ہوں گے اور اگر اتفاق سے ہوئے بھی، تو صرف محدودے چند دماغوں کے لیے، جن کی ساری زندگی دشت فلسفہ کے سیر و سیاحت میں بسر ہوئی ہو۔ اور جس طرح ان حکمی براہین میں عام طبائع کے لیے شائبہ تسلی و اطمینان نہیں، بجنہ یہی حال ان عامیانہ دلیلوں کا ہے، جسے اکثر تم نے واعظوں، خطیبوں کی زبانی سنا ہوگا، مثلاً: عرب کے ایک بدو نے خدا کے ثبوت میں صرف اس قدر کہنا کافی قرار دیا کہ ”میگنی جو راستے پر پڑی ہوتی ہے، بتاتی ہے کہ ادھر سے کوئی اونٹ گذرا ہے، نقش قدم یقین دلاتے ہیں کہ ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے اور ہم اس کے ماننے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان آسمانوں، زمینوں، سمندروں کو دیکھ کر ہم ایک ”فاطر لایزال، صاحب ارادہ“ کے آگے سر بسجود ہو کر نہ گر پڑیں۔

بلاشبہ یہ استدلال جس قدر سادہ اور عام فہم ہے، اسی قدر نازک اور لطیف ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ ایک فیلسوف اسے سن کر متبسمانہ انداز کے ساتھ سطاحت و کوثر نظری کے عیوب سے داغدار بنا دیتا ہے، وہ ہنس کر کہتا ہے کہ اس استدلال میں سب سے پہلے غلطی یہ ہوئی ہے کہ نفس علم بعرہ (میگنی کے علم) کو تم نے اونٹ کے علم کا سبب قرار دیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے چونکہ تم میگنی کو اونٹ سے خارج ہوتے ہوئے دیکھ چکے تھے اور اس مشاہدے نے تمہارے اندر یہ مقدمہ جمادیا تھا کہ میگنی اونٹ سے ہی نکلتی ہے، اسی لئے اب جبکہ تم نے صرف میگنی کو دیکھا سمجھا کہ ضرور اونٹ ادھر آیا، ورنہ اگر اس سے پہلے تمہارے پاس یہ مقدمہ نہ ہوتا، تو یقیناً تم کو شبہ ہو سکتا تھا کہ آیا یہ خود بخود موجود ہے، یا کسی دوسرے وجود کا اثر ہے اور یہی حال نقش پا کا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جہاں یہ مشاہدہ نہ ہو گا، جیسا کہ آسمان و زمین کو تم نے کسی وجود سے پیدا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا ہے، وہاں بھی اس قاعدہ کو جاری کرنا سطحی قیاس نہیں تو اور کیا ہے۔

بہر کیف مجھے اس وقت ابھی اس سے بحث نہیں کہ یہ اعتراض اس ڈاکٹر کا کس حد تک صحیح ہے، بلکہ دکھانا صرف اس قدر ہے کہ اگر مقدم الذکر فلسفی دلائل، اپنی دقت اور غایت ثرولیدگی کی وجہ سے عام دماغوں کے نزدیک مجذوب کی بڑ سے زیادہ وسیع نہ تھے، تو پھر ان

عامیانه استدلالوں کا حال بھی فلاسفوں کے نزدیک اسی کے قریب قریب ہے اور دونوں حصے میں یہ ایسا زبردست نقص ہے کہ جس کی تلافی کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں تمہیں اس کتاب کی ایک معمولی دلیل سے روشناس کرتا ہوں، جو لفظ کے اعتبار سے گرچہ بہت ہی موجز ہے، لیکن اپنے ہمہ گیر پہلوؤں کی حیثیت سے ایک کامل ذات کی کامل قوتِ استدلال کا نہایت مکمل نمونہ ہے، اور صرف اسی کے ساتھ نہیں، بلکہ اس کی کوئی دلیل بھی کسی خاص طبقے تک محدود نہیں، جس طرح وہ ایک بدو اور بقال، تاجر، مزدور، معمار، نجار وغیرہ عام لوگوں کے لیے اپنے اندر سامانِ تشفی رکھتی ہے، بعینہ وہ ایک پڑے سے بڑے مغرور فیلسوف کو بھی مہبوت بنا دیتی ہے، مثلاً: مذکورہ بالا مسئلہ کا مدعی ہو کر قرآن دلیل میں ان چند لفظوں کو پیش کرتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَى﴾ (الانعام: ۹۵)

”بیجوں اور گٹھلیوں کا پھاڑنے والا خدا ہے۔“

اس میں گویا دو چیزیں محلِ دلیل میں مذکور ہیں۔

(۱) وجودِ بیج اور گٹھلی۔ (۲) اس کا اگنے کے وقت پھٹنا۔

اب غور کرو! وہ دیہاتی بدو، جو نقشِ قدم سے راگبیر پر اور بیگنی سے اونٹ پر دلیل قائم کرتا تھا، اس کے حق میں فالق الحب والنوی (بیج اور گٹھلی کا پھٹنا) اثباتِ فاطر کے لیے کیوں کافی نہیں ہو سکتے؟ جبکہ وہ جانتا ہے کہ ایک سڑی ہوئی، بدبو بیگنی، بلا کسی بیگنی کرنے والے ممکن نہیں، تو کس طرح وہ یقین کرے گا کہ گیہوں کے ایسے عجیب تاثیر دانے، جن سے پیدا ہونے والے خونوں سے وہ دماغ وجود پذیر ہوتے ہیں، جن کی فراست و دانائی کی آوازوں سے معمورہ عالم گونجتا رہا ہے اور روزمرہ گونجتا رہتا ہے، وہی گیہوں بلا کسی خالق کے موجود ہو جائیں۔

اور اسی طرح جب وہ گرد کی سطح کو خاص شان کے ساتھ پھٹی ہوئی دیکھ کر سمجھ لیتا ہے کہ کسی نے اپنے پانوں سے بکھیرا ہے، ایسا آدمی کس طرح اپنے دل کو اس پر راضی کرے گا

..... ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ سمجھنا اس کا غلط ہے، یا صحیح؟ بلکہ کہنا یہ ہے کہ جس کی سمجھا ایسی ہے، وہ قرآن کی اس حجت کو تسلیم کرنے میں کبھی بھی پس و پیش نہیں کر سکتا۔ ۱۲۔

کہ بیج کے غلاف دانوں سے خود بخود دھٹ گئے اور کسی ارادی قوت کی اس کے چاک کرنے کے لیے ضرورت نہیں؟

اب ذرا اور اوپر چڑھو! تمہارے سامنے کسی شہر کے تاجر، ساہوکار، بننے، لوہار، بڑھی معمار وغیرہ آتے ہیں، جو بنسبت ایک دیہاتی کے متمدن اور زیادہ عقل والے کہے جاتے ہیں، اچھا تو تم اس جماعت سے کسی معمار، یا انجینئر کو اپنا مخاطب بناتے ہوئے دریافت کرو کہ آیا کسی تنگے سے مٹی کی دیوار میں سوراخ کیا جاسکتا ہے؟ کیا نیم کی خلال سے کسی چھت میں تم کوئی منفذ پیدا کر سکتے ہو؟ وہ اس کے جواب میں بجز ”نہیں“ بلکہ ناممکن کے اور کیا کہے گا؟ اس کے بعد اب اسے روئیدگی کی حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھو کہ بیج سے جو ننھی سی آنکھ برآمد ہوتی ہے، حالانکہ اس میں لوہے کی سختی نہیں، لکڑی کی کھٹنگی نہیں اور نہ فقط یہ، بلکہ اس میں اس خشک تنکے کی بھی صلابت نہیں، جو ہواؤں میں اڑے پھرتے ہیں، کچھ نہیں، پھر یہ کیا ہے کہ وہ نہ صرف نرم کھیتوں میں، بلکہ گچھ کی سخت زمینوں کو پھوڑ کر، چار چار فٹ، بلکہ بعض دفعہ، دس بارہ اور اس سے بھی زیادہ گہرائیوں سے پھاڑتے چیرتے، زمین کی پشت پر آکر نمودار ہو جاتی ہیں۔“

ہمیں بتاؤ کہ آخر وہ اس کا کیا جواب دے گا اور بجز زوانی قاہرانہ قدرتوں کے وہ اور کہاں پناہ پاسکتا ہے اور اسی طرح اب کسی غلہ کے بیوپار کرنے والے کو مخاطب بناؤ اور اس سے استفسار کرو کہ ”تم نے اپنے تجارتی اناجوں کو کونٹھوں میں کیوں بند کیا ہے؟“۔ ظاہر ہے کہ جواب میں جہاں چوروں، لٹیروں وغیرہ سے بچانے کا ذکر کرے گا، ساتھ ہی کہے گا کہ اگر ایسا نہ کریں تو اس پر مینہ برسیں گے، وہ بھیگ جائینگے، جس کے بعد غلہ سڑگل کر خراب ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ اس کام کا بھی نہیں رہتا کہ اسے جانور کھا سکیں۔

آہ! کہ اس سے تم اسی جگہ کیوں نہیں پوچھ لیتے کہ کھیتوں میں تو ان دانوں پر آئے دن لاکھوں من پانی گذر جاتا ہے، مگر وہاں بجائے سڑنے کے ہرے، بجائے بگڑنے کے شاداب ہو جاتے ہیں، بجائے بدبو ہونے کے اپنے اندر سے دل و جان کو معطر کرنے والوں پھولوں کو لے کر برآمد ہوتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ اس بننے کا دماغ اگر فلسفیوں کے شکوک و شبہات کی طلسم پروازوں

سے آزاد ہوگا، تو یقیناً اس واقعی تفرقہ کو مثبتیہ الہیہ کی طرف منسوب کرنے میں اپنے کو مجبور پائے گا اور پھر یہی نہیں تم ان جماعتوں کے ہر فرد کو ان کے مناسب امثلہ میں صرف ان دو لفظوں ”فلق الحب والنوی“ کے ذریعے سے مسئلہ واجب کو دل نشین کر سکتے ہو اور یہ کوئی مشکل نہیں، اگر تم میں تھوڑا سا بھی استدلال کا سلیقہ ہے۔ اس وقت میں بخوفِ طوالت اس سے اعراض کرتا ہوں اس منکر و جبار طائفے کی طرف اب متوجہ ہوتا ہوں، جو ان بیانات کو سن کر پیٹیم صدائے، مغالطہ، دھوکہ، فریب سے دوسروں کو گمراہ کر رہی ہے۔ میرے ہر جملہ پر ان کا مستہزائہ قہقہہ نہیں رکتا، اسے غصہ آ رہا ہے کہ ان نادان جماعتوں میں میں کس دیدہ دلیری کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔

بہتر تو اب ان عقل کے بد مستوں کو بھی بلاؤ، جو اپنی دماغی مجلسوں میں، خدا و پیغمبر، صلوات اللہ علیہم اجمعین، ملائک و قدوسیوں کی دھجیاں اڑاتے ہیں۔

موجودات کی مفصلہ بالا نیزگیوں کو ایک ناقابل اعتبار چیز ”طبیعت“ کی طرف منسوب کر کے مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے تمام گزشتہ سوالوں کے جواب میں ”نیچر“ بول کر یوں سمجھ رہے ہیں کہ ”ہم نے خدا کے تسلیم کی ضرورت اڑادی کہ جو کام خدا سے لیا جاسکتا ہے، وہ طبیعت کے ذریعے سے انجام پاسکتے ہیں“ مگر تمہیں بھی کوئی ضرورت نہیں کہ ان کی ان شغلائے، زفرات سے ڈر جاؤ، بلکہ ”فلسفہ طبیعت“ کے متعلق ان سے ایک سوال کرو، پھر دیکھو کہ کیا ہوتا ہے۔ پوچھو! کہ ”کیا طبیعت دو متضاد چیزوں کی علت بن سکتی ہے، کیا جو دو خشکی پیدا کرتی ہے، وہی ”دوا“ بغیر کسی دوسری چیز کے ملائے ہوئے ایک ہی محل، ایک ہی وقت، ایک ہی آن میں رطوبت بھی پیدا کر سکتی ہے؟ کیا آگ اگر جلاتی ہے، تو وہ ٹھنڈک بھی پہنچا سکتی ہے؟ کیا ڈھیلا، طبعی میل سے اگر اوپر جاتا ہے، تو وہ اسی میل کی وجہ سے نیچے بھی آسکتا ہے؟“۔

یقین کرو کہ وہ ان تمام سوالوں کے جواب نفی میں دینے پر مجبور ہوں گے، علاوہ اس کے کہ وہ خود اس کی تصریح کرتے ہیں، عقل کا مقتضی بھی یہی تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی چیز سے ایک ہی وقت میں ایک ہی مقام پر دو متضاد امور طبعی طور سے صادر ہوں۔ پس اب تم کسی پودے کی طرف اشارہ کرو، جو بیج سے باہر نکل کر لہلہا رہا ہے کہ اگر اس

کی شاخوں کو بیج کے اندر سے باہر پھینکنے والی طاقت طبیعت ہے، تو یقیناً وہی طبیعت اس کی شاخ کو زمین کے اندر نہیں لے جاسکتی کہ یہ دونوں متضاد فعل ہیں، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی بیج سے، ایک ہی وقت، ایک ہی ہوا، ایک ہی پانی، ایک ہی زمین میں دو شاخیں برآمد ہوتی ہیں، جن میں ایک آسمان کی طرف رخ کرتے ہوئے اوپر کی جانب چڑھتی جا رہی ہیں، جس کا نام تم نے ”پھلنگ“ اور ”ٹہنی“ رکھا ہے اور دوسری بالکل جہت مخالف (تحت الثریٰ) کی طرف منہ کئے ہوئے، زمین میں دھنستی جا رہی ہے، جسے تم ”جر“ اور ”بیج“ کہتے ہو۔

پھر کیا ”فلسفہ طبیعت“ کے مسلمہ اصول کی بناء پر اسے تم اب بھی طبیعت کی طرف منسوب کر سکتے ہو؟ مجھے یقین ہے کہ اس سوال کے بعد جو آواز میرے کان تک پہنچے گی، وہ:

فہت الذی کفر

”جس نے خدا کا انکار کیا تھا، وہ مہوت ہو کر رہ گیا۔“

کے علاوہ انشاء اللہ کچھ نہیں ہو سکتی۔

اور یہی وہ مقام ہے جہاں میرا یہ دعویٰ کہ قرآنی دلائل، اپنے پہلوؤں کے اعتبار سے، جس طرح ایک دہقانی کو تشفی بخش سکتے ہیں، بخندہ وہ ایک دنیا کے مسلم عند الکل فیلسوف کو بھی اپنے دعویٰ کے تسلیم پر مجبور کر سکتے ہیں اور یہی احاطہ کاملہ اور افادہ عامہ اس کی وہ انوکھی ادا ہے، جسے دیکھ دیکھ کر میں جھوم جاتا ہوں اور بے ساختہ خواجہ شیراز کا یہ شعر

شیوہ حورو پری خوب و لطیف است و لے

خوبی آنست و لطافت کو فلانے دارد

زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ هذا والسلام علی من اتبع الهدی

ذبابہ

زمانہ نے فرصت دی، تو کبھی کبھی انشاء اللہ اپنے ناظرین کے سامنے قرآن کے اور دوسرے دلائل پر اسی طرز سے اور بھی کچھ لکھوں گا، صرف آپ لوگوں سے اس کا نتیجہ ہوں کہ میرے لئے دعا فرمائیں کہ رب غفار میرے معاصی، ذنوب سے درگزر فرمائے اور مجھ میں

قوت پیدا کرے کہ اس کی دین کی تائید سے کبھی نہ گھبراؤں۔ (واللہ علیٰ ما یشاء قدير) ایک بندے کے لیے اس سے زیادہ اور کوئی اہم فرض نہیں کہ اپنی تمام مسرتوں کو مالک کی مرضی میں جذب کر دے۔

طالع اگر مدد کن دانش آورم بکف
گر بکشد زہے طرب، گر نہ کشد زہے شرف

وہا عبده العاصی محمد مناظر احسن (گیلانی)

غفر اللہ لہ ولمن رباہ

بحوالہ القاسم دیوبند

تدوین حدیث

احادیث نبوی (علیٰ صاحبہا الف سلام و تحیۃ) کی باقاعدہ تدوین کا کام کب اور کس نے شروع کیا؟ اس سلسلے میں کتب تاریخ اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تدوین حدیث کا باقاعدگی سے کام دولت بنو امیہ کے خلیفہ عادل حضرت عمر بن عبدالعزیز (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ) کے عہد میں ہوا۔

حدیث کے ساتھ آثار صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کو جمع کیا گیا۔

تدوین کا کام سب سے پہلے مدینہ منورہ میں محمد بن مسلم شہاب زہریؒ کے ہاتھوں میں ہوا۔

تدوین حدیث کی ابتدا کے سلسلے میں امام زہریؒ کے علاوہ امام کھولؒ، امام شععیؒ اور امام ابوبکر بن حزمؒ کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

شروع میں تدوین حدیث کی غرض صرف حفاظت احادیث تھی، لہذا ان کو کسی عنوان کے تحت نہیں، بلکہ جتنا ذخیرہ مل جاتا تھا، خواہ ان میں غلط احادیث ہی نہ ہو، جمع کر لیا جاتا تھا۔ احادیث کو مختلف فقہی ابواب میں جمع کرنے کا کام امام شافعیؒ (کوفہ) نے شروع کیا، لیکن امام شععیؒ کے اس کام کی نوعیت صرف نمونے کی تھی، کیونکہ انہوں نے صرف باب طلاق سے متعلق احادیث کو جمع کیا تھا۔

چنانچہ اس کام کو حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے پورا کیا، آپ نے احکام کے متعلق احادیث و آثار صحابہ رضی اللہ عنہم میں صحیح اور معمولی روایات کا انتخاب کیا اور ایک مستقل تصنیف مسمیٰ بہ ”کتاب الآثار“ امت کے لئے چھوڑی۔ یہ احادیث صحیحہ کی قدیم ترین کتاب ہے، جو ابواب فقہیہ پر مرتب و مدون ہے اور جس میں صرف انہی احادیث و آثار اور فتاویٰ نے جگہ پائی ہے، جن کی روایت ثقافت و اتقواء امت میں برابر چلی آتی تھی اور امام ابو حنیفہؒ کے اس معیارِ صحت پر پوری تھیں، جو باتفاق محدثین بخاری و مسلم کے معیار سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کتاب الآثار کے بعد حدیث کا دوسرا مجموعہ ”موطا“ امام مالک بن

انس ہے، جو اہل مدینہ کی روایات کا بہترین انتخاب ہے۔

مختصر یہ کہ ابھی دوسری صدی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ یہ سلسلہ تدوین عالم اسلام کے علمی مراکز میں پورے احترام و اہتمام سے شروع ہو گیا تھا۔ اس زمانے کے مشہور محدثین میں ابن جریرؒ (مکہ) ابن اسحاقؒ اور امام مالکؒ (مدینہ) ربیعہ بن صبیحؒ، حماد بن مسلمؒ، سعید بن ابی عروبہؒ (بصرہ) سفیان ثوریؒ (کوفہ) امام اوزاعیؒ (شام) ابن المبارکؒ (خراسان) وغیرہ کے نام بہت مشہور ہیں۔ تیسری صدی ہجری میں تدوین حدیث کا انداز بدل گیا، علم حدیث کو ترقی ہوئی، اب تمام ذخیرے کو یکجا کرنے کے بجائے ایک صحابی، یا شیخ کی روایات کو ایک کتاب میں جمع کر لیتے تھے، جس کو اصطلاح میں ”مسند“ کہتے تھے۔ اس دور کو ”مسند کا دور“ کہا جاتا ہے۔ مشہور مسند نویسوں میں عبید اللہ بن موسیٰ (کوفی) سدو بصری، اسد و ابن موسیٰ اور نعیم ابن حماد گزرے ہیں۔

اس عہد میں تدوین حدیث کا مقصد حفاظت حدیث تھا، صحیح اور غیر صحیح کی فکر کا وقت ابھی نہیں آیا تھا، اس لیے ہر صحابی اور شیخ کی جتنی بھی روایتیں ملتیں، ان کو صحت کی پرواہ کئے بغیر یکجا کر دیا جاتا، تاکہ فراہم شدہ احادیث میں سے کوئی تلف نہ ہو جائے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ امام بخاریؒ (۲۵۶ھ) کا دور شروع ہوا۔ انہوں نے صحیح حدیث کو غیر صحیح حدیث سے اور احادیث کو آثار سے جدا کرنے کا کام شروع کیا اور اصول تنقید اور قواعد جرح و تنقید کے مطابق روایات کی جانچ پڑتال کر کے صحیح روایات کا فیصلہ کیا اور اپنی کتاب کو مرتب کیا۔ اس کے بعد امام مسلمؒ نے ان کی تقلید کرتے ہوئے صحیح مسلم کو مرتب کیا۔ اس طرح یہ دونوں کتابیں امت میں ”صحیحین“ کے نام سے مشہور ہیں۔ بعد میں اسی سبب پر امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی، امام داؤدؒ نے سنن ابی داؤد، امام نسائیؒ نے سنن نسائی اور ابن ماجہؒ نے سنن ابن ماجہ مرتب کیں۔ ان محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں فرق مراتب کو ملحوظ رکھا، ان کتابوں کی تصنیف کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب بہ آسانی حدیث کی صحت و قوت اور اس کے درجہ و مرتبہ کا حال اس کتاب کے نام لے دینے سے بھی معلوم ہو جاتا ہے، جس میں اس کی تخریج کی گئی ہے۔

تاریخ تدوین حدیث کے اس اجمالی خاکے کے بعد ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

محدثین کے سامنے حدیث کے بارے میں صحیح قوی اور ضعیف کا سوال کیوں پیدا ہوا؟ جبکہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں ہیں، تو ان میں صحت و عدم صحت کا فرق کس راہ سے آیا؟ اس سوال کا جواب علم ”مصطلح الحدیث“ کی ضرورت اور اس کی تدوین کی تاریخ کی نشاندہی کرتا ہے۔ فی الحقیقت بغیر حدیث کے قرآن مجید کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ممکن نہیں، اس لیے حفاظت قرآن کے ساتھ ساتھ تفسیر قرآن، یعنی حدیث کی حفاظت اور حدیث کو غیر حدیث سے جدا کرنا ضروری ہے اور اس لیے حدیث کی کامل معرفت از بس ضروری ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معرفت حدیث میں ملکہ تام حاصل تھا، اس کے باوجود وہ بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم صرف متواتر و مشہور روایات کو قبول کرتے تھے، یا پھر ایسی خبر آحاد کو، جن کے راوی معتبر ہوتے تھے، خبر آحاد میں کسی روایت میں شک ہو جاتا، تو گواہ اور دلیل بھی طلب کرتے۔ یہ ساری احتیاطیں اس لیے کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تھا کہ ”جو کسی قول کو مجھ سے غلط منسوب کرے گا، اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔“

غرض یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سے علم قواعد مصطلح الحدیث کی بنیاد پڑی۔ خلفاء راشدین کے عہد میں حدیث کی چھان بین کے بہت سے واقعات ملتے ہیں، خود ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ”میراثِ جدہ“ کے مسئلے کو حل فرما کر ثبوت و صحت حدیث کے اہتمام کی بنیاد ڈالی کہ غیر معروف مسائل میں احادیث کی تحقیق کرنی چاہئے اور یہ سبق دیا کہ ثبوت حدیث میں زیادہ سے زیادہ صحت و قوت کی جستجو کرنی چاہئے اور حدیث کے رد و قبول میں لاپرواہی سے کام نہ لینا چاہئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی سنتِ صدیقی کی نہ صرف پیروی کرتے ہیں، بلکہ اپنی خاص فطرت کی وجہ سے صحت حدیث کے معاملے میں بہت اشد معلوم ہوتے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے طرز عمل نے لوگوں کو حدیثوں کے طرق میں کثرتِ رواۃ کی جستجو کا خیال پیدا کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی نے محدثین کے لئے روایت نقل کرنے میں تنقید کا طریقہ جاری کیا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا طریقہ بھی مطابق شیخین تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

نے گواہی کے طریقے میں قسم لینے کا طریقے کو رائج کیا، البتہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ صحابہ کا توقفِ ضعفِ راوی، یا احتمالِ کذب کی بناء پر قطعاً نہ تھا، بلکہ محض تثبیت اور ضبط فی الحدیث کی سنت قائم کرنے کے لیے یہ اہتمام تھا، اس لیے کہ پہلی صدی ہجری میں جو صحابہ و کبار تابعین کا دور تھا، اس میں ”حارث اعور“ اور ”مختار کذاب“ جیسے اکاذب کا شخص کو چھوڑ کر کسی ضعیف الروایۃ کا تقریباً وجود نہ تھا، لیکن جب خلیفہ ثانی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں فتنہ و فساد کا طوفان شروع ہوا، تو حدیث میں بھی دروغ گوئی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بقول ابن حجر سب سے پہلے عبداللہ بن سبآنہ حدیث میں جھوٹ بولا اور جب مسلمانوں کے باہمی نزاع کے سبب شیعہ خوارج جیسے فرقے وجود میں آئے، تو خوب حدیثیں گھڑی گئیں اور خلیفہ چہارم کی شہادت کے وقت یہ فتنہ اپنے عروج پر تھا۔ اس فتنہ سے احادیث نبوی کو محفوظ کرنے کے لیے محدثین ہمہ تن احادیث کی چھان بین میں مصروف ہو گئے اور اپنے حسن ذوق سے نقد حدیث کے اصول اختیار کئے گئے، گرچہ یہ اصول مدون نہیں ہوئے تھے، مگر اپنے معیار کے اعتبار سے ان کو برتتے تھے اور اس فتنے سے نمٹنے کے لیے اسناد کی پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ فتنوں سے پہلے اسناد کی کوئی اہمیت نہ تھی، بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی کبھی اسناد پیش کرتے تھے اور کبھی نہیں، بس التزام نہیں کرتے تھے، لیکن فتنوں کے بعد اسناد کا بیان ہر راوی کے لیے واجب تھا، تاکہ ثقہ اور غیر ثقہ راوی کا پتہ چل جائے اور کذابین کی قلعی کھل جائے۔

تابعین کے آخری دور میں باقاعدہ جرح و تعدیل روایات کے قواعد و ضوابط مرتب ہونے شروع ہوئے اور چونکہ جرح اور تعدیل اور احادیث کے صحت و ضعف کے فیصلہ کا مدار رجال اسناد پر ہے، لہذا جب تک راویان و محدثین کے تاریخی حالات پر بخوبی اطلاع نہ ہو، اسناد کی صحت و ضعف کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، اس لیے محدثین کو تاریخ رجال کی طرف مستقل توجہ کرنی پڑی، جس سے ”اسماء الرجال“ کا تنظیم الشان فن مدون ہوا، جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔

روزہ اور قرآن

سید مناظر احسن گیلانی

آئیے روزے کے قرآنی مطالبے کو قرآن ہی کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

تقویٰ اور روزہ

”الصیام“ (یعنی: روزوں) کا مطالبہ سورۃ البقرہ کی آیات (۱۸۳ تا ۱۸۵) میں کیا

گیا ہے۔

ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ روزہ آدمی میں ”تقویٰ“ کے جذبہ کو ابھارتا اور بیدار کرتا ہے۔ اس کے بعد اطلاع دی گئی ہے کہ رمضان ہی کے مہینے میں چونکہ قرآن کے نزول کی

ابتدا ہوئی، اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ اس مہینے کو روزے کے ساتھ گزاریں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ”تقویٰ“ کا مطلب کیا ہے، روزے سے اس کا کیا تعلق ہے

اور تقویٰ کے جس جذبہ کو روزہ ابھارتا اور جگاتا ہے، انسانی فطرت کے اس جذبہ سے قرآن

کا کیا تعلق ہے؟ ایک مثال اپنے سامنے رکھ لیجئے: روشنی سے وہی مستفید ہو سکتا ہے، جس کی

بینائی کی قوت آلائشوں سے پاک و صاف ہو۔ اس مثال کے پیش نظر غور کیجئے، قرآن کیا

ہے؟ آدمی کی آئینی زندگی کے قدرتی دستور العمل ہی کا نام قرآن ہے۔ اسی طرح تقویٰ

جس کا ترجمہ عموماً پرہیز یا ڈر، وغیرہ الفاظ سے کر دیا جاتا ہے، فطرت انسانی کے اس خاص

رجحان کی تعبیر ہے، جس نے آدمی کو آئین پسند بنا دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک جنون

سے کسی کا دماغ ماؤف ہی نہ ہو، ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اعمال و افعال میں ہم مطلق

النعان بن کر نہیں پیدا کئے گئے ہیں۔ یعنی: جو جی میں آئے اسے کہہ گزریں، جسے چاہیں مار

بیٹھیں، قتل کر دیں، جن کا مال چاہیں اڑالیں، سڑکوں پر ننگے ہو کر ناچیں، تھرکیں۔ یہ یا اسی

قسم کے بہت سے کام کرنے پر ہم آمادہ ہو جائیں، تو انہیں کر تو سکتے ہیں، لیکن اندر کی آواز

ہمیں ٹوکتی ہے اور حدود میں رہنے کا تقاضا کرتی ہے۔ کچھ کام ایسے ہیں جو کئے جائیں اور

کچھ ایسے بھی ہیں جو نہ کئے جائیں، یہ تقسیم ہمارے اعمال و افعال کی سچ سے پوچھیے، تو تقویٰ ہی کے فطری جذبہ کی پیداوار ہے۔

کون کون سے کام کرنے کے ہیں اور کون سے نہ کرنے کے تفصیلات میں تو اختلاف ممکن ہے، لیکن ان دو حصوں میں اعمال کی تقسیم، انسان کا فطری احساس ہے۔ کسی شخص کے متعلق جو ہی پتا چلتا ہے کہ اعمال و افعال کی حد بندی کے تقاضوں سے آزاد ہو گیا ہے، اس کے پاگل ہو جانے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اگر تقویٰ کی واقعی حقیقت یہی ہے جو عرض کی گئی، تو پھر کتنی آسانی کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن کو، یعنی: آئینی زندگی کے قدرتی دستور العمل کو سپرد کرتے ہوئے تقویٰ کے احساس کو چونکانے والے اور جگانے والے عمل، یعنی: روزے کی پابندی کا بھی ٹھیک اسی مہینے میں کیوں مکلف بنایا گیا، جس میں قرآن کے نزول کی ابتدا ہوئی۔ آئین و دستور کی پابندی کا مطالبہ باہر سے جن پر پیش ہو رہا تھا، ضرورت تھی کہ ان کے اندر بھی احساس اور جذبے کے اجاگر کرنے کا حکم کیا جائے، جس پر آدمی کی آئینی زندگی کا دار و مدار ہے۔

یہ ہے ”تقویٰ“ اور ”قرآن“ میں تعلق، گویا آئین کے ساتھ آئین پسندی کے جذبے کو بھی بیدار رکھنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ آدمی میں آئین پسندی، یعنی: تقویٰ کا جو جذبہ فطرتاً پایا جاتا ہے، اس کے ابھارنے اور اس کو تروتازہ رکھنے میں روزہ سے کیوں مدد ملتی ہے؟ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں بار بار جس چیز کی ضرورت آدمی کو ہوتی ہو، روزمرہ کی اسی ضرورت سے اچانک دست بردار ہو جانے پر آمادہ ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے نہ آئینی حدود کے اندر اپنے آپ کو روک رکھنے کی پوری قوت اس کے اندر پائی جاتی ہے۔ سال کے گیارہ مہینوں میں جو کھا رہا تھا، پی رہا تھا، جنسی تقاضوں کی تکمیل پر جس کے کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی، وہی بارہویں مہینے میں اس امتحان میں کامیاب ہو کر نکلتا ہے کہ ساری چیزیں، جن کا گیارہ مہینوں میں عادی تھا، ان کو چھوڑ بیٹھا۔ آئینی جذبے کی مشق کی اس سے زیادہ بہتر صورت اور کیا ہو سکتی تھی۔

اب پڑھیے روزہ والی آیتوں کو۔ انصاف سے بتایا جائے کہ خود قرآن نے روزہ کے

قانون کو نافذ کرتے ہوئے جو کچھ اس کے متعلق بیان کیا ہے، دل آویزی اور دل نشینی کی جتنی غیر معمولی خنکی اس میں پائی جاتی ہے، کیا عقل کے ناخن تراشوں کی تاویلوں میں اس کے بعد کچھ بھی جان رہ جاتی ہے؟ اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ روزہ اور اس کے اسرار و حکم اور وجوہ و مصالح کے سمجھنے کے لیے بجائے قرآن کے غیر قرآنی راہوں سے مدد لینے کی قطعاً حاجت نہیں۔

دوسرے مذاہب سے تعلق

روزے کے مظاہرے کو مسلمانوں پر عائد کرتے ہوئے گذشتہ ادیان و مذاہب کو ماننے والی امتوں کے ساتھ اپنے تاریخی رشتہ کا اعادہ ”کما کتب علی الذین من قبلکم“ کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے۔

اس سے مسلمانوں میں یہ نفسیاتی اثر پیدا ہوتا ہے کہ اس حکم الہی کا بار اٹھانے میں وہ تنہا نہیں ہیں، بلکہ جو انسانی نسلیں ان سے پہلے گزری ہیں، وہ بھی اس میں ان کی شریک ہیں۔ اسی سے خود بخود یہ بھی مجھ میں آ جاتا ہے کہ روزے کا مطالبہ کوئی ایسا مطالبہ ہے بھی نہیں، جسے بار سمجھا جائے۔ آخر جس کام کو تاریخ کے نامعلوم زمانے سے انسانیت برداشت کرتی چلی آئی ہے، اس کو بار اور بوجھ قرار دینے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں، گویا برداشت کے لحاظ سے یہ تجربہ کیا ہوا، جانچا اور پرکھا ہوا عمل ہے، سمجھا جائے، تو یہ اشارہ بھی قرآن کے الفاظ سے ہمیں مل سکتا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حیوانی ضرورتوں کے لیے حرارت، روشنی، ہوا، پانی وغیرہ جیسی قدرتی امدادوں کا آدمی ہر زمانے میں ہر جگہ محتاج رہا ہے، یہی نوعیت قدرت کے ان قوانین کی بھی ہے، جن کی پابندی کے بغیر انسان انسان نہیں رہ سکتا۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ”انگلوں پر بھی روزہ واجب کیا گیا تھا“ تو اس سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ روزہ بھی قدرت کے ان ہی قوانین میں شریک ہے، جن سے نالگے بے نیاز ہو کر رہ سکتے تھے اور نہ پچھلے اس سے مستغنی ہو سکتے ہیں۔

یورپ و امریکہ کے علمی حلقوں میں آج کل مذاہب و ادیان کی تنقید و تحقیق کے سلسلے

میں تقابلی مطالعے کو سب سے زیادہ ”عالمانہ طریقہ“ سمجھا جاتا ہے۔ پہلے تو مذہبی پیشہ وروں، یعنی پادریوں نے اس کام کو شروع کیا تھا، بعد کو ان ہی پادریوں کی اولاد دوسرے علمی القاب اور خطاب کے ساتھ اسی کام کو ریسرچ اور تحقیق کے نام سے انجام دینے لگی۔ باور یہی کرایا جاتا ہے کہ تنقید و تحقیق کی ان راہوں میں کسی خاص مذہب، یا دین کی پاسداری، خیانت اور علمی بددیانتی سمجھی جائے گی، لیکن سہارے پا پڑ دراصل کسی خاص مذہب کی تائید و حمایت ہی کے لئے پہلے جاتے ہیں۔

اس تقابلی مطالعہ میں مختلف ادیان و مذاہب اور ان کے پیش کرنے والے بزرگوں کی تحقیر و تنقیص سے دامن ضرور آلودہ ہوتا ہے۔ تحقیر و تنقیص کے ان قصوں سے دلوں کو جو دکھ پہنچ جاتا ہے، یا پہنچایا جاتا ہے، دل آزاری کی جو آندھیاں چل پڑتی ہیں، ان کا رکنار و کنا، ناممکن ہوتا ہے۔ اس بات میں غیروں سے نہ مجھے شکایت ہے اور نہ شکایت کا حق حاصل ہے، مگر مسلمانوں میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ دعوت و تبلیغ کے قرآنی منہج خاص سے لاپرواہ ہو کر کچھ لوگ کچھ دنوں سے ان ہی باتوں کی حوصلہ افزائیوں میں مشغول ہیں، جن سے تقابلی مطالعے اور اس طریقے کے سارے مفاسد اور زہریلے فتنوں کی نشوونما میں مدد مل رہی ہے۔ دیکھتا ہوں اور دل ہی دل میں گھٹتا ہوں، کڑھتا ہوں۔ قرآن سکھاتا ہے کہ بنی آدم کی جن جن نسلوں کو مسلمانوں سے پہلے اپنے وقت میں انسانی زندگی کے قدرتی دستور العمل کا مخاطب و مکلف خالق کائنات نے بنایا تھا، ان سب سے مسلمانوں کا تاریخی رشتہ تکذیب و تغلیط اور تحقیر توہین کا نہیں، قطعاً نہیں، بلکہ تصدیق و توثیق کا ہے۔ ایک ہی دیوان عشق کے ہم سبق، ہم سب کے سب ہیں، ایک ہی لاہوتی کالج سب کی تعلیم گاہ ہے، حقیقی معلم اللہ واقعی استاد بھی سب کا ایک ہی ہے اور بجز معمولی رد و بدل کے اصولاً تعلیمی نصاب بھی اگلوں اور پچھلوں کا اول سے آخر تک ایک ہی رہا ہے۔

قرآن نے اپنے ماننے والوں کی ذہنی تربیت ہی کچھ ایسے ڈھنگ سے کی ہے کہ ہمارے پیشوا تمہارے پیشوا، ہمارے دینی بزرگ، تمہارے دین بزرگ.....! یہ ہم تم کا سوال ہی، مذہب اور دین کے دائرے میں ان کی نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گیا ہے۔ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان دنیا کے مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں کا جب ذکر کرتے ہیں، تو

سننے والا یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ خود اپنے گھر کے بزرگوں کا ذکر کر رہے ہیں، یا ان لوگوں کا جن کو یہودی اپنا پیغمبر، یا عیسائی اپنے دین کی سب سے بڑی ہستی تسلیم کرتے ہیں۔ دراصل گھر اور باہر کے اس فرق کو مسلمانوں کا دینی احساس پہچانتا ہی نہیں ہے۔

مسلمانوں پر روزے کو عائد کرتے ہوئے بجائے یہ فرمانے کے کہ مسلمانوں کے دین کا یہ کوئی امتیازی سرمایہ ہے، قرآن نے صاف لفظوں میں یہ اطلاع دی ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ پہلے بھی لوگ اسی کی پابندی کرتے چلے آتے ہیں۔ قرآن اگر یہ کہتا ہے کہ پچھڑے ہوؤ، کو ملانا اور اپنے بزرگوں کی راہ سے جو ہٹ گئے ہیں، اسی راہ پر ان کو واپس لانا، یہ بھی اس کا۔ اسی نصب العین ہے، تو روزہ کے بارے میں اس بیان کی تعبیر اور کیا کی جائے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ دین کی دعوت میں لوگ دل آزاری کی راہوں کو چھوڑ کر قرآنی راستے پر آگر چلتے، تو جن قوموں کی اسلام سے محرومی کی مدت دراز سے دراز تر ہوتی چلی جا رہی ہے، بہت مختصر ہو جاتی ہے۔

ضرورت ہے کہ تصدق و توشیح کے رشتے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو سمجھایا جائے کہ گذشتہ ادیان و مذاہب کے جن پہلوؤں کی تصحیح، یا تکمیل کا کام قرآن نے انجام دیا ہے، اس کا صحیح مطلب کیا ہے؟ اسی موقع پر دیکھئے، رمضان ہی کے مہینے کو روزے کے لیے متعین کرتے ہوئے نزول قرآن کے ذکر میں، یہ فرما کر کہ نسل انسانی کی ہدایت کا سرچشمہ یہ کتاب ہے، آگے اسی کی خصوصیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے: ”بینات من الہدی والفرقان“۔ ”ہدایت کی کھلی کھلی باتوں پر (قرآن مشتمل ہے) اور الفرقان بھی ہے۔“ مطلب یہی ہے کہ مذاہب و ادیان کے بینات، یعنی: واضح اور کھلے کھلے حقائق جنہیں عام طور پر لوگ جانتے ہیں، ان کے سوا قرآن ”الفرقان“ بھی ہے، یعنی: بیرونی آمیزشوں اور خارجی آلائشوں کو تمام مذاہب و ادیان سے جدا کرنا، سب کو پاک و صاف کرنا، یہ بھی قرآن ہی کا ایک پہلو ہے۔ اس لیے رمضان، یا نزول قرآن کا مہینہ ان لوگوں کا بھی دینی مہینہ ہے، جن کے پاس پہلے سے ہدایت کے بینات نہ تھے اور جن کے پاس کسی نہ کسی شکل میں ہدایت کے یہ بینات باقی رہ گئے تھے، ان کے لئے یہی رمضان اس لیے دینی مہینہ بن گیا کہ قرآن کے فرقانی پہلو سے استفادے کا موقع ان کو بھی ملا۔ یوں رمضان

ساری انسانی نسلوں، خاندانوں اور قبیلوں کا دینی مہینہ بن جاتا ہے۔

بہر حال مجھے کہنا یہی ہے کہ قرآن جیسی خود منکشی کتاب کی اشاعت و تبلیغ کے لیے یا اس کی تعلیمات کی توجیہ و تاویل کے لیے غیر قرآنی ذرائع کی دست نگری کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن آگے تو کیا بڑھتا، خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں (لا فعلہ اللہ) اس کا دائرہ گھٹ نہ جائے، اگرچہ یہ خطرہ بھی صرف دلوں کے ایک و سوا سی خطرے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

روزہ میں لیسر

روزے کے متعلق یہ طریقہ تعبیر اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے تو ایام معدودات، یعنی: چند گنے چنے دن روزہ فرض ہو اور بعد کو پھر رمضان کا مہینہ مقرر کر دیا گیا۔ یہ دونوں حصے ایک دوسرے سے جدا سمجھے جاتے ہیں، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں دو مستقل مطالبے نہیں ہیں، رمضان ہی کے مہینے کو روزے کے حکم کی تعمیل کا مہینہ مقرر کرنا مقصود تھا، لیکن اسی مقصد کو پہلے عام الفاظ میں ادا کیا گیا، یعنی: بڑی مدت روزے کے لیے نہیں، بلکہ چند گنے چنے دن کی حد تک اس عمل میں مسلمانوں کو مشغول ہونا پڑے گا، پھر ان ہی گنے چنے دنوں کی تفصیل یہ کی گئی کہ وہ ”رمضان کا مہینہ“ ہے۔ یہ لیسر کی وضاحت ہے۔

روزہ کی یہ حقیقت قابل غور ہے کہ سب سے زیادہ آدمی جن چیزوں کا عادی ہوتا ہے، روزے کی وجہ سے اپنی اسی دوامی عادت سے دست برداری کی مشق پیدا ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دین ہو، یا دنیا، زندگی کے تمام شعبوں میں اس مشق سے یہ مدد ملتی ہے کہ عادت کے خلاف کسی قسم کے مشکلات سے دوچار ہونے کا موقعہ سامنے آجائے، تو روزے کی مشق ان مشکلات کو قدرتنا روزہ رکھنے والوں کے لئے آسان بنا دیتی ہے، اس لیے یہ فرماتے ہوئے کہ جن رعایتوں اور جن شروط کے ساتھ روزہ کا مطالبہ واجب کیا گیا ہے، ان ہی کو دیکھ کر تم یہ سمجھ سکتے ہو کہ مشقت اور دشواری میں مبتلا کرنے کا ارادہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کے مقابلے میں روزے کی مشق سے زندگی کے عام عادی مشکلات میں مدد ملتی ہے، خصوصاً قمری مہینے کی وجہ سے ہر موسم اور سال کے ہر حال میں روزہ رکھنے کی عادت سہولت کے دائرے میں جس وسعت کو پیدا کرتی ہے اور مشقت کی برداشت کی قوت کو بڑھاتی ہے، اس

کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ روزے سے آسانی پیدا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔

شکر اور وفاقی تعلق

انسانیت ہدایت کے جس نظام کی پابندی کر کے اپنے صحیح انجام تک پہنچ سکتی ہے، یقیناً اس کا علم ساری انسانی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ روزہ اس غیر معمولی، انمول نعمت سے سرفراز فرمانے والے کی بڑائی کے اقرار کی بہترین عملی شکل ہے کہ آدمی سب سے زیادہ جن چیزوں کا رسیا اور عادی ہے، ہر ایک کو ٹھکرا کر اس بڑے کے حکم کی تعمیل کیلئے کھڑا ہو جاتا ہے، ”تا کہ بڑائی کرو اللہ کی اس نعمت کے مقابلہ میں کہ تمہاری رہنمائی اس نے کی“۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی بھر جو ہمیں کھلانا پلاتا رہتا ہے اور طرح طرح کی نعمتوں سے نوازتا ہے، آدمی کا جی چاہتا ہے کہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرے۔ کوئی شک نہیں کہ شکر اور گن گانے کی صورتیں یہ بھی ہیں کہ زبان سے شکر کے الفاظ ادا ہوتے ہوں، یا دل میں تشکر و امتنان کے جذبات پیدا ہوں، لیکن کھلانے پلانے والے کے شکر کی یہ شکل..... جتنی دیر کے لیے کھانا چھوڑ دینے کا حکم کھلانے والے، پلانے والے نے دیا، اتنی دیر کے لیے ہم اس کو چھوڑ بیٹھیں..... حق تو یہ ہے کہ زبان اور دل والے شکر یوں سے شکر کا یہ عملی قالب خود شکر کرنے والوں ہی کے لیے زیادہ اطمینان بخش ہے، اس کی طرف آخر میں ”تا کہ تم شکر ادا کرو“ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا تھا۔

”جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے میرے متعلق، تو میں قریب ہوں، جواب دیتا ہوں پکارنے والے کی پکار کا“۔ اس آیت سے پہلے بھی روزے کا ذکر ہے اور اس کے بعد بھی۔ سچ میں اس آیت کا ہونا یقیناً بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔ بظاہر یہی خیال گزرتا ہے کہ حق تعالیٰ کے حکم کے مطابق جب بندہ پسندیدہ عادتوں سے دستبردار ہو کر اپنے پیدا کرنے والے کی خوشی اور اسی کی مرضی کے مطابق اپنی خوشی اور اپنی مرضی کو بنا دیتا ہے، تو روزہ کے زمانہ میں روزہ دار کا خالق کائنات کے ساتھ اس وفاقی تعلق کو قرآن بتانا چاہتا ہے، معمولی حال نہ سمجھنا۔ منطقی طور پر یوں ترتیب قائم کی جائے کہ ساری کائنات حق تعالیٰ کی مرضی مبارک کے مطابق چل رہی ہے، انسان جب اسی عالمگیر مرضی کے مطابق اپنے آپ کو کر لیتا ہے، تو

اس خاص حال میں عالم کا ہر قانون انسان کی مرضی کی مطابقت کے لیے ہو جاتا ہے، یعنی: اس کی ہر دعا کو حق تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے اس کے سوا دوسری توقع ہی کیا کی جاسکتی ہے؟ (ماہنامہ الابشر کراچی)

بیت اللہ مرکز ارضی تجلی گاہ ربانی

مرکز ارضی

کثرتوں کا ارتکازی مجموعہ خواہ چھوٹا ہو، یا بڑا، ہاتھی کا کوہ پیکر جشہ ہو، یا برگد کے پھلوں کا خشخاشی تخم، ہر ایک میں ان کے بکھرے ہوئے اجزا کی پیوستگی اور باہمی ارتباط کو قائم رکھنے کے لیے بھی اور اپنے اپنے نوعی کمالات کو نشوونما اور ارتقا کے آخری مقام تک پہنچانے کے لیے بھی ایک مرکزی نقطہ پایا جاتا ہے۔ اس مرکزی نقطہ کے وجود کو اگر اس سے نکال لیا جائے، تو ایک طرف سارے سمٹے ہوئے اجزا بکھر جائیں گے اور دوسری طرف بیرونی فیوض کو جذب کر کے ارتقا و نشوونما کے جس عمل کو یہ مرکزی نقطہ جاری رکھے ہوئے تھا، وہ عمل بھی رک جائے گا۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کو مثال سے سمجھئے، آم کی گٹھلی، یا اس قسم کے پھلوں کے تخم کو آپ نے دیکھا ہوگا، آم کا درخت اسی گٹھلی سے برآمد ہوتا ہے۔ پتے، شاخیں، پھول، پھل کا ایک طوفان ہوتا ہے، جو اسی گٹھلی کی راہ سے اپنی اپنی شکلوں کے ساتھ باہر نکل نکل کر آم کے درخت کا جز بننا رہتا ہے، لیکن آم کی اسی گٹھلی کو چیریں، اس میں ایک چیز آپ کو نظر آئے گی، جسے ”انکھوا“ کہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ گٹھلی سے اس انکھوے کو نکال لینے کے بعد، خواہ کتنی ہی اچھی، نرم اور پاکیزہ زمین میں اس کو بویا جائے اور چشموں کے کیسے صاف و شفاف پانی سے اس کی آبیاری کی جائے، بجائے اس کے کہ اس گٹھلی سے پودا نکلے، گٹھلی سڑتی چلی جائے گی، تاہم بالآخر سڑ سڑ کر اس کے اجزا مٹی میں مل کر ادھر ادھر غائب ہو جائیں گے۔

حاصل یہی ہے کہ گٹھلیوں کا یہی مرکزی نقطہ، وہ نقطہ ہے کہ دیکھنے میں خواہ کتنا بھی بے

حیثیت اور معمولی چیز نظر آتا ہو، لیکن کسی درخت کے شجری نظام اور اس کے سارے آثار و نتائج کا حصول یقیناً اسی مرکزی نقطہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کو نوچ کر گٹھلی سے اگر الگ کر لیا جائے، تو سارے فیوض جن سے درخت کا تنا، اس کی ڈالیاں، شاخیں، پتے، پھول، پھل مستفید ہوتے رہتے ہیں، ان کا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔

الغرض حیوانی و انسانی اجسام میں جو حیثیت قلب کی ہے اور نباتی حقائق کے لحاظ سے جو اہمیت گٹھلیوں کے اس مرکزی نقطہ کی ہے، دل یہ پوچھتا ہے کہ مٹی کا یہ تودہ، جس کا نام زمین اور دھرتی ہے، جس سے علاوہ عناصر اور معدنی مرکبات کے نباتی، حیوانی، انسانی ہستیوں کی بے پناہ موجیں ابل رہی ہیں، ان ساری پیداواروں کے لیے زمین بھی اپنے اندر کیا کوئی ایسی چیز رکھتی ہے، جسے ارضی فیوض و برکات کا مرکزی نقطہ ٹھہرایا جائے؟ کیا اس کا بھی کوئی دل ہے، جس سے مختلف ارضی پیداواروں کی رگوں میں نشوونما اور ارتقا و بقا کا خون دوڑ رہا ہے؟ یا یوں پوچھئے کہ یہ خاکی گٹھلی بھی اپنے اندر کیا کوئی ایسا ”انکھوا“ رکھتی ہے کہ اسی کے ساتھ ان ساری چیزوں کا قیام وابستہ ہو، جو زمین سے پیدا ہو رہی ہیں اور تمام خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے اس خاکی کڑے کی پشت پر نمایاں ہو ہو کر جسدِ ارضی پر اپنے اقتضائی کمالات کو حاصل کرتی چلی جا رہی ہیں؟ نہ ماننے والوں سے ابھی بحث نہیں، لیکن جنھوں نے مانا ہے کہ

﴿جعل الله الكعبة البيت الحرام قياماً للناس﴾

(المائدة)

”بنایا اللہ نے کعبہ کو، جو بیت الحرام ہے، سارے انسانوں کے قیام کا

ذریعہ۔“

اسی کی خبر ہے جو زمین کا اور زمین میں جو کچھ ہے، سب کا پیدا کرنے والا ہے، بتائیے ان سوالوں کے جواب میں ایک مومن بالقرآن کی نظر ”کعبہ“ کے سوا کیا کسی دوسری چیز پر پڑ سکتی ہے.....؟

سرچشمہ فیوض وامن

”وہی الکعبۃ البیت الحرام“ جس کا تذکرہ کرتے ہوئے جب اسی قرآن میں قیام و بقا سے بھی آگے بڑھ کر

﴿و اذ جعلنا البیت مثابة للناس و امانا﴾ (البقرۃ)
 ”اور جب بنایا ہم نے اسی البیت (گھر) کو انسانوں کیلئے مثابہ اور امن
 (کا ذریعہ) کی بھی تصریح کر دی گئی ہے۔

مثابہ کی لغوی و اصطلاحی تشریح کرتے ہوئے علامہ راغب اصفہانی ”اپنے ”مفردات“ میں لکھتے ہیں: ”پینے والوں کے لیے کنویں کے منہ پر جو جگہ بڑتی ہے، اسی کو ”مثابہ“ کہتے ہیں۔“ اب سوچئے کہ مثابہ ہونے کی یہی حیثیت جب امانہ وصل ہے، تو اس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہوا کہ سارے فیوض و برکات جو زمین کے اس کترے پر تقسیم ہو رہے ہیں، ان کے گزرنے کا مرکزی نقطہ یہی الکعبہ ہے۔ اور صرف مثابہ ہی نہیں، بلکہ اسی آیت کے لفظ ”امنا“ سے بھی یہ معلوم ہو رہا ہے کہ امن و امان سارا قدرت نے اسی ”البیت الحرام“ کے ساتھ وابستہ فرما دیا ہے۔

الغرض یہاں جس کسی کو جہاں کہیں جو کچھ بھی مل رہا ہے، اسی الکعبہ کی راہ سے مل رہا ہے۔ یہ قرآن کے نصوص صریحہ کا اقتضا ہے، گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ ساری کائنات کے ساتھ العرش کی جو نسبت قرآن نے بیان کی ہے کہ الرحمن اسی العرش کو مرکز بنا کر اپنی رحمتیں دنیا میں تقسیم فرما رہا ہے، یہی نسبت زمین کے خاص کترے کے ساتھ الکعبہ بھی رکھتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو خطاب کر کے رب العزت نے جو فرمایا اس سے کہ ”اے آدم! اتارا ہے میں نے تیرے لئے ایک گھر، تو اس گھر کا اسی طرح طواف کرے گا جیسے ”العرش“ کے گرد طواف کیا جاتا ہے اور تو اس گھر کے آگے اسی طرح نماز پڑھے گا، جیسے میرے عرش کے سامنے نماز پڑھی جاتی ہے۔“ (تاریخ الخلیفہ، ج: ۱، ص: ۸۹) اور دوسری روایتوں سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ کترہ ارض کا ”قلب“ اور وہ مرکزی نقطہ جس سے سارے برکات و فیوض اس زمین پر بٹ رہے ہیں، یہی الکعبہ ہے۔

مشہور قرآنی آیت:

﴿ان اول بیت وضع للناس للذی بیکۃ مبارکنا﴾

و ہدی للعالمین ﴿﴾ (آل عمران)

”سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا، وہ قطعاً وہی ہے جو ”مکہ“ میں ہے، جو سارے جہانوں کے لیے مبارک بھی ہے اور ان کی ہدایت کا سرچشمہ بھی“ کے بعد تو اس قسم کی روایتوں سے تائید حاصل کرنے کی بھی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آخر روایتوں سے یہی تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے کڑے پر جو سب سے پہلا نقطہ متعین کیا گیا، یہ وہی حصہ ہے جسے ”الکعبہ“ کی دیواریں اس وقت تک گھیرے ہوئے ہیں۔ روایتوں پر تو یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس واقعہ کا مشاہدہ کرنے والا اس وقت کون موجود تھا؟ لیکن جو قرآن کی خبروں پر یقین کرتے ہیں کہ خالق کائنات کی دی ہوئی خبریں ہیں، ان کے لیے تو اس شبہ کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی، کیونکہ یہ تاریخی شہادت تو اسی کی ہے، جو اس وقت بھی موجود تھا، جب نہ زمین پھیلائی گئی تھی اور نہ آسمانوں کے خیمے تانے گئے تھے اور اس وقت بھی وہ غائب نہ تھا، جب ”الناس“ یعنی نسل انسانی کے لئے یہ سب سے پہلا گھر بنایا جا رہا تھا، بلکہ اس واقعہ کی خبر دینے والا ہی وہ ہے، جس نے حد بندی کے اس عمل سے زمین کے اس خاص حصہ کو امتیاز بخشا ہے، اس سے بڑھ کر یقینی خبر اور کس کی ہو سکتی ہے.....؟

یہی نہیں، بلکہ آگے ”مبارکاً“ کے لفظ کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ برکتوں کا خزانہ اور فیوض کا حقیقی دہانہ بھی زمین کے اسی حصہ کو بنایا گیا، یہی وہ قدرتی سرچشمہ ہے، جس کی برکتیں اہل رہی ہیں اور وہیں سے چھلک چھلک کر ساری دنیا میں تقسیم ہو رہی ہیں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ العالمین، یعنی سارے جہانوں کے لیے رہنمائی اور ہدایت کا توحیدی نظام جب قائم کیا گیا اور نبوت کو ختم کر کے العالمین کی ہدایت کا مرکزی مقام مکہ منتخب ہوا، جیسا کہ ”ہدی للعالمین“ کے الفاظ کا اقتضا ہے، تو یہ اتفاقی واقعہ نہ تھا، بلکہ جو مقام مادی برکتوں کا سرچشمہ تھا، اسی کو دینی و اخلاقی تعلیمات کی اشاعت کا مرکز بھی مقرر کیا گیا۔ آخر ”للعالمین“ کے لفظ کا تعلق صرف ”ہدی“ ہی کے لفظ سے کیوں سمجھا جائے، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ”مبارکاً“ کے لفظ کو بھی للعالمین سے مربوط سمجھنا چاہئے۔

مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ ان صریح نصوص اور واضح بینات کی روشنی میں بھی ام القرئی، جو مکہ کا قرآنی نام ہے، اس کے سمجھنے، یا سمجھانے سے لوگ کیوں گریز کرتے ہیں۔ ”القرئی

”کالفظ یقیناً ایک عام اور مطلق لفظ ہے، ان ساری آبادیوں کو حاوی ہے جو زمین کے کسی گوشہ میں شرقاً و غرباً، شمالاً و جنوباً پہلے پائی گئی ہوں، یا اب پائی جاتی ہوں، یا آئندہ پائی جانے والی ہوں، وہ ایشیا میں ہوں، یا افریقہ میں، امریکہ میں ہوں، یا یورپ میں۔ قرآنی الفاظ کے مستند شارح علامہ راغب نے بھی ”ام القرئی“ کی یہی تشریح کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ”ساری دنیا اسی کے نیچے سے پھیلائی گئی ہے“ اشارہ اسی برکاتی مرکزیت کی طرف ہے، جسے قرآن میں ”مبارکاً“ کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔

سب سے پہلا گھر

جائے مکہ کے اسی آبادی کے دوسرے نام، یا تلفظ، یعنی: ”بکہ“ کے لفظ کو قرآن نے یہاں جو اختیار کیا ہے، یہ بھی میرے خیال سے کوئی اتفاقی بات نہیں ہے۔ نزول قرآن سے صدیوں پہلے الکعبہ کی اسی عالمگیر اہمیت کا انکشاف کرتے ہوئے پیغمبر داؤد علیہ السلام کتاب ”زبور“ میں یہ والہانہ تمہیدی فقرات ارشاد فرماتے ہیں:

”اے لشکروں کے خداوند! تیرے مسکن کیا ہی دلکش ہیں! میری روح خداوند کی یادگار کے لیے آرزو مند، بلکہ گداز ہوتی ہے۔ میرا من، میرا تن، زندہ خدا کے لیے لگا رہتا ہے۔“

پھر اس کی مثال دیتے ہوئے کہ ہر چیز ایک مرکز رکھتی ہے، فرماتے ہیں:

”گوریے نے اپنا گھونسلا اور ابابیل نے بھی اپنا آشیانہ پایا ہے، جہاں وہ اپنے بچے۔“

آخر میں زبور کا یہ مشہور فقرہ ہے کہ:

”مبارک وہ انسان ہیں، جن میں قوت تجھ سے ہے اور ان کے دل میں تیری راہیں ہیں، وہ بہ کہ کی وادی میں گزر کرتے ہیں اور اسے ایک کنواں بناتے ہیں، پہلی برسات اسے برکتوں سے ڈھانپ لیتی ہے۔“

یہ داؤد علیہ السلام کی کتاب ”زبور“ کے مزبور ۸۱ کے فقرے ہیں۔ اس میں چاہہ زمزم ہی کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ قرآنی لفظ ”مبارک“ کے مفہوم کو بھی خاص پیرایہ میں ادا

کر دیا گیا ہے۔ پہلی برسات ”الرحمن“ کی پہلی توجہ ہے، جو کترہ زمین کی آبادی کے لیے کی گئی۔ آج کل زبور کے جو تراجم شائع ہو رہے ہیں، ان میں ”بکہ“ کے لفظ کو اپنی اصلی صورت پر باقی نہیں رکھا گیا ہے، لیکن آپ مشہور عیسائی عالم پروفیسر مارگو لوتھ کی جو نسلًا یہودی تھا، یہ شہادت پڑھ سکتے ہیں کہ بجز مکہ معظمہ کے زبور کا یہ ”بکہ“ اور کوئی دوسرا مقام نہیں ہوسکتا۔ میرا خیال ہے کہ بجائے عام اور مشہور نام ”مکہ“ کے یہ بتاتے ہوئے کہ یہی سب سے پہلا گھر ہے، بہکہ کے نام اور تلفظ کو جو اختیار کیا گیا ہے، تو یہ اشارہ غالباً اسی مزبور (۸۱) کی طرف ہے، جس میں داؤد علیہ السلام نے بہکہ ہی کے لفظ سے اس کو یاد کیا ہے۔ یہ ”الکعبہ“ کی قدامت کے لیے یقیناً ایک اہم تاریخی وثیقہ ہے، موجودہ زمانہ کے حساب سے تین ہزار سال سے کم پرانی شہادت یہ نہیں ہے۔

لیکن داؤد علیہ السلام کا زمانہ تو نسبتاً بعد کا زمانہ ہے، ان سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب نوشتے جو بائبل کے موجودہ مجموعہ میں پائے جاتے ہیں، ان میں الکعبہ کے متعلق آپ کو مسلسل تاریخی شہادتیں ملتی چلی جائیں گی۔ تورات کا فقرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے:

”اس نے بیت ابل کے جنوب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ قائم کیا۔“ ”یم“ (یعنی: سمندر) اس کے مغرب میں، اور ”عی“ اس کے جنوب میں تھا۔ (تکوین باب ۱۲)۔ تورات کے عالم جانتے ہیں کہ یہ بیت ابل، یعنی: بیت اللہ جس کے جنوب میں ابراہیم علیہ السلام نے اپنا ڈیرا لگا ڈیا تھا، یہ وہی الکعبہ (بیت اللہ الحرام) کا مرکزی نقطہ تھا، جہاں بعد کو حضرت ابراہیم علیہم السلام نے اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ گھراٹھایا تھا۔ ”یم“ یعنی: سمندر کا الکعبہ کے مغربی سمت میں ہونا تو ایک عام کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ رہا ”عی“ قدیم جغرافیہ عرب کا مطالعہ اس کے لیے کرنا چاہئے۔

بہر حال اگر چہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے یہ نوشتے صدیوں سے بگاڑنے اور چھپنے، مشتبہ کرنے کی مسلسل کوششوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں، لیکن بچی کھچی جو چیزیں اس وقت تک ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں، جن میں کترہ زمین کے اس مرکزی ”مقام مبارک“ کا تذکرہ کیا گیا ہے، اگر سب کو جمع کیا جائے، تو وہ کافی ضخیم رسالہ بن سکتا ہے۔ ایسا رسالہ جسے

مختصر سوانح حالات و خدمات

دیکھ کر اضطراب آدمی اس قرآنی دعویٰ کی، یعنی: ”(اہل کتاب) جانتے ہیں اس ”الکعبہ“ کو اسی طرح جیسے پہچانتے ہیں وہ اپنے بچوں کو“ تصدیق و اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کاش کسی کو توفیق ہوتی کہ اس قرآنی اشارے کی توضیح کے لیے بائبل کی ان گواہیوں کو جمع کر دیتا۔ کیا عہد اسلامی سے پہلے بنی اسرائیل کے ان نوشتوں کے متعلق بھی اس شبہ کی گنجائش ہے کہ مسلمانوں نے اپنی طرف سے ان الفاظ کا اسرائیلی کتابوں میں اضافہ کر دیا ہے۔

اور یہ کتابیں تو خیر مذہب و دین سے تعلق رکھتی ہیں، مگر مسلمانوں سے پہلے بہت پہلے یونان و روم کے مؤرخوں کی کتابوں میں سرزمین عرب کے اس پرانے معبد ”الکعبہ“ کا ذکر جن الفاظ میں پایا جاتا ہے، ان کو دیکھنے کے بعد یہ دعویٰ کیا غیر تاریخی، یا بے بنیاد ٹھہرایا جاسکتا ہے کہ پشت زمین پر آج جتنے مکانات پائے جاتے ہیں، ان میں کوئی مکان، یا گھر قرآن کے اس ”اول البیت“ کے مقابلہ میں اس حیثیت سے اپنے کو نہیں پیش کر سکتا کہ مسلسل نہ صرف اپنے وجود کو، بلکہ احترام و عزت کی مرکزیت کو باقی رکھتے ہوئے موجودہ عہد تک چلا آیا ہو۔

ہیروڈوٹس جو حضرت مسیح سے چھ سو سال پہلے گزرا ہے، اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ عرب کے اس معبد کا بہت قدیم زمانے سے لوگ احترام کرتے چلے آئے ہیں۔ ہیروڈوٹس کی شہادت ہی تقریباً اڑھائی ہزار سال کی ہے۔ خیال کرنا چاہئے کہ اڑھائی ہزار سال پہلے بھی جس گھر اور مکان کے متعلق یہ خبر دی جاتی ہو کہ بہت قدیم زمانہ سے لوگ اس کا احترام کرتے چلے آئے ہیں، تو اس کی قدمت کی تاریخ کتنی طویل ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جب اس کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے کہ دنیا کے عام شہروں اور آبادیوں کے متعلق جن معلومات کو صحیح تاریخ معلومات قرار دیا جاسکتا ہے، ان کی مدت اڑھائی تین ہزار سال سے آگے نہیں بردھتی، کارٹھیج ہو، یا ایتھنز، یا امپیری ہو، یا روم، سب ہی کا حال یہی ہے۔

اب سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن نے اسی الکعبہ کا ذکر کرتے ہوئے مجملہ دوسرے صفات کے بعض مقامات میں اس کو ”البیت العتیق“ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ صفت صرف اضافی ہی نہیں ہے۔ تاریخی تحقیقات کے سلسلے کو لوگ اگر جاری رکھیں، تو ان پر واضح ہوتا چلا جائے گا کہ اس مکان کی حقیقی صفت یہی ہے، یعنی: ثابت ہوگا کہ دنیا کے تمام پرانے گھروں

میں جو کبھی پائے گئے، یا اب بھی کہیں پائے جاتے ہیں، سب کے مقابلے میں یہی مکان کرہ زمین کا قدیم ترین گھر ہے۔

وسط زمین

اور سچ تو یہ ہے کہ بائبل کا ”بیت اہل“ اور قرآن کا ”بیت اللہ“ جس آبادی میں پایا جاتا ہے، اس کے اور جس ملک سے اس آبادی کا تعلق ہے، اس کے متعلق تاریخی شہادتوں کے علاوہ ان کے جغرافیائی پوزیشن پر بھی اگر توجہ کی جائے، تو اس قرآنی اشارے کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہے، جسے ”سورۃ البقرۃ“ میں ہم پاتے ہیں۔ امت اسلامیہ محمدیہ (علی صاحبہا الف صلاۃ و تحیۃ) کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ:

﴿و کذلک جعلنا کم امة وسطاً﴾

”اور اسی طرح بنایا ہم نے تم لوگوں کو وسط اور بیچ والی امت“۔

اس سے پیشتر جیسا کہ ہر قرآن پڑھنے والا جانتا ہے ”الکعبہ“ ہی کا ذکر ہے اور فرمایا گیا ہے کہ بجائے مشرقی خطوں اور مغربی اقلیموں کے، مسلمانوں کو زمین کے اس حصہ میں قبلہ عطا کیا گیا ہے، جو نہ مشرق سے زیادہ دور ہے اور نہ مغرب سے اور یہ خدا کا فضل اور اس کی حکمت کا اقتضا ہے۔

بہر حال اس آیت کی صحیح تفسیر کا یہاں موقع نہیں ہے۔ جب مسلمانوں کو وسط اور بیچ میں واقع ہونے والی درمیانی امت قرار دیتے ہوئے ان کے اس حال کو قبلہ سے تشبیہ دی گئی ہے، تو صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ قرآن مطلع کرتا ہے کہ جغرافیائی حیثیت سے ان کا قبلہ بھی وسط اور ایسے علاقہ میں واقع ہے، جو دنیا کے معمور اور آباد علاقوں کے درمیانی حصہ ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے معنی یہی ہوئے کہ روایتوں میں الکعبہ، یا مکہ کو جو ”سورۃ الارض“ (ناف زمین) کے لفظ سے موسوم کیا گیا ہے، یہ دراصل اسی قرآنی خبر کی تعبیر اور توضیح ہے۔

آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مشرق و مغرب کے سارے موصلاتی ذرائع، خواہ ان کا تعلق خشکی سے ہو، یا تری سے، یا فضا اور ہوا سے، تقریباً عام حالات میں ہر ایک کو اس

علاقے سے گزرنا پڑتا ہے، جس میں الکعبہ واقع ہے۔ اسی طرح شمال میں ۸۰ درجے تک، اسی طرح اس کے بالمقابل جنوب میں ۴۰ درجے تک، عموماً انسانی آبادیاں پائی جاتی ہیں۔ مجموعی طور پر ۲۰ درجے تک دنیا کی آبادی شمالاً و جنوباً پھیلی ہوئی ہے، اس لیے دنیا کے درمیانی علاقے وہی ہو سکتے ہیں، جو ۲۰ اور ۲۱ درجے پر واقع ہیں، اب اطلس اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ وہی آپ کو جواب دے گا کہ عرب کا ملک جس میں الکعبہ واقع ہے، اس کا محل وقوع اس سلسلے میں کہاں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ ”العالمین“ کی ہدایت و ارشاد کا نظام اسی مقام میں قائم ہوگا، جو اس سے پہلے اسی عالمگیر تبلیغی نظام کی تمہید میں ابراہیم علیہ السلام کا مقام بنا۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی بتایا کہ: ﴿فِي آيَاتِ بَيِّنَاتٍ لِّعَلَّيْهِمْ﴾ یعنی: ”اس گھر میں اور بھی کھلی کھلی نشانیاں ہیں“۔ ان آیاتِ بینات اور کھلی کھلی نشانیوں کو آپ تلاش کرتے چلے جائیے، راز کے بعد راز کا مسلسل انکشاف آپ پر ہوتا چلا جائے گا، تاریخ کے اوراق بھی اس باب میں آپ کی مدد کریں گے، جغرافیہ کے اطلسوں سے بھی آپ اس سلسلے میں اعانت حاصل کر سکتے ہیں، اقوام و امم کے آسمانی رہنماؤں کے کلام میں بھی اس ”الہیت العتیق“ کے متعلق اتنے پتے ملتے چلے جائیں گے۔

یہ ساری نشانیاں آپ پر واضح کریں گی کہ اس گھر کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق، نری خوش اعتقادی پر مبنی نہیں ہے، بلکہ قدرت کے مقررہ طبعی قوانین کا یہ منطقی نتیجہ ہے۔ مسلمان اگر سمجھتے ہیں کہ نسل انسانی کا پہلا ابتدائی قبلہ بھی ”الکعبہ“ ہی تھا، پھر جب مختلف علاقوں کے بکھرے ہوئے انسانوں کو باہم ایک دوسرے سے قریب تر ہو جانے کی صورت نکل آئی، تو مختلف مقامی قبیلوں سے ہٹا کر سب کو اسی پرانے واحد مرکزی قبلہ پر جمع کر دیا گیا، تو یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تائید ان ہی ”آیاتِ بینات“ سے ہو رہی ہے، جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ ”ہندوستان سے الکعبہ کا حج حضرت آدم علیہ السلام نے چالیس دفعہ فرمایا“۔ میں مانتا ہوں کہ سند اس قسم کی روایتوں کا ذخیرہ بہت کچھ محل اشتباہ ہے، لیکن جب قرآن کے نص قطعی سے معلوم ہوتا

ہے کہ ”الناس“ یعنی: آدمیوں کے لئے سب سے پہلا گھر مکہ ہی میں بنایا گیا، تو ان روایتوں کا جو حاصل ہے، یعنی: حضرت آدم علیہ السلام وادی ”بکہ“ کے اس اول ایست سے تعلق رکھتے تھے، آخر اس کو مشتبہ قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے....؟

رہا یہ مسئلہ کہ زمین کے اس خاص حصہ کی تحدید و تعیین کے لیے ابتدا میں کیا صورت اختیار کی گئی تھی، یہ ایسی کوئی بات نہیں جس کی تحقیق میں سرکھ پایا جائے، پتھر لگائے گئے تھے، یا صرف مٹی کی دیواریں اٹھائی گئی تھیں، پھر پتھر اگے استعمال کئے گئے تھے، تو کس قسم کے پتھر سے اس کی تعمیر ہوئی تھی؟ قرآن میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے اور اس کا عمومی دستور ہے کہ غیر ضروری امور سے اعراض کر کے مسلمانوں کو بھی گویا سکھاتا ہے کہ ان لالہ یعنی مشاغل سے جہاں تک ممکن ہو، اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔

تجلی گاہ ربانی

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ”الکعبہ“ کی مرکزیت کے اظہار کے لیے ان تمام حقائق سے قرآن نے پردہ اٹھایا ہے، جن کے متعلق ممکن ہے کہ غیر ایمانی، عامیانہ فطرتوں میں ہچکچاہٹ پیدا ہو۔ اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ ”الناس“ کے قیام و بقا کا تعلق بھی اسی الکعبہ سے ہے، وہی الناس کے لیے مثابہ (پن گھٹ) ہے اور ان کا امن و نمان بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ ”العالمین“ یعنی: سارے جہانوں کے لیے وہ مبارک بھٹی ہے اور ان میں ہدایت کی عمومی روشنی کی تقسیم کا مرکز بھی یہی گھر بنے گا۔

(ماہنامہ الخیر، ملتان)

حضرت ابوذر غفاریؓ کے آخری لمحات!

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی

ہجرت کا تیسواں سال اپنی ہستی کو فنا کرتے ہوئے اپنے اخیر مہینے میں قدم رکھ چکا ہے۔ عرب و عجم کی بے شمار روچیں، عشق الہی میں سرشار و مست ہو ہو کر مکہ معظمہ کی وادیوں میں پھیل رہی ہیں۔ عراق کے مسافر "ذواتِ برق" کے راستے سے "ربذہ" کی پر فضا منزل سے گزر کر "لبیک اللہم لبیک، لبیک لا شریک لک" کی دل گداز آوازوں سے ان دہی چھپی چنگاریوں کو بھڑکار رہے ہیں، جنہوں نے حضرت ابوذرؓ کے سینے کو آتش دان بنا رکھا تھا۔

"ربذہ" کے سامنے سے جو حاجی مستانہ لباس میں پا برہنہ گزرتا، اگر اور کچھ نہیں کرتا تھا، تو کم از کم ابوذرؓ کے دل کو ضرور لاڈالتا تھا، خصوصاً اس سال کے تمام ممالک محروسہ اسلام میں یہ اعلان عام طور پر شائع ہو گیا تھا کہ اس سال بھی "مدینہ" کا روحانی و جسمانی سلطان اپنے حقیقی ملوکِ قدوس کے آستانہ پر جبین نیاز جھکانے آئے گا۔ یعنی عام طور پر یہ خبر ملک میں گرم تھی کہ حضرت عثمانؓ اس حج میں شریک ہوں گے، دور دور کے لوگ "بیک کرشمہ ذوکار" کا اصول پیش نظر رکھ کر "مکہ" میں امنڈے چلے آتے تھے کہ حقیقی مجازی دونوں جمال و جلال کا نظارہ ایک ہی سفر میں ملتا ہے۔ مختلف ملکوں کے صوبیداروں، والیوں کے نام بھی پروانہ جاری کیا گیا تھا کہ اس سال خدائے واحد کے دربار میں آکر بیت اللہ کے خادم عثمان سے مل جائیں۔

الغرض اس سال کی مختلف خصوصیتوں نے عشق کے بازار کو گرم و تیز کر دیا تھا اور ظاہر ہے کہ اس حالت میں "ربذہ" کے درویش کی آگ بھی قدر اشتعال انگیز بھبک رہی تھی، اس کی کوئی انتہا نہیں ہو سکتی، نتیجہ یہ ہوا کہ آخر بیماری دل نے کام تمام کیا، مدت سے آہستہ آہستہ سلگنے والی آگ دل و جگر کے ہر ریشہ میں پیوست ہو گئی، جو جسم انسانی تھا، وہ از فرق تا بقدم انکارہ اور فقط انکارہ ہو کر دکھنے لگا، حتیٰ کہ طاقت رفتار نے ساتھ چھوڑ دیا، قوتوں نے جواب دے دیا اور وہ جو کہ سامان سفر میں مصروف تھا، بستر مرض پر یاس و ناکامی کی چند ٹھنڈی

آہوں کے بعد اس طرح لیٹ گیا کہ پھر کبھی نہ اٹھا۔

دنیا نے سمجھا کہ کوئی مادی بیماری ہے، لیکن جنہوں نے آپ کے حالات کا مطالعہ ابتداء سے کیا تھا، وہ سمجھ گئے کہ جو چرکہ مکہ کے کسی چبوترے پر لگایا تھا، وہ اب گہرا ہو کر بیماری کی صورت میں ظاہر ہوا ہے، حتیٰ کہ ضعف نے آپ کو اس درجے مجبور کیا کہ باوجود قرب کے سب سے آگے رہنے والا سر بازار آج سب سے پیچھے رہ گیا، یار رکھ لیا گیا، آپ جس خیمہ میں بیمار ہو کر پڑ گئے، اسی کے سامنے سے روزانہ حاجیوں کا قافلہ امنگوں اور رانوں کے ساتھ گزرتا اور آپ کے دل پر رہ کر چوٹ پڑتی، آہندہ دوں کا ولولہ اٹھاتا اور تن زانی کی کمزوری گراتی، ایک عجیب کشاکش تھی۔ ہر بن مو سے گویا آواز آرہی تھی:

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدر لذت دیدار بھی نہیں

ضعف کا یہ حال کہ دو قدم چلنا بھی دو بھر تھا اور حسرتوں کی وہ سینہ زوریاں کہ جس طرح بھی ابراہیم کے سر پر ٹپکنے والی بجلی، یا فاران والی فارقلیط کی روح کو منور کرنے والی نوا، ایک دفعہ دل و جان پر کوند جاتی، گزر جاتی، لیکن جہاں صرف اپنی خواہشوں کی پابندی ہو، وہاں ان باتوں کو کون پوچھتا ہے۔ آہ کہ جس پر وہ اجلال کے بنا صیہہ پر کہ: "ان اللہ غنی عن العالمین"۔ (اللہ تمام عالم سے مستغنی ہے) آتشیں حروف میں لکھا ہوا ہو، وہاں "میں یہ چاہتا ہوں" کی آواز کون سنتا ہے۔ ابو ذرؓ نے چاہا، لیکن جسے ابو ذرؓ چاہتا تھا، اس نے نہ چاہا، پھر کس کی مجال تھی کہ "ربذہ" کا بیمار ایک قدم بھی آگے بڑھ سکتا ہو۔ آخر یہی ہوا کہ بیماری و نقاہت نے مجبور کیا، حضرت ابو ذر غفاریؓ اس پر شوکت حج سے شریک نہ ہو سکے، کیا کرتے، تھک کر "ربذہ" کے خیمہ میں پڑ گئے۔

"ربذہ" کے باشندے ایک تو یوں ہی تھوڑے تھے، اس پر کل سرکاری آدمی ان بے چاروں کو کیا علم تھا کہ افق غیب میں کیا دستور ہے، حضرت عثمانؓ کی آمد کی خبر سن کر وہاں کے کل آدمی مکہ معظمہ روانہ ہو گئے، "ربذہ" بالکل خالی ہو گیا، زندہ نفوس میں وہاں صرف آپ کا ایک جسم بیمار اور اہل و عیال رہ گئے اور بس، ادھر مناسک و زیارت کے دن بھی قریب آچکے تھے کہ مسافروں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ سڑک بھی سینہ ان پڑی ہوئی تھی،

”سبحان اللہ“ کسی کی زبان سے کچھ نکل گیا تھا، فقط اس کو پورا کرنے کے لیے کیا کیا سامان ہو رہے ہیں، ابو ذرؓ ”دمشق“ سے بلوائے جاہل نہیں، مدینہ سے ربذہ بھیجے جاتے ہیں، حج کے بہانے سے ”ربذہ“ کو خالی کیا جاتا ہے اور آہ کہ وقت بھی وہ رکھا جاتا ہے کہ براہ کارا ہی اور سڑک کا کوئی مسافر بھی میسر نہ آسکے:

ایں ہمہ غوغا برائے نیم جانے می شود

کہ ”فعال لما یرید“ کی قوتوں کو مانو اور اس کے آگے سر بسجود ہو جاؤ۔

خیر جبہ ہزار سامان تیار ہو گیا، دیکھ لیا گیا کہ شرائط جو زبان سے ادا ہوئے تھے، پورے ہو چکے ہیں کہ یکا یک اس ہو کے میدان میں جہاں چند جانوں کے علاوہ دو دروازے تک شاید پر مارنے والا پرندہ بھی موجود نہ تھا، ”ربذہ“ کی صوفی خیمہ والی کالی تیمار زار عورت (یعنی: ابو ذرؓ کی زوجہ محترمہ نے) ایک چیخ ماری، خدا جانے انہوں نے کیا دیکھا اور کس کو دیکھا، مگر فوراً ہچکیوں میں ملی ہوئی نرم لہجے ابو ذرؓ کے بستر سے آواز آئی کہ: ”تم کو کس نے رلایا؟“۔ بیوی صاحبہ: ”تمہارا وقت قریب آ گیا ہے اور میں عورت ہوں، اتنی قوت نہیں کہ اس پتھر ملی زمیں میں تمہارے لئے قبر کھود سکوں گی اور آہ! گھر میں کپڑا بھی نہیں، جس میں تمہیں لپیٹ کر دفن کر سکوں گی۔“

حضرت ابو ذرؓ نے یہ سن کر نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ ان سامانوں کا جو اصلی نشان تھا، ان الفاظ میں ظاہر فرمانے لگے کہ: ”مت روؤ اس کے لیے نہ روؤ، میں صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا تھا، اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا کہ قطعاً تم لوگوں میں ایک شخص چٹیل سنیان وادی میں جان دے گا، جس کے جنازے میں مسلمانوں کا ایک گروہ آکر شریک ہوگا اور میں اس دن سے اندازہ کر رہا ہوں کہ وہاں جتنے لوگ تھے، ان میں سب کے سب کسی شہر، یا آبادی میں وفات پا چکے اور اب صرف میں اکیلا رہ گیا ہوں، جو اس وقت اس وادی بے کسی میں دم توڑ رہا ہوں۔ پس جاراستہ پر جا کر بیٹھ، مسلمانوں کی کوئی جماعت ضرور آ رہی ہوگی، کیونکہ خدا کی قسم نہ میں جھوٹ بول رہا ہوں اور نہ مجھ سے جھوٹ کہا گیا ہے۔“

بیوی صاحبہ: ”خدا جانے اب لوگ کہاں سے آئیں گے، حاجیوں کی آمد و رفت کا

سلسلہ بند ہو چکا ہے، راستہ بالکل سنسان پڑا ہوا ہے۔ حضرت ابو ذرؓ نے فرمایا کہ تم جاؤ تو سہی، جا کر دیکھو بھی تو۔ سمجھنے والوں کو اب جا کر معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس سے پہلے جو کچھ ہوا تھا:

سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

غفار بکا بہادر جواں صید گاہ شش میں کودا تھا، اس پر جو تیر چلایا تھا، آج جا کر نشانے پر بیٹھتا ہے، روتی دھوتی یاس و ناکامی کے ساتھ آپ کی بیوی: جنابہ اٹھیں اور لب سڑک آ کر بیٹھ گئیں، مایوسانہ نگاہیں افق تک پھیل کر کسی چیز کو انتہاء بے کسی کے ساتھ ڈھونڈ رہی تھیں اور پھر ناکامیوں کے ہجوم میں واپس آ جاتیں، یہ سلسلہ آمد و رفت کا اسی طرح قائم تھا کہ یکا یک مبتداء کے چہرہ سے نقاب الٹا گیا اور اس کی خبر گردوغبار کی صورت میں ایک جانب سے آ گئی، بیوی صاحبہ کا اس وقت کیا حال ہوا ہوگا، لکھنے کی ضرورت نہیں، سوچنے کی ضرورت ہے، پردہ چاک ہوتا ہے اور اندر سے گردنیں اٹھائے سترہ اونٹوں کی ایک قطار انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ نمودار ہوئی۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ اس طرح اڑے چلے آتے تھے گویا بھاری پرندوں کی ٹولیاں زنانے بھرتی ہوئی آئی ہیں، عربی عمالوں والے شترسوار گردوغبار میں ڈوبے ہوئے اس پر سوار تھے۔ آنا فانا وہ لوگ بیوی صاحبہ کے سر پر پہنچ گئے، ان لوگوں کی نگاہ بکا ایک آپ پر پڑی، اس عالم تنہائی میں ایک عورت کا اس طرح سے کھڑا رہنا حیرت میں ڈال دینے کے لئے کافی تھا، انگلیوں نے نکیلوں کو ڈھیلا کر دیا، اونٹ روک دیئے گئے، جو آگے تھا، اس نے آپ کو مخاطب کر کے پوچھا کہ: ”بیوی صاحبہ! آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟ آپ پر کیا حادثہ گزرا؟“ بیوی صاحبہ: ”مسلمانو! ایک آدمی بیچارہ مر رہا ہے، خدا کے لیے اس کے کفن و دفن کا سامان کرو۔“ اس کے بعد جو جملہ آپ کی زبان سے نکلا، دل کے کلڑے کلڑے اڑا دیتا ہے، کلیجہ پاش پاش ہوا جاتا ہے، نیاز کی بے نیازیوں کا مرقع کچھ اس طرح آنکھوں کے سامنے عریاں ہوتا ہے کہ دل بیٹھا جاتا ہے، ”اللہ اکبر“ ابو ذرؓ، راتوں کو پیشانی گھس گھس کر صبح کر دینے والا ابو ذرؓ، صبح کو فاتحہ و بھوک کی شدت میں شام کرنے والا ابو ذرؓ، سچ کی حمایت میں دنیا کو اپنا دشمن بنانے والا ابو ذرؓ، آہ کہ وہی ابو ذرؓ جس نے عشق و سرستی میں اپنی عمر کاٹ دی، توحید و سنت کی اشاعت میں در بدر پھرنے والا ابو ذرؓ، محض آسمانی محبوب کی رضا جوئی میں دولت و امارت سے کنارہ کش ہونے والا ابو ذرؓ، صرف اس

کی پوجا کے لیے آبادیوں کو چھوڑ کر جنگل کے بکھیروں کی طرح زندگی گزارنے والا ابو ذرؓ، آج ایک جنگل میں جان دے رہا ہے اور اس طرح دے رہا ہے کہ ان کی بیوی اللہ اللہ! مسافروں کے سامنے اس طرح کھڑی ہیں کہ ان کے کفن کے لیے بھیک مانگیں، غنی مطلق کے استغنائے مطلق کی یہ کار فرمائیاں ہیں، اس روحانی بادشاہ کی بیوی کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں اور مقربوں، صدیقیوں کا زہرہ آب ہوا جاتا ہے۔

”اس بیچارے مسلمان کے پاس کفن نہیں ہے، خدا را اس کے کفن کا بھی سامان کرو، خدا کے یہاں اجر پاؤ گے“۔ شتر سواروں نے پوچھا کہ: ”وہ کون آدمی ہے؟“ آواز آئی کہ: ”ابو ذرؓ، صحابی رسول اللہؐ یہ سن کر ہوش اڑ گئے، جو اس باختہ ہو گئے، کھرام مچ گیا، سننے والوں نے شور برپا کر دیا، غل تھا کہ وہ، ان پر ہمارے ماں باپ قربان ہوں، وہ ان پر ہمارے ماں باپ قربان ہوں“۔ اونٹوں کی پٹھیں خالی ہو گئی، کوڑے ان کی گردنوں میں لٹکا کر چیختے ہوئے گمیاں و ناللاں و افتاں و خیزاں اس خیمہ مریض کی طرف دوڑ پڑے۔

حضرت ابو ذرؓ نے بیوی صاحبہ کو ادھر بھیج کر اپنی بیٹی کو پکارا اور فرمایا کہ: ”بیٹی! ایک بکری ذبح کر لو اور فوراً اس کے گوشت کو آگ پر چڑھا دو، گھر میں مہمان آرہے ہیں، جب وہ مجھے فن کر لیں، تو تم ان سے کہنا کہ ابو ذرؓ نے آپ لوگوں کو خدا کی قسم دی ہے کہ جب تک کھانا کھانہ لیں، اپنی ساریوں پر سوار نہ ہوں“۔ اس کے بعد فرمایا کہ ”مہمانوں کی ایک اور جماعت آنے والی ہے، جو کھاتی بیٹی نہیں، سو گھتی ہے، ایک نافہ مشک کا پڑا ہوا ہے، اسی کو گھس کر پانی میں ملاؤ اور تمام خیمہ میں چھڑک دو، عنقریب وہ آنے والے ہیں“۔

روح جسم کو چھوڑ رہی ہے، سکرات کی حالتیں طاری ہیں، لیکن اس وقت بھی جو خیال عملی صورت میں اختیار کر رہا ہے، وہ وہی ہے جو میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ علم عمل پر منطبق ہو جائے۔

خلیل ابو ذر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے بتایا تھا کہ مہمانوں کا اکرام کیا کرو، پس گو جان نکل رہی ہے، لیکن یہ قول اس میں منجذب ہو گیا تھا، اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، حجتہ الوداع کی آخری وصیت نبوی ﷺ کہ: (الا فلیبلغ الشاهد الغائب) ”دیکھو جو یہاں موجود ہے، وہ غیر حاضر لوگوں کو میرا قول پہنچا دے“۔ موت کی تمام سختیوں پر غالب آگئی،

ان لوگوں کو دیکھ کر فرمانے لگے کہ:

”تمہیں خوشخبری ہو، تم لوگوں کے متعلق آنحضرت ﷺ ایک مژدہ سنا گئے ہیں (یعنی: فرمایا تھا) کہ مسلمانوں کی ایک جماعت آپ کے کفنِ دفن میں شریک ہوگی، حضور ﷺ کی یہ تصدیق کہ فلاں شخص ہے، یا فلاں جماعت مسلمانوں کی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ جان بخش گراں مایہ مژدہ اور کیا ہو سکتا ہے۔“ اس کے بعد ابو ذرؓ نے فرمایا کہ: ”ایک اور مژدہ سنو! میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جن دو مسلمانوں کے درمیان دو بچے مر گئے ہوں، یا تین بچے مر گئے ہوں، یا ان کی موت پر انہوں نے صبر سے کام لیا ہو اور صبر پر ثواب کی امید لگائی ہو، تو یہ دونوں ہمیشہ کے لیے آگ کے شعلوں سے جدا ہو گئے۔“

یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت ابو ذرؓ نے جو یہ حدیث بیان کی عموناً اس پر برا بیخنتہ کرنے والا تبلیغ کا جذبہ دیرینہ تھا، تاہم یہ بات البتہ قابلِ غور ہے کہ آپ نے خاص کر اسی روایت کو کیوں بیان کیا، میں اس کا قطعی تو جواب نہیں دے سکتا، پھر بھی قرآن و قیاسات کا مقتضی ہے کہ آپ کو یہ بھی جتنا منظور تھا کہ دیکھو ابو ذرؓ اس دنیا سے جاتا ہے، مگر اپنے اعمال و افعال پر بھروسہ کر کے نہیں جاتا، اپنے صدقات و خیرات پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی جان ملک الموت کے سپرد نہیں کرتا، ان چیزوں میں سے اس کو کسی پر غرہ نہیں، کسی پر بھروسہ نہیں۔ ہاں! صرف ایک آس ہے کہ اس کے چند بچے مر گئے ہیں، ارحم الراحمین شاید اسی کو بخشا اور مغفرت کا ذریعہ بنا دے، فقط ایک یہی چیز ہے کہ جو ممکن ہے، رحمت ایزدی کو اپنی طرف متوجہ کر سکے اور یہ ایک صوفیانہ نکتہ ہے کہ موت سے پہلے جس قدر خشیت و خوف اپنے دل پر غالب کر سکتے ہو، کرو، پھر جب موت کی گھڑیاں سر پر آجائیں، اس وقت بیم و دہشت کو سینے سے باہر نکال کر صرف امید و نجات و نور رحمت و غفران سے دل کو لبریز کر لو۔ شیخ المجاہد اب اس وقت اسی شغل میں مصروف ہیں۔

اس کے بعد آپ کے دل سے اس شورش انگیز، روح فرسا، حوصلہ گسل آواز اٹھی اور بعد حسرت و یاس اٹھی، صحابی رسول ﷺ نے فرمایا کہ: ”اے کاش کہ میرے پاس اتنا کپڑا ہوتا کہ میں اس میں سما کر اپنا کفن بنا لیتا، تو پھر میں اس کے علاوہ اور کسی کفن کی ضرورت

محسوس نہ کرتا، مگر (یعنی: جب خدا کی مرضی یہی ہے کہ اپنے کفن میں لپٹا ہوا نہ جاؤں اور آپ لوگ کفن دیں) اب آپ لوگوں کو وصیت کرتا ہوں اور خدا کی قسم دیتا ہوں کہ مجھے جو شخص کفن دے، وہ نہ تو کسی صوبہ کا والی اور نہ عریف ہو اور نہ واکیب ہو۔

اتفاق تو دیکھو کہ اس جماعت میں چٹنے آدمی تھے، قریب قریب ہر ایک شخص ان عہدوں میں سے کسی ایک پر ممتاز تھا، صرف ایک انصاری جو ان البتہ ایسا تھا جس میں یہ باتیں نہیں تھیں، وہی پول اٹھا کہ: ”مجھ میں آپ کی تمام شرائط پائی جاتی ہیں اور میرے تھیلے میں دو چادریں بھی نئی رکھی ہوئی ہیں، جس کے سوت میری ماں کے ہاتھ نے کاٹے ہیں۔“ بعض روایتوں میں ہے کہ: ”ان چادروں کو میری ماں نے بنا ہے اور ایک چادر یہ ہے، جو میرے بدن پر پڑی ہوئی ہے، یہ ملا کرتین کپڑے ہو جاتے ہیں جو کفن کے لیے کافی دوانی ہیں۔“

حضرت ابوذرؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ: ”ہاں! تم میرے حسبِ منشاء ہو۔ بس! انہیں کپڑوں میں مجھے کفنانا۔“ اس گفتگو کے بعد اور کیا کیا باتیں ہوئیں، مورخین ان سے ساکت ہیں، ہاں! طبقات ہی میں ایک اور روایت موجود ہے، جو ظاہراً بلکہ یقیناً اس روایت سے مختلف ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے ”زاد المعاد“ میں اس کے تضاد پر تشبیہ بھی کی ہے اور بغیر کسی جواب کے آگے نکل گئے ہیں، لیکن میرے نزدیک راویوں سے اس میں چوک ہوئی ہے، اقرب الی الصحت اس کی ترکیب یوں معلوم ہوتی ہے کہ: ”مجھے نہلا دھلا کر کفن پہنا کر سڑک پر جا کر ڈال دینا اور دیکھتے رہنا سب سے پہلے سواروں کی جو جماعت گزرے، ان کو ٹھہرا کر کہنا کہ یہ ابوذر صاحب رسول اللہ ہے، تم لوگ ان کے دفن میں میری مدد کرو۔“

۸ ذی الحجہ ۳۲، ہجری

خدا کی ہر چیز خدا کی طرف جانے والی ہے، آخرت وقت عظیم آگیا، آسمانوں سے فرشتے اتر پڑے اور اس خستہ و زار سوختہ و بریاں جاں کو جس نے خدا جانے اس عنصری دور میں نشیب و فراز عالم کے کتنے حوادث دیکھے اور خود اس کی قفسِ خاکی میں بند ہو کر کیا کیا تھا، اسی کو لینے کے لیے دنیاوی مخلصوں سے نجات کے لیے قدوسیوں کے بھر مٹ میں موت کا فرشتہ مشک بیز خیمہ میں اپنے میزبانوں کے پاس پہنچ گیا، جبابات اٹھنے لگے، ان دیکھی

چیزیں آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی نظر آنے لگیں، ابو ذرؓ نے ٹوٹی ہوئی آواز میں دنیا والوں کو اس آخری لفظ سے مخاطب فرمایا کہ: ”قبلہ کی طرف میرا رخ کر دو“۔ آخری حکم کی آخر تعمیل کر دی گئی، اس کے بعد خلوص و سچائی کے اندر ڈوبے ہوئے الفاظ خیمہ میں اس طرح گونجے ”بسم اللہ وباللہ علیٰ ملۃ رسول اللہ“ انہیں پاک آوازوں کے ساتھ خاک و آب و آتش و باد کے کرے، ایک تاباں روشنی مقدس تعلق سے ہمیشہ کے لیے مجرّم ہو گئے۔ سراج منیر ﷺ کے انوار سے دکنے والا ماہتاب ٹھیک ۸ ذی الحجہ کو ”ربذہ“ کے حوائی افق میں غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (نفس مطمئنۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی) کی صدائے روح پرور زمین سے اکھڑ اور جہاں بلایا گیا پہنچ گیا، جس نے اپنے کو خدا کے لیے بنایا تھا، وہ نہایت امانت کے ساتھ بیان و نفا کو پورا کرتے ہوئے جلال و جمال کی مستور کشتیوں میں غرق ہو کر جس کے لیے تھا اسی کے پاس چلا گیا۔

وماکان قیس ہنلکا ہلک واحد

ولکنہ بنیان قوم تمعدما

مجدوبوں کا سردار رئیس الطائفہ فقیری کی ایک جدید یادگار چھوڑ کر دنیا سے ہمیشہ کے

لیے رخصت ہو گیا۔

جنازہ

آنکھیں بند کی گئیں، آنکھوٹھے باندھے گئے، غسل دینے والوں نے نہلایا، انصاری نوجوان نے کپڑے نکال کر دیئے اور اس جسم کو جس نے اسلام کے بعد خدا کی مرضی میں اپنی خواہشوں کو جذب کر دیا تھا، ایک غیر کے کپڑے میں کفنا یا گیا۔ حسب وصیت آپ کا جنازہ اٹھایا گیا اور عام گزرگاہ پر لا کر رکھ دیا گیا، ادھر کوفہ سے استاد المسلمین، معلم الامتہ، فقیہ الاسلام حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ عمرہ کا احرام باندھے معہ ایک جماعت کے مکہ مکرمہ کے ارادے سے تشریف لا رہے تھے، آپ کو اس المناک حادثہ کا علم تھا، یا نہیں؟ مجھے کیا معلوم! تاہم ظاہر حال یہ تھا کہ آپ نہایت تیزی کے ساتھ اپنے اونٹ کو بھگاتے ہوئے لا رہے تھے، حتیٰ کہ قریب تھا کہ جس کا جنازہ بے کسی کے ساتھ راستہ پر پڑا تھا، وہ سواری کے نیچے

آجائے، لیکن یکا یک آپ ٹھنک گئے، جنازہ کو اس طرح پڑا ہوا دیکھ کر اپنے اونٹ کو روک لیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی ٹھہرا لیا، جو لوگ سڑک کے نیچے آنے والوں کا انتظار کر رہے تھے، ان لوگوں کو دیکھ کر سامنے آگئے اور کہا کہ: ”ابو ذرؓ صاحب رسول اللہ ﷺ ہیں، ان کے ذہن میں ہم لوگوں کی مدد کیجئے“۔ ایک زبردست دھکا تھا، جس نے اچانک حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روح میں زلزلہ ڈال دیا۔ حضرت ابن عبدالبر کی روایت ہے کہ سنتے ہی آپ نے چیخ ماری اور مجنونانہ اپنے اونٹ سے اتر پڑے، روتے جاتے تھے اور حالت وارفتگی میں آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ: ”میرے دوست، میرے بھائی“ اخیر میں فرماتے کہ: ”مبارک ہو تم کو، رسول خدا ﷺ نے سچ فرمایا تھا کہ ابو ذرؓ اکیلا ہی چلتا ہے، اکیلا ہی مرے گا اور اکیلا ہی اٹھے گا“۔

حتیٰ کہ کم از کم مرنے والا اگر اپنے ساتھ کچھ نہیں لے جاتا، تو اپنے گھر کا کفن یقیناً لے جاتا ہے، لیکن حضرت ابو ذرؓ صاحب رسول اللہ ﷺ کی تنہائی کا یہ عالم ہے کہ کفن بھی اپنا نہیں۔ لوگوں نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی، جنازہ آگے رکھ دیا، اس وقت کا نظارہ کتنا عظیم الشان اور دل ہلا دینے والا نظارہ ہوگا، سامنے ان کا جنازہ رکھا ہوا ہے، جو اپنے محبوب سے اسی طرح ملنے جا رہا ہے، جس طرح اسے چھوڑ کر آپ ﷺ تشریف لے گئے تھے، جنازہ کا امام وہ شخص ہے جس کی مرضی دنیا کے سب سے بڑے آدمی کی مرضی قرار دی گئی اور جن کے عہد علوم پر اعتماد کی تصدیق سرور کائنات ﷺ نے خود فرمائی اور جن کا بیشتر حصہ ان لوگوں پر مشتمل تھا، جن کے ملک سے عرب کے نبی ہاشم ﷺ کے ایمان کی خوشبو آئی۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ پہلا گروہ کل یمنیوں پر مشتمل تھا۔ ابن اشیرؒ نے دونوں گروہوں کے آدمیوں کے اسماء بھی لکھے ہیں، میں بھی ان کی تفصیل اسی سے نقل کرتا ہوں:

حضرت عبداللہ ابن مسعود، ابو مضر تمیمی، اسود ابن یزید، علقمہ ابن قیس نخعی، مالک بن الاشتر نخعی، خلخال حنسی، حارث ابن سوید تمیمی، عمر ابن عتبہ السلمی، ابن ربیعہ سلمی، ابورافع مزنی، سوید ابن شعبہ تمیمی، یزید ابن معاویہ تمیمی، آخر القرظ حنسی، آخر معصد شیبانی (رضوان اللہ علیہم اجمعین)

الغرض میدان میں بصد بے کسی جو دم توڑ رہا تھا محض اس کی خاطر تھی کہ کوفہ کی زمین میں ملائی جاتی ہے اور فقیہ الاسلام کو زبردستی کھینچ کر جنازہ پر لاکھڑا کیا جاتا ہے، تاکہ جاننے والے جانیں کہ جو خدا کے لیے مرتا ہے، خدا اس کے لئے کیا کرتا ہے۔

مجھے بار بار حیرت ہوتی ہے کہ حج کا موسم ختم ہو رہا ہے، ایام حج بھی گزر رہے ہیں، ایسے وقت میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا مکہ آنا ایک محض بے موقع سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ان کو اگر آنا تھا، تو پھر خواخوہ انہوں نے چند دنوں کے لیے حج کو کیوں چھوڑا؟ میں اس معرہ کو بالکل نہیں سمجھ سکا، پھر اس پر حضرت ابوذرؓ کا یہ فرمانا کہ: ”دیکھتے رہنا کوئی آتا ہوگا“۔ عجیب اسرار ہیں، جو علت اور معلول کے سلسلہ میں کسی طرح درج نہیں ہوتے، رہ رہ کر میری زبان پر یہ مصرعہ جاری ہو جاتا ہے کہ:

اے زائرِ حرمِ غرض ازیں خانہ چہیت

نماز کے بعد جنازہ اٹھا، کن کے کاندھوں پر اٹھا، چشم بصیرت دیکھے اور رشک و غبطہ کی موجیں دلوں سے اچھل اچھل کر نجات کی راہیں ڈھونڈنے والوں کو تڑپائیں، سب سے پہلی منزل کے دہانہ پر جب ایک بڑے انسان کو لایا گیا، قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور لوگوں کے ساتھ قبر میں اترے، اتر کر اس سرچشمہ صدق و امانت کو جس سے زیادہ سچی زبان والے انسان پر آسمان نے کبھی سایہ نہیں ڈالا اور نہ جس سے زیادہ صدیق و راست باز لہجہ کو زمین نے اپنی پشت پر کبھی اٹھایا، ”ربذہ“ کی ایک کنج عافیت میں ہمیشہ کے لیے مستور مخفی کر دیا گیا اور وہیں آج تک موجود و مودع ہے، عام زیارت گاہ ہے، پس جو تنہا ہی چلتا تھا، تنہا ہی رہتا تھا، وہ تنہا ہی عرصہ بلا آزماتش سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ حقیقی جذب و سرمستی کا چراغ گو اس کے بعد گل ہو گیا، لیکن اس کے بعد بھی جہاں کہیں اس کی کچھ روشنی پائی گئی، یا اس وقت بھی پائی جاتی ہے، وہ اسی کی فیض ریز شعاعوں کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح عیسوی زہد و ورع ہدی محمدی علیٰ صاحبہا الف صلوٰۃ و تحیۃ کے ساتھ اس کے بعد جہاں کہیں سے جمع ہوئے، وہ اسی اجماع کا اثر جاری ہے۔ فرضی اللہ تعالیٰ عنہ و عن الذین اتبعوہ باحسان!

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روانگی اور آپ کے اہل و عیال کا انتظام

الغرض قضا و قدر نے جو کچھ چاہا، وہ ہوا، ذن کرنے کے بعد حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اپنے رفقا کے ساتھ با چشم تر آپ کے خیمہ میں آئے۔ بیوی صاحبہ اور ان کی یتیم صاحبزادی صاحبہ وہاں موجود تھیں، آپ نے تسلی و تشفی کے کلمات ان کو کہے، خود بھی سنبھلے اور ان کو بھی سنبھالا، جب ایک گونہ سکون پیدا ہو گیا، تو چلنے کے ارادے سے اٹھے۔

حضرت ابو ذرؓ کی صاحبزادی صاحبہ نے پوچھا کہ کہاں تشریف لے چلے؟ ابا جان نے وصیت کی ہے اور خدا کی قسم دی کہ جب تک آپ لوگ کچھ نہ کھالیں، سوار نہ ہوں، انہوں نے اپنی زندگی میں بکری ذبح کرا کے پکانے کا حکم دے دیا تھا، جو پک کر تیار رکھی ہوئی ہے، یہ فرما کر کھانا پیش کر دیا، کھایا تو کیا جاتا، لیکن مرنے والے کے اس خلوص کو دیکھ کر حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ دنگ ہو گئے کہ حضرت ابو ذرؓ نے آنحضرت ﷺ کے ارشادات پر اس وقت بھی عمل کیا، جب کہ وہ دنیا سے رخصت ہو رہے تھے، تاکہ یہ دعوے کہ: ”میں آنحضرت ﷺ سے اسی طرح ملوں گا، جس طرح آپ ﷺ نے مجھ کو چھوڑا ہے۔“ عملی طور پر مدلل ہو جائے۔

الغرض جو کچھ کھا سکے، کھایا۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے کیا کیا؟ طبری نے اس کے متعلق دو روایتیں درج کی ہیں، ایک میں ہے کہ آپ نے حضرت ابو ذرؓ کے تمام اہل و عیال کو ساتھ لیا اور مکہ معظمہ میں جا کر حضرت عثمانؓ کے حوالے کر دیا اور دوسری روایت یہ ہے کہ یہیں ان لوگوں کو تسلی دلا سادے کر آپ اسی وقت مکہ معظمہ روانہ ہو گئے اور حضرت عثمانؓ کو اس جاناکا حادثہ کی خبر دی، حضرت عثمانؓ کو سخت صدمہ ہوا اور بجائے اصلی راستہ کے آپ مدینہ کو ربذہ کی طرف سے لوٹے، راستہ میں ربذہ میں اترے اور تعزیت وغیرہ کر کے سب کو اپنے ساتھ لے کر مدینہ منورہ آئے۔ الغرض خواہ یہ ہو، یا وہ ہو، اس پر دونوں روایتیں متفق ہیں کہ: ”ضمہ عثمان الی اہله“ ”حضرت عثمانؓ نے آپ کے بال بچوں کو اپنے بچوں کے ساتھ ملا لیا۔“

مختصر تعارف

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ

حضرت مولانا گیلانی ”بہار کی مردم خیز سرزمین کے درشاہوار تھے۔ ۹ ربیع الاول ۱۳۱۱ھ کو اپنی نھال ”استھانوں“ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن ”گیلانی“ میں اپنے چچا حکیم سید ابوالنصر سے پائی۔

۱۳۳۱ھ میں انہوں نے دورہ حدیث میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۲ھ میں دورہ حدیث میں شریک رہ کر دارالعلوم سے کتب حدیث کی سند حاصل کی۔ دارالعلوم میں حضرت شیخ الہند، حضرت شاہ صاحب، حضرت علامہ عثمانی اور دوسرے اساتذہ کے علمی اور روحانی فیضان و تربیت سے ان کی زندگی کا رخ معقولات کے بجائے تفسیر و حدیث اور سلوک و معرفت میں تبدیل ہو گیا اور فکر و نظر کی وہ تمام بنیادیں متزلزل ہو گئیں، جو خاندان، تعلیم اور گرد و پیش نے ان کے گرد چینی تھیں۔

مولانا گیلانی ”تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ مدت تک رسالہ ”القاسم“ اور ”الرشید“ میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اس زمانے میں انہوں نے اپنے علمی اور تحقیقی مضامین اور والہانہ طرز نگارش سے علمی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ ”سوانح ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ“ اور ”کائنات روحانی“ یہ دونوں کتابیں ان کے اسی دور کی یادگار ہیں۔

”النبی الخاتم“، ”الدین القیم“، ”تدوین حدیث“، ”ہزار سال پہلے“، ”نظام تعلیم و تربیت“ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں مقالات و مضامین ان کے قلم سے نکلے اور ملک کے بلند پایہ زبان و جرائد میں شائع ہوئے، (حضرت کا ایک دلچسپ مضمون ”آج بادل لعل نہیں دیتے“ کے بارے میں اساطیر میں شائع ہونا رہا، اب الحمد للہ ادارہ تالیفات اشرف باتان سے کتب ”شہدائے ہند“ اور ”چکا“ کے ان کا جو والہانہ اسلوب

تحریر میں پایا جاتا ہے، وہی والہانہ رنگ تقریر میں بھی تھا، وہ علم و فضل، معلومات، کثرت مطالعہ، دقت نظر، نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی میں نادرہ روزگار تھے۔ ان کی کتاب ”ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و ترتیب“ اپنے موضوع پر معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔

آخر میں جامعہ عثمانیہ سے وظیفہ یاب ہو کر اپنے وطن ”گیلانی“ میں مقیم ہو گئے تھے، وہیں طویل علالت کے بعد ۲۵ شوال ۱۳۷۵ھ (۵ جون ۱۹۵۶ء) کو وفات پائی۔

خصال الفطرة

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: عشر من الفطرة
 :”قص الشارب، اعفاء اللحية، السواك، الاستنشاق
 بالماء، وقص الاظفار، غسل البراجم، وشف
 الابط، وحلق العانة، وانتقاص الماء، یعنی: الا
 ستنجاء“۔ قال الراوی: ”ونسيت العاشر، الا ان
 تكون المضمضة“۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”دس چیزیں فطرت سے ہیں: مونچھیں کٹانی، ڈاڑھی بڑھانی، مسواک، ناک میں پانی دینا، ناخن ترشوانے، انگلیوں کے جوڑ دھونے، بغل کے بال اکھاڑنا، زیر ناف موٹنا، استنجاء“۔ راوی نے کہا کہ میں دسویں چیز بھول گیا، شاید کہ کٹی ہو۔

موجود ایک مفہوم ہے، جس کی ماتحتی میں دنیا کی ہر ہستی درج ہے، واجب جو ہر، عرض، قار، غیر قار سب ہی کو اپنے اندر سمیٹ کر، دلوں، اور دماغوں کے آگے روشن ہوتا ہے۔ غور کرو خدا کیا ہے؟ موجود ہے۔ ملائک و مجردات کیا ہیں؟ موجود ہیں۔ افلاک و اجرام ساویہ کیا ہیں؟ موجود ہیں۔ عناصر و بساط کیا ہیں؟ موجود ہیں، روح و مثل کیا ہیں؟ موجود ہیں۔ سیاہی و سپیدی، لہائی چوڑائی کیا ہیں؟ موجود ہیں۔ زمانہ، وقت، آن، سال، و مہینے کیا ہیں؟ موجود ہیں۔ وہ جلد جلد ٹلنے والی، اپنے ہم جنس کے پیدا ہونے کے ساتھ فنا ہو جانے

والی آوازیں کیا ہیں؟ موجود ہیں۔

تم نے دیکھا کہ جس طرح اس کا احاطہ ایک ضعیف سے ضعیف ہستی کو عام ہے، بخندہ وہ اپنے اندر اس وجود ازلی وابدی، سرمدی، دائمی، کو بھی لئے ہوئے ہے، جسے ہم اپنا مالک و پروردگار مانتے ہیں۔ اسکے بعد اب تم سے پوچھا جاتا ہے کہ اگر کہا جائے کھانا فطری ہے، تو کیا اس کا یہ مطلب سمجھنا صحیح ہوگا کہ نفس موجود (جس کے احاطہ و شمول کا اندازہ تم نے کر لیا ہوگا) فطرت میں داخل ہے، یعنی: اس کا اقتضاء ”ممکنات“ و ”باری الممكنات“ دونوں کی اصل حقیقت میں رچا ہوا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ اس سے بری ہے، پھر اگر یہ بھی نہیں، تو کیا یہ سمجھنا صحیح ہے کہ وہ تمام مخلوقات کو جو ہر ذات کا مقتضی ہے؟ حالانکہ یہ بھی نہیں کہ اعراض و عنما سر وغیرہ اس سے پاک ہیں اور اگر یہ بھی صحیح نہیں، تو کیا یہ صحیح ہے کہ وہ تمام جوہر کے فطرت میں داخل ہے؟ حالانکہ یہ بھی نہیں کہ بساط، جمادات وغیرہ اس سے مستثنا ہیں، بلکہ اس کا کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ وہ بعض چیزوں، جیسے: حیوان و انسان، درخت، بیل بوٹے وغیرہ کی نوعی طبیعتوں کی فطرت میں داخل ہے کہ بغیر کھانے کے وہ اپنی ہستی برقرار نہیں رکھ سکتے۔

اسی طرح اگر کہا جائے کہ فکر، ارتقا و عروج، تفنن، اختراع و ایجاد فطری چیزیں ہیں، تو کیا یہ حکم جس طرح انسانوں کو عام ہے، حیوانوں کو بھی شامل ہوگا؟ حالانکہ ایسا نہیں۔ انسان اپنے حفظ جان، وصیانت مال، عیش و آرام کے لیے، آئے دن نئی نئی ایجادیں کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ پہلے وہ لکڑیوں سے اپنے دشمن پر حملہ کرتا تھا، پھر لوہے سے اپنے کو بچانے لگا، اس کے بعد اس نے تیر و کمان سنبھالے اور اب وہ توپ و بندوق سے لڑتا ہے اور خداوند تعالیٰ کے علم میں ہے کہ آئندہ وہ کس رتبہ پر ہوگا، بخلاف حیوانوں کے کہ جو طریقے حفاظت نفس کے ان کی سب سے پہلی نسل میں مروج تھے، وہی اب بھی ہیں، ہرنوں کی سب سے پہلی ڈار، لٹھ چلانے والے انسانوں کو دیکھ کر بھاگی تھی، تو آج بھی جب کہ گولیوں سے انسان اس پر حملہ کرتا ہے، فرار کے علاوہ اور کوئی چیز وہ اپنے پاس نہیں رکھتے کہ فلاں چیز فطری ہے، نہ تمام موجودات کو عام ہے، نہ تمام ممکنات کو، نہ تمام جوہر کو، نہ دنیا کی ہر نوع کو، بلکہ اگر بعض چیزوں کی فطرت میں وہ چیز پائی جائے، تو اس جملہ کا مفہوم صحیح ہو جاتا ہے، پھر

اسی اصل کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اگر ہم سرور کائنات ﷺ کے اس کلام اقدس کا مقصد:

”عشر من الفطرة“

”دس چیزیں فطرت میں داخل ہیں۔“

صرف فطرت امت حنیفیہ، ملت ابراہیمیہ علی صاحبہا الف الف صلوات کے ساتھ مخصوص کر میں، تو اس کی غلط ہونے کی آخر کیا وجہ ہوگی؟ اور اسی خیال سے متاثر ہو کر حکیم الہند حضرت الامام المجدد، شاہ ولی اللہ دہلوی اس حدیث کے تحت میں ارقام فرماتے ہیں:

”اقول هذه الطهارات منقولة عن ابراهيم عليه السلام متداولة في طوائف الامم الحنفية، اشربت في قلوبهم ودخلت في صميم اعتقادهم، عليها محيلهم وعليها ماتهم، عصر ابعده عصر ولذلك سميت بالفطرة“.

”میں کہتا ہوں کہ یہ طہارات ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہیں اور ام حنیفیہ عام طور سے متداول ہیں، ان کے دلوں میں گویا یہ چیزیں پلا دی گئی ہیں اور اعتقادوں کی جڑوں میں رچ گئی ہیں، اسی پر ان کا مرما اور اسی پر جینا ہے، اسی لئے ان کو ”فطرة“ کہا گیا۔ (کہ فطرت کے معنی جبلت اور سرشت کے ہیں، پس چونکہ یہ چیزیں امت حنیفیہ کی سرشت میں داخل ہو گئی تھیں، اس لیے فطرت کا اطلاق اس پر صحیح ہوا)

آپ کے اس قول کا حاصل مطلب یہ ہے کہ فطرتی امور کے لیے یہ ضروری قرار دینا کہ وہ تمام موجودات، تمام ممکنات، یا کم از کم تمام افراد انسانی کی سرشت و فطرت میں داخل ہو، سراسر غلبہ ہے، بلکہ بجائے اترنے کے یوں سمجھو کہ فطرتی امور کی حقیقت صرف ان دو چیزوں سے تیار ہو جاتی ہے:

۱۔ کسی جماعت کسی امت، کسی طائفہ کی وہ عادت جو نسلاً بعد نسل منتقل ہو رہی ہو۔

۲۔ وہ ان کے دلوں میں رچی ہوئی اعتقادات کے اندر پیوست ہو گئی ہوں، مرنے جینے

و کسی میں نہ بھولیں۔

پس جو چیز ایسی ہے، وہ فطرتی چیز ہے اور چونکہ یہ باتیں امت ابراہیمیہ کے اندر اسی طرح موجود تھیں، اس لیے آپ نے فرمایا کہ ”عشر من الفطرۃ“۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ اس تشریح کے بعد فرماتے ہیں کہ اور ان چیزوں کو جناب نبی کریم ﷺ نے شعائر اسلامیہ میں سے قرار دیا۔

اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

- ۱۔ کسی ملت و مذہب کے لیے کسی خاص امتیازی نشانی کی کیا ضرورت ہے؟
- ۲۔ اور بالفرض اگر ضرورت ہو بھی، تو ان چیزوں کی تخصیص کیوجہ؟ شعائر اسلامی خاص کر کے ان چیزوں ہی کو کیوں قرار دیا گیا؟ شاہ صاحب پہلے سوال کا جواب ان مختصر الفاظوں میں دیتے ہیں:

”لیكون طاعتها وعصيا نها امر ا محسوسا“

”تاکہ طاعت و عصیان محسوس ہو جائیں۔“

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک شخص جب مسلمان ہوتا ہے، تو گویا وہ طواغیت و شیاطین، اصنام، اوثان، ذلیوتاؤں، دیویوں وغیرہ کی حکومت سے نکل کر خدائے واحد کی سلطنت میں داخل ہوتا ہے۔

بجائے معدوم چیز یوں، فرضی خداؤں کے، ملک قیوم کی رعیتوں میں شامل ہوتا ہے، گویا وہ پہلے اگر دھری تھا، تو اپنے بھیجے کی تموجات (عقلی فطریات) کا غلام تھا اور اگر کسی باطل مذہب کا پیرو تھا، تو پرندوں کی بیٹوں سے خراب ہونے والے درختوں، گھوروں پرانگے والے پیڑوں، یا پتھر کے چند ٹکروں، عورتوں کے شکم میں پیدا ہونے والے جہسوں، حیض کے خونوں سے بننے والے گوشتوں اور ہڈیوں کا حلقہ بگوش تھا، مگر ملت حنیفیہ ابراہیمیہ پر ایمان لانے کے ساتھ ہی وہ ذوالجلال والا کرام، خدائے یگانہ وقت و دوس، ملیک، مقتدر، لم یولد ولم یولد کے سرفروشوں اور بندوں میں داخل ہو جاتا ہے، اسی کو اپنے لئے عزت سمجھتا اور اس کا مایہ فخر و مباہات قرار پاتا ہے، وہ جس وقت گمراہوں کی جماعت پر نظر ڈالتا ہے، ان کی ابتری اور اپنی سلامت روی دیکھ کر جھومتا ہوا پڑھتا ہے:

﴿إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ﴾

رَبِّ الْعَالَمِينَ. لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ
الْمُسْلِمِينَ ﴿﴾ (الانعام: ۱۶۲، ۱۶۳)

”میری نمازیں، میری عبادتیں، میری زندگی، میری موت، خدا ہی کے لیے ہے، جو سارے عالم کا پالنے والا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔“

الغرض امت مرحومہ، ملت حنیفہ کا ہر فرد خداوند ذوالجلال کا غلام اور چا کر ہے۔

پس اب مجھے بتاؤ کہ کوئی غلام، اگر چہ اپنے دل میں آقا کی محبت رکھتا ہو، اس کا سینہ اس کی عزت و عظمت سے معمور ہو، اس کے رگ و پے میں جذبہ خلوص موجزن ہو، لیکن جس وقت کہ اس کا آقا لوگوں کے سامنے آتا ہے، تو وہ بجائے سلام کرنے کے اکڑتا ہے، وہ بجائے جھکنے کے بیٹھ پھیر کر کھڑا ہو جاتا ہے، بجائے سر ڈھانکنے کے کرتہ، پانچامہ سب اتار کر ننگا ہو جاتا ہے، کیا تم ایسے غلام کے آقا بنو، تو اپنے غیظ و غضب کو ایسی حالت میں دبا سکتے ہو؟ کیا اس کی ان بے ادبیوں پر اگرچہ تمہیں اس کے اخلاص کا یقین کامل ہے، منت بھر کے لیے بھی صبر کر سکتے ہو؟ پھر تم نے سمجھا کہ باوجود اس کے باطنی خلوص، اندرونی اعتقاد و عظمت، کے تم کیوں برا فروختہ ہوئے؟

صرف اس لئے کہ جن چیزوں کو وہ اپنے اندر رکھتا ہے، وہ تمہیں محسوس نہیں ہوئیں، نہ تمہاری عقل نے رہنمائی کی۔ وہ دو چیزوں کا مجموعہ ہے: روح اور جسم، تمہاری عظمت کامل اس وقت ہو سکتی ہے کہ اس کے ہر ہر جز پر تمہاری اقرار و عظمت پھیل جائے، نہ صرف جسم کے متاثر ہونے سے یہ بات کامل ہو سکتی ہے اور نہ صرف روح کے، بلکہ کمال بردہ کی اثر پذیری کے بعد ہوگا اور جب کہ تمہارے غلام کے لیے جو حقیقتہ تمہارا غلام نہیں، ضرورت ہے کہ اس کے ظاہر و باطن ہر دو پر اثر انقیاد و اطاعت طاری ہو، تو پھر خدائے کامل تو اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کے غلام اس کی اطاعتوں کو کامل طور سے نمایاں کریں، روح کو انوار خلوص و اعتقاد سے چمکائیں اور جسم کو شعائر مقررہ و عبادات جسمانیہ سے آراستہ و مزین بنائیں۔

الغرض اس طویل تقریر سے مقصد ضرور حاصل ہو جاتا ہے کہ حقیقت، اطاعت کی مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ظاہر کو باطن کے ساتھ شریک نہ کیا جائے۔

اور یہی وجہ ہوئی کہ مسلمانوں کے لیے ایک خاص شعار مقرر کر دیا گیا، تاکہ یہ محسوس ہو جائے کہ فلاں شخص کی اطاعت ابھی ناقص اور معصیت کے ساتھ ملی ہوئی ہے کہ اس نے اطاعت کے تمام اجزاء کا استقصاء نہیں کیا اور انشاء اللہ تعالیٰ یہی مراد ہے حضرت شاہ صاحب کے اس کلام سے:

”لیکون طاعتها و عصیا نہا امر محسوسا“

”تاکہ طاعت و عصیان محسوس ہو جائیں۔“

علاوہ اس کے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ باطن کے حالات سے صرف خدا واقف ہوتا ہے اور مقصد الہی یہی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ دوسرے بھی محسوس کریں کہ فلاں شخص میرے رقبہ غلامی میں داخل ہے اور فلاں نہیں ہے اور اسی لئے ایک خاص شعار کو مشروع کیا گیا اور میرا خیال ایسا ہے کہ مشروعیت شعار کا الہی راز یہی ہے۔ اس کے بعد شاہ صاحب کی دوسری وجہ بھی قابل ذکر ہے، جو موجودہ مذاق سے زیادہ اقرب ہے، جسے میں بعض نسخوں کی بنا پر الگ علت قرار دیتا ہوں۔

”یعرفون بہا ویواخذون علیہا“

”پہچانے جائیں اس کی وجہ سے اور مواخذہ کریں غیروں سے اس پر۔“

اس عبارت کے سمجھنے کے لیے ذیل کے مقدمات ذہن نشین کر لینا چاہئے۔

۱..... قومی اختلافات، مذہبی مناقشے کبھی نہیں مٹ سکتے کہ تجربات اور بعض الہی اغراض اسی کی مقتضی ہیں۔

۲..... مدینہ و حضارہ، جس پر بناء حیات انسانی ہے اور بغیر تعاون و تناصر کے قائم نہیں رہ سکتی۔

۳..... اپنی قوم، اپنے ہم مذہب لوگوں سے جو معاونت و ہمدردی حاصل ہوتی ہے، وہ بہر صورت قوم کے افراد سے ناممکن ہے۔

۴..... اور ظاہر ہے کہ ایک قوم، ایک مذہب کے ہر فرد کا اپنے دوسرے افراد سے واقف ہونا ضروری نہیں۔

۵..... اور معاونت قومیہ کا مدار اسی پر ہے کہ پہلے معلوم ہو کہ وہ ہماری قوم کا ہے۔

ان چند مقدمات کے تسلیم کر لینے کے بعد، جن میں بعض برہانی اور اکثر تجربیات سے حاصل ہوئے ہیں، ماننا پڑتا ہے۔ کہ شعار ہر ایک امت، ہر ایک قوم کے لیے بہت ضروری ہے، نہ صرف مسلمانوں کو اس کی ضرورت ہے، بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر مذہب کو اس سے چارہ نہیں، جیسا شاہ صاحب عام طور پر نصیحت فرماتے ہیں:

”ولا بدل کل امة من شعائر“

”ہر قوم کے لئے شعار کا ہونا بہت ضروری ہے۔“

کہ بغیر اس کے قوموں، امتوں کے درمیان باہمی تفاوت نہیں رہ سکتا، بجز شعار کے اور کیا چیز ہو سکتی ہے، جس کے ذریعے سے ہم اپنے ہم قوم کو غیر قوم سے الگ کر لیں گے؟ آنکھ، ناک، کان میں تمام انسان برابر ہیں، رنگ کا تفرقہ اس وقت مفید ہو سکتا ہے، جب کہ ملکی سوال ہو اور یہاں کلام مذہبی تمیز میں ہے، پھر مذہب کو تو کسی رنگ سے تعلق نہیں، اسی لئے شاہ صاحب نے فرمایا:

”يعرفون بها ويواخذون عليها“

یعنی: شعار ایک معیار ہوگا، جس پر ”ہم قوم“ کو غیر قوم سے تمیز بخشا جاسکتا ہے، جو اس شعار میں نظر آئے، اسے اپنا جان لینا چاہئے اور جو اس میں نہ ہو، اسے اپنی مخالف قوموں کا آدمی سمجھ کر اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا چاہئے۔

ابھی تک جو کچھ تفصیل و تشریح تھی، وہ محض پہلے سوال کا جواب تھا کہ شعار کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اب میں دوسرے سوال کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ اگر شعار کی ضرورت تسلیم کر لی جائے، تو پھر انہیں خاص چیزوں کو آنحضرت ﷺ نے کیوں شعار مقرر فرمایا؟

حضرت شاہ صاحب نے اس جواب کو نہایت ہی مختصر، لیکن جامع بیان میں ادا کیا ہے، جس کی شرح میں خیال کے اعتبار سے یہ ہے کہ ”شعار قومی کے معنی ایک علامت و نشان خاص کے ہیں، جسے کوئی قوم اپنے لئے مخصوص کرے، اور واقعہ یہ ہے کہ امتیازی علامت جس طرح ناخونوں کے کٹانے سے حاصل ہو سکتی ہے، تو بڑھانے سے بھی ممکن ہے کہ یہاں مقصود امتیاز ہے اور وہ ہر حال میں حاصل ہے۔“

مسلمان اگر موٹھوں کے کٹانے سے امتیاز حاصل کرتے ہیں، تو ناک شاہی لوگ سکھ

ان کے بڑھانے کی وجہ سے ممتاز ہیں اور اسی پر کیا منحصر ہے، اگر مقصود صرف امتیاز ہے، تو سر پر ایک ہانڈی، یا ہاتھ میں کسی قسم کا لوہا، یا گلے میں کوئی دھاگہ، یا دیجی، یا چھتھرا ڈال دینے سے بھی بخوبی میسر آ سکتا ہے اور تم بسیط ہند کی قوموں پر نظر ڈالو، کیا یہاں کی قوموں نے اپنے لئے اسی قسم کی چیزوں کو نشان قومی نہیں مقرر کیا؟ مگر دین کامل، ملت ظاہرہ میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ انکل پچو محض امتیاز کو (خواہ امتیاز کامل، یا ناقص) پیش نظر رہ کر کسی خاص شعار کو مقرر کر دے، جیسا کہ اوروں نے کہا۔

یہ نہیں ہو سکتا، بلکہ جہاں اسے شعار سے امتیاز کا فائدہ حاصل کرنا منظور ہے، وہیں اور منافع سے یہی بنی نوع انسان کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ اس نے شعار کے لیے چند اصول مقرر کئے، پس جو چیزیں کہ اس اصول کے ماتحت نظر آئیں، خاص کر ان کو چن لیا۔ ہم ان اصولوں کو ذیل کے نمبروں میں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ شعار ایسی چیزوں کو مقرر کرنا چاہیے، جن سے حقیقت امتیاز پورے طور سے مکمل ہو سکتی ہو، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اور حقیقت امتیاز کی تکمیل کے لیے تین باتوں کی اشد ضرورت ہے:

(۱) ماکثر وجودہ: جس کا وجود بہت ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے حصول میں دقت نہ ہو، دستیابی اس کی ہر شخص کے لیے تقریباً ممکن ہو، مثلاً: اگر کسی نے سونے کا کٹھ، یا جوہرات کسی چیز کو قومی نشان قرار دیا، تو ”علم الاقوام“ کے عمرانی کے نشیب و فراز، تفاوت ہائے غربت، و امارت سے ناواقف ہے۔ ناممکن ہے کہ کسی چھوٹی سی چھوٹی قوم کا ہر فرد سونے چاندی کی چیزوں پر قادر ہو سکے اور نہ صرف سونا چاندی، بلکہ وہ جو ”علم المدن“ کے باہمی تفرقوں کے ماہر ہیں، جانتے ہیں کہ بسا اوقات کسی قوم کے ہر فرد میں لوہے، تانبے حتیٰ کہ کبھی تو کپڑے کی بھی استطاعت نہیں رہتی، اس لئے ضرورت ہے کہ ”شعار“ ایسی چیزیں مقرر کی جائیں، جن کا وجود بکثرت ہو۔

(۲) ماتکرر وقوعہ: جو واقع بھی بکثرت ہو سکتے ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ بسا اوقات کسی قوم کا کوئی فرد بوجہ طغیان و سرکشی، یا بوجہ صحبت اغیار کے اپنے قومی نشان کو چھوڑ بیٹھتا ہے، پھر اکثر ایسا ہوا کہ تھوڑے دن کے بعد اس کی حالت

درست ہو جاتی ہے، اگر پہلے مذہب و قوم کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، تو اب اس سے زیادہ کوئی چیز اسے محبوب نظر نہیں آتی، اب اس کا دل ہر قومی چیز، مذہبی علامت کو پیار کرتا ہے، وہ مضطر ہو کر ٹھیٹھ ویسا بننا چاہتا ہے، جیسا کہ اس کے اور ہم قوم اپنے صحیح مذہبی تعلیمات، قومی روایات پر قائم ہیں۔

پھر فرض کرو کہ اگر اس قوم کا شعار ایسا ہوا، جو اب دوبارہ اسے حاصل نہیں ہو سکتا، تو اسے کس درجہ رنج ہوگا!... علاوہ اس کے شعار کے وہ فوائد جسے گذشتہ نمبر میں بیان کر چکا ہوں، وہ مفقود ہو جائیں گے، مثلاً: کسی قوم نے دانت رکھنے کو اپنا شعار مقرر کیا اور اتفاق سے اس قوم کا کوئی فرد امریکہ پہنچ کر اپنے اگلے دو دانتوں کو اکھڑا دیتا ہے، جیسا کہ وہاں کی رسم ہے، پھر جب اپنے وطن کو واپس آتا ہے، تو اسے اپنی قومی بانے کا شوق ہوتا ہے، لیکن کیا اب پھر وہ دوبارہ اسے حاصل کر سکتا ہے؟

علاوہ اس کے چونکہ دانت اکثر بڑھاپے میں گر پڑتے ہیں اور اس طرح کہ پھر دوبارہ نہیں نکلتے، تو جتنے بوڑھے ہوں گے، اس قومی نشان سے محروم ہو جائیں گے، بخلاف ڈاڑھی کے کہ مثلاً: جو شخص اسے برا سمجھ کر غیر قوموں کی ریس میں آکر اسے منڈاتا ہے، اسے جب کبھی مذہبی جوش، قومی محبت اس شعار کے حاصل کرنے پر ابھارے گی، وہ چند ہفتوں میں حاصل کر سکتا ہے۔

(۳) ویکون ظاہراً: اسے باطنی چیز نہیں ہونا چاہئے، بلکہ اس کا تعلق ظاہر سے ہو۔ وجہ یہ ہے کہ اگر بعض فانی چیزوں کو مثلاً: عقائد و خیالات کو شعار مقرر کر لیا جائے، تو اس سے تکمیل امتیاز کیا، سرے سے امتیاز ہی حاصل نہیں ہو سکتا، بخلاف اس کے کہ اس کا تعلق ظاہر اعضا سے ہو، تو وہ چیز محسوس ہوگی، اس سے بقدر اس کے ظہور کے امتیاز میں مدد ملے گی، مثلاً: بغلوں کے منڈانے میں امتیاز ضرور ہے کہ کپڑا اتار کر معائنہ کیا جاسکتا ہے، مگر چونکہ اس میں بہ نسبت ڈاڑھی کے پوشیدگی ہے، اسلئے اس کا امتیاز لامحالہ ڈاڑھی کے امتیاز سے کم ہوگا، مگر ہوگا ضرور کہ وہ محسوس چیز ہے۔

الغرض مقصود یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے امتیازی خیالات، اچھوتے عقائد کو اگر شعار مقرر کر کے قاعدت کرتا ہے، تو وہ امتیاز کی حقیقت اور شعار کے فوائد سے ناواقف ہے۔ یہ

تین چیزیں تو وہ ہیں، جن سے نفس حقیقت امتیاز کی مکمل ہوتی ہے، جو اصول شعار کی پہلی اصل ہے۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب قدس سرہ دوسری اصل کو ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں:

”وفیه فوائد خمسۃ یقبلہ اذہان الناس اشد قبول“۔

”اور اس میں فوائد کثیرہ ہوں، جسے لوگوں کی طبیعتیں اچھی طرح قبول کر لیں۔“

حاصل اس کا یہ ہے کہ اگر محض شعاز سے امتیاز کا فائدہ حاصل کیا گیا، تو یہ کوئی بات نہیں، بلکہ جہاں امتیاز مقصود ہو، وہیں بہت ضرورت ہے۔ وہ چیزیں ایسی ہوں جو انسانوں کے حق میں جسمانی، یا روحانی طور پر مفید ہوں، اس کے علاوہ اس کے کہ یہ ”ایک کرشمہ برآبد و کار“ ہے، خود امتیاز کے مقصد کو بھی مدد ملتی ہے، اسلئے کہ جب وہ چیزیں منافع عامہ، و فوائد بشریہ پر مشتمل ہے، تو لامحالہ لوگوں کے دل اس کی طرف مائل ہوں گے کہ انسان کی طبیعت اپنے فوائد کی طرف فطرۃً متوجہ ہوتی ہے، تو اس توجہ کے کم افراد ایسے رہیں گے، جو ان شعاز کو اپنے لئے مخصوص نہ کریں گے، کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر وہ صرف نشان قومی ہوں اور اس میں اور فوائد انہوں نے جیسا کہ گلے میں ایک دھاگہ ڈال دینے سے، یا سر پر ٹیک رکھنے میں بجز امتیاز کے اور کوئی فائدہ نہیں، یا بجائے فائدہ، اذیت ہو جیسا کہ جسم کے اندر بڑے بڑے بال رکھنے سے بجائے فائدہ کے سراسر نقصان ہے، جیسا کہ عنقریب ہم اسکو مفصلاً بیان کریں گے، تو ان کی طرف وہی لوگ جھک سکتے ہیں، جن کے دل میں الفت تو میری ہوئی ہو کہ اس کے علاوہ اور دوسری چیز ان کو ادھر ابھار نہیں سکتی، بخلاف ان کے جن کے دل و دماغ میں قومیت، مذہب کی وقعت مضحکہ منگنی ہے، وہ بلاوجہ اس کی طرف کیونکر متوجہ ہونے لگے۔ ہاں! اگر اس میں اور بھی منافع و مصالح پوشیدہ ہوں، تو ان کی جبلت اس کے اختیار پر مجبور کرے گی اور اس صورت میں پوری قوم کی قوم، غیروں سے ممتاز ہو جائے گی، بخلاف اولیٰ کے بہت سے لوگ بغیر اس امتیاز کے رہیں گے، جن سے مقدار امتیازی گھٹ جائے گی۔

الغرض ”شعرا کامل“ کی نصدق وہی چیزیں قرار پاسکتی ہیں، جن کو حصول امتیاز میں کامل طور سے دخل ہو اور ساتھ ہی وہ اور فوائد کو بھی اپنے اندر سیٹھے ہوئے ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ شارعِ اسلام علیہ والصلاۃ والسلام نے جن چیزوں کو مسلمانوں کے لیے مذہبی نشان، قومی شعار قرار دیا ہے، ان میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں، یا نہیں اور اسی کے بعد بحث کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے خود اس پر بحث فرمائی ہے، میں اسی کی شرح کرتا ہوں، ان مضامین کو درج کرتا ہوں۔

(۱) ”حدیثِ شعار“ میں پہلی چیز قص الثارب (موچھیں کٹانی) ہے۔ اب اس پر مفصلہ بالا اصول کے اعتبار سے روشنی ڈالو۔

پہلی بات یہ تھی کہ وہ اکثروں کو میسر آ سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ موچھیں کٹانی کس کو میسر نہیں آ سکتی ہے، وہ سونے، چاندی، لوہے، تانبے، کپڑے کی طرح نہیں، جن کی استطاعت اکثروں میں نہیں ہوتی۔ الغرض اس میں تو وہ کامل ہے۔ اسی طرح دوسری بات، یعنی: اس کا وقوع بکثرت ہو۔ کیا شبہ ہے کہ انسان مکلف ہر حال میں اس کے کثرت وقوع کے کٹانے پر قادر ہے۔ تیسری بات کہ وہ ظاہر ہو، محسوس ہو، تو تراشی ہوئی ہوئی موچھوں سے بڑھ کر اور کیا چیز محسوس و ظاہر ہوگی....!! اسی طرح اس کے کٹانے میں جتنے منافع ہیں، سچ تو یہ ہے کہ اگر لوگوں کو وہ معلوم ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں اس سے اعراض کریں۔

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں، جس کا ما حاصل ادنی وضاحت کے ساتھ یہ ہے: ”جن کی موچھیں بڑھ جاتی ہیں، تو پانی، غذا وغیرہ ان کے بالوں میں پھنس کر متعفن مادے زہریلے کیڑوں کو پیدا کرتے ہیں، پھر چونکہ اتفاق سے وہ ٹھیک اس گذرگاہ پر واقع ہوتے ہیں، جن سے انسان سانس لیتا ہے، جو براہ راست پھیپھڑے وغیرہ میں پہنچتی ہے، جس کے پاس ہی قلب ہے اور اسی طرح اسکو تعلق قریبی دماغ سے بھی ہے، تو بسا اوقات ان دونوں عضورئیس کو اس سے نقصان پہنچتا ہے اور پھیپھڑے تو یقیناً چند دنوں کے بعد اکثر کے خراب ہو جاتے ہیں، جسے آئے دن سل و دق کی صورتوں میں ہم دیکھتے ہیں“۔

اخیر میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ: ”یہ شعار ہے اور شعار کا مقصد امتیاز ہے، تو جو چیز عام ہو، دوسری تو میں اسے کرتی

ہوں، وہ کس طرح امتیاز بخش سکتی ہیں، تو پھر مونچھیں بڑھانی کیونکر شعرا مقرر کی جاسکتی تھی کہ زمانہ نبوی میں بھی مجوسیوں کا یہ طریقہ تھا۔
اسی واسطے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

(خالفوا علی المشرکین قصو الشوارب) (الحديث)

”مشرکین کا خلاف کرو، یعنی: مونچھیں کٹاؤ۔“

(۲) دوسرا جزاء عفاء اللحمیہ (بڑاڑھیاں بڑھانی) ہے۔ اس میں بھی وہ تمام اصولی خصائص بوجہ اتم پائے جاتے ہیں، باسانی اکثریوں کو میسر بھی آسکتی ہے، اگر موٹڈی گئی، تو فوراً حاصل بھی ہو سکتی ہے، ظہور میں تو اس کے شبہ ہی نہیں کہ انسان کے تمام بدن میں جو چیز کھلی رہتی ہے، اس میں چہرہ سب سے پہلے نمبر میں ہے اور چونکہ ڈاڑھی کا مقام چہرہ ہے، تو اس کا ظہور بھی یقیناً اور تمام چیزوں کے ظہور سے زیادہ ہے۔ رہا یہ کہ ڈاڑھی کے منافع و فوائد کیا کیا ہیں، یہ ایک مستقل بحث کی صورت رکھتی ہے اور ممکن ہے کہ مرتبہ تفصیل میں ایک طولانی دفتر کی شکل اختیار کر لے۔

اس لئے بظنر اختصار ہم محض ان توضیحات و کنایات پر اس مقام میں اکتفا کرتے ہیں جو حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی عبارت سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ آپ کے کلام سے میں نے جو کچھ سمجھا ہے، وہ ذیل کے نمبروں میں بیان کئے جاتے ہیں:

(۱) اپنی ہستی کا احساس گواہی علم بدیہی ہے، ہر شخص جز زندہ ہے، جانتا ہے کہ میں موجود ہوں، تاہم بسا اوقات جن کے صفات و کمالات جس احساس کے مقضی ہوتے ہیں، اس سے اکثر اشخاص غافل ہو جاتے ہیں اور نہ صرف یہ اشخاص و افراد تک محدود ہے، بلکہ دیکھا گیا ہے کہ کسی خاص جمودیکیت و زلی کی وجہ تو موموں اور امتوں پر بھی یہ حالت طاری ہو جاتی ہے، وہ نہیں سمجھتے کہ میں کون ہوں؟ اور کہاں ہوں؟ کس مرتبہ پر مجھے رہنا چاہئے اور آج میں کس رتبہ پر ہوں؟

ایک شخص اپنے سینے میں شاعرانہ طبیعت رکھتا ہے، اس کے دماغ میں لطیف جذبات نمودار ریزیاں کرتے ہیں، درختوں کی سبزی، گھانسون کی لاجوردانہ فراشی، پانیوں کی نزہت انوار وانی، کرنوں کی موجوں کے ساتھ طرب انگیز قلابازی ان تمام فطری مناظر سے وہ

متاثر ہوتا ہے، لیکن وہ غافل ہوتا ہے کہ آخر میں کیا کرنا چاہتا ہوں اور میری طبیعت کس مرتبہ کی مقتضی ہے؟ مجھے کیا بننا چاہیے؟

اسی طرح اکثر اہل کمال اپنے کمال کے مرتبہ سے محض ناواقف ہوتے ہیں، اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ نہیں سمجھتے کہ اس کمال کی قدر کیونکر کی جاتی ہے، حتیٰ کہ وہ برباد ہو جاتا ہے اور قوموں کے ابھرنے، بگڑنے، گرنے اور سنہلنے کا تو سارا اسرار اسی میں پوشیدہ ہے کہ جب تک انہیں اپنی ہستی کے مراتب کمالیہ کا احساس رہا، وہ اس وقت ان اعمال و وظائف کے پابند ہوتے ہیں، جو ارتقا، عروج کے بنیاد، اساس قرار دیئے گئے ہیں اور پھر جس وقت اس احساس کا فقدان شروع ہوتا ہے، پھس و ہی دن ہوتا ہے کہ ان کے دلوں اور جسموں سے وہ مقررہ چیزیں ایک ایک کر کے الگ ہونی شروع ہوتی ہیں، حتیٰ کہ ایک وہ وقت آتا ہے جب کہ ان کے پاس بجائے سب کچھ ہونے کے کچھ نہیں رہتا۔ اسی کے بعد ان کی دیوار عظمت یکا یک سرسجود ہو جاتی ہے۔ قرآن میں بار بار اس کا ذکر کر کے اللہ نے فرمایا:

﴿كَذَلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ﴾ (الدخان: ۲۸)

”ایسا ہی ہے، پھر ان کے وارث دوسری قوم کو ہم بنادیتے ہیں۔“

اسی طرح اس میں کوئی شبہ نہیں ایک شخص جب جوان ہوتا ہے اس پر کبر سنی طاری ہوتی ہے، تو فطری طور پر اس کا اقتضا ہونا چاہئے کہ وہ سمجھے میں بڑا ہو گیا ہوں، مجھ پر اب وہ فرائض عائد ہیں، جو ایام طفلی میں نہ تھے، میری تمام حرکات نشست و برخاست، بات چیت، معاملات، مخاصمات کے قوانین اب ان ضوابط سے بالکل الگ ہیں، جن کی ماتحتی میں بچپن کا زمانہ بسر ہوا، لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کبھی اپنی ہستی کے خصوصیات و کمالات سے انسان غافل ہوتا ہے، اپنے مراتب و مدارج سے اقوام و امم بے خبر ہو جاتی ہے۔

اسی طرح کبھی کبھی کیا اکثر بہت سے پیر نابالغی کے مدعی ہوتے ہیں، بہت سے جوان جنہوں نے تیس چالیس کی مسافت قطع کر لی ہے، وہ اکثر طفلی نگشت کے پورے مصداق بنے رہتے ہیں، ان کی ہر ادا ان کے ہر فعل رفتار و گفتار طرز و طریقہ سب ہی میں صاف صاف طفلگی کے آثار نمایاں ملرز پڑ پائے جاتے ہیں، وہ بالکل نہیں سمجھتے کہ میرے فرائض و مناصب کے یہ چیزیں خلاف شان ہیں، جس سے تمدن و عمران کے اجتماعی ایوان کو

بسا اوقات سخت صدمہ پہنچتا ہے، ان کی ماں بھوکی مرتی ہے، چہل سالہ صاحبزادے صاحب چونکہ اپنے کو چار سالہ خیال فرماتے ہیں، اسلئے بجائے مسکینہ ماں کی مدد کرنے خود اس کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور میں نے تو سنا ہے بہت سے ایسے حضرات کھانے پینے، روپے پیسوں کے لیے اپنی اماں جان کے پاس جا کر ٹسوںے بھی بہاتے ہیں۔

پھر اسی طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں، جس کے بعد جن برے نتائج کا ظہور ہوا ہے، وہ اضطراری افلاس کی تاریخ پڑھنے سے بخوبی واضح ہو سکتے ہیں، پس جب کہ ایک شاعرانہ طبیعت رکھنے والے آدمی کے لیے ناگزیر ہے کہ کوئی مسلح ملے، اپنی اسلحہ تذکیر و وعظ، تحریر و تقریر سے مسلح ہو کر اپنی قوم کو اس کی ہستی کا احساس کرائے، تو اسی طرح کبر سنی کے احساس کرانے کے لیے بھی واجب ہونا چاہئے کہ کوئی چیز ہو، جو ہمیشہ ہمیشہ اسے اس کی ہستی کے احساس پر ابھارے، اسے جتلانے کہ تم اب بچے نہیں رہے، تمہاری عمر زیادہ ہو گئی، تمہارے وظائف و اعمال کی نوعیتوں کو اب بدل جانے چاہئیں، ممکن ہے کہ یہ اور چیزوں سے بھی حاصل ہو سکتی ہو، لیکن غور کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاڑھی جس طرح انسان کو اس مسئلہ کی طرف اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، غرض ہر وقت ہر آن میں تنبیہ کر سکتی ہے، شائد اور کسی چیز سے ممکن نہیں۔ علی الخصوص جب کہ وہ بحیثیت امتیاز کے ایک زبردست شعار ہونے کے بھی صلاحیت رکھتی ہے اور انشاء اللہ یہی مقصد ہے حضرت شاہ صاحب کی اس عبارت کا:

”فہی الفارقہ بین الصغیر والکبیر“

”ڈاڑھی صغیر و کبیر کی ہستیوں میں تفرقہ قائم کرتی ہے۔“

اور غور کرنے والے کے لیے تو شاہ صاحب کی اس عبارت میں اس سے زیادہ دقائق مضمحل نظر آتے ہیں، لیکن چونکہ ان کی وضاحت کے لیے بعض ادق علمی مسائل کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے، اسلئے ہم صرف ایک اور معمولی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں، غور کرو شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ڈاڑھی کبیر (بڑوں) اور صغیر (چھوٹوں) میں امتیاز پیدا کرتی ہے، یہ نہیں کہا کہ صبیان (بچے) اور شباب (جوان) اس کی وجہ سے تفرقہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی صغیر و کبیر کے لفظ سے گویا وہ ایک معاشرتی مسئلہ کی طرف اشارہ کر گئے، جس کا ما حاصل یہ

ہے کہ فلسفہ تہذیب و معاشرت کا یہ مسلم اصولی ہے کہ ”چھوٹوں کو بڑوں کی عزت کرنی چاہئے، ان کے واسطے فلسفہ تہذیب نے خاص خاص ضوابط و قوانین ہر ملک میں اس اعتبار سے وضع کئے ہیں، پھر صغیر و کبیر کے مراتب متفاوت ہیں اور ہر مرتبہ علیحدہ علیحدہ تہذیبوں کا طالب ہوتا ہے، جیسا کہ عام طور پر ہر ایک شخص جانتا ہے شریعت نے بھی اس قانون کو عزت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا:

(ان فنزل الناس منازلہم) (مسلم)

”لوگوں کو ان کے مرتبہ پر اتاریں۔“

میں اس کی خاص طور پر تاکید ہے۔

(عظمو اکبراء کم)

”عظمت کرو اپنے بڑوں کی۔“

میں بھی اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بہر کیف جب کہ یہ مسلم ہے، تو اب فرض کرو کہ تمہارے سامنے ایک شخص آتا ہے، جو تم سے عمر میں بڑا ہے، مثلاً: تم بیس برس کے ہو اور وہ تیس پینتیس کا ہے، لیکن چونکہ اس کے چہرے پر ڈاڑھی نہیں ہے، اسلئے بمشکل اس کا امتیاز ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے برابر ہے، یا تم سے بڑا ہے۔ اگر خدا نخواستہ برابری کا خیال پیدا ہوا، تو لامحالہ تمدن کے مروجہ قانون کی حیثیت سے تم اس کی حیثیت کے موافق تعظیم نہ کر سکو گے، جس کی وجہ سے علاوہ ایک فرض منصبی کے چھوٹ جانے کی بسا اوقات نقصان اٹھانا پڑتا ہے، بنتا ہوا کام بگڑ جاتا ہے۔

الغرض تمدن کے اس قاعدہ کی نگہداشت اگر ممکن ہے، تو ڈاڑھی کی صورت بخوبی ہو سکتی ہے اور وہی اس کی اکیلی نگہبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ڈاڑھی کے حکم و فوائد

سچ تو یہ ہے کہ اگر نظام تمدنی و آئین معاشرت کی اصلاح و شائستگی کے اندر ڈاڑھی کے چند بالوں سے اگر اتنی بھی مدد ملتی ہے، جسے تم گذشتہ صفحات میں پڑھ آئے، تو یقیناً اس کا بار

اتنا گراں نہیں رہتا، جتنا کہ اور قوموں نے سمجھ رکھا ہے، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ملت حنیفہ کا کوئی تیج محض اسی وجہ سے اگر اپنے اس شعار کو دنیا کی اور تمام شعائرِ قومیہ، مذہبی وضع کے مقابلے میں پیش کر کے ”کنتم خیر امۃ“ (تم دنیا کی بہترین امت ہو) کے دعویٰ کو مدلل کرنے کی جرات کرے، تو بصد فراخ دلی کر سکتا ہے کہ وہ اس کا مستحق ہے اور کوئی اس استحقاق کو اس سے نہیں چھین سکتا۔

اوروں کا حال تو ابھی تک معلوم نہیں، لیکن خود میرا دل تو صرف اسی نکتہ کی وجہ سے بہت کچھ مطمئن ہے، حتیٰ کہ اگر میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا شارح نہ ہوتا، تو صرف اسی پر قناعت کر لیتا کہ ”کردم اشارتے مکرر نے کتم“ میری عادت ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ شاہ صاحب کا قلم جیسا کہ مباحثِ مشککہ کی تفصیل و توجیہ میں نہیں تھکنا، یہاں بھی اس کی یکہ تازی وہی ہے، اسلئے میں اضافہ پر مجبور ہوں۔

آپ کے کلام کی دو شرحیں ہو سکتی ہیں، ایک تو ظاہر ہے اور اسی کو میں مقدم کرتا ہوں، فرماتے ہیں:

”وہی تمام ہیئتہم“

”اور ڈاڑھی مرد کی صورت کو مکمل کرتی ہے۔“

مطلب کو ذہن نشین کرانے سے پہلے ایک مثال سمجھاتا ہوں۔ ”ایک درزی شیروانی بیٹا ہے، ظاہر ہے، کرتہ، قمیض اچکن وغیرہ میں وہی کپڑے استعمال کئے جاتے ہیں، جو شیروانیوں کے لیے مستعمل ہیں، لیکن چونکہ اچکن اور شیروانی کی صورت اور ہیئت میں فرق ہے، اس لئے درزی شیروانی کے مناسب اس کی قطع برید کرتا ہے، پہلے وہ آگے پیچھے آستین وغیرہ کو بیٹتا ہے، پھر اس کے بعد اخیر میں کارل وغیرہ بناتا ہے، یا ایک معمار کسی کوٹھی، یا بنگلہ کو تیار کرتا ہے، تو پہلے اس کی دیوار کو اس کی نوعیت کے موافق بلند کرتا ہے، پھر چھت پاتا ہے، حتیٰ کہ کنگرے وغیرہ وغیرہ تعمیر کر کے کہتا ہے کہ کوٹھی کی تعمیر تیار ہو گئی۔“

اب فرض کرو کہ شیروانی کا مالک اس غریب درزی پر بگڑ کر کہتا ہے کہ یہ تم نے کیا کیا...؟ اس کے اندر دو آستین لگا دیں اور حکم کرتا ہے کہ ایک آستین اس کی اڑادو، تو کیا تم ایسے مجنون و دیوانہ نہ قرار دو گے؟ یا اسی طرح مالک مکان معمار کو اجرت اسلئے نہیں دیتا کہ

اس نے مکان کی چھتوں کو کیوں پانا، اس پر خوبصورت کنگرے کیوں بنائے؟ تو کیا ایسے شخص کی عقل پر آفت و مصیبت کا شبہ نہیں؟ اور اگر ہے اور ہونا چاہئے، تو تم کو سمجھنا چاہئے کہ مردوں کی ہیئت جو قدرت نے تیار کی ہے، اس کی ابتداء گوماں کے پیٹ سے ہوتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ آخر جوانی کے زمانے میں ایوان رجولیہ کی تکمیل ڈاڑھی کے اوپر ختم ہو جاتی ہے، پس جو شخص استروں کی کھلاڑیوں سے اسے ڈھادیتا ہے، اس شخص کی مانند نہیں جس نے اپنی شیروانی کی ایک آستین کٹوا دی تھی اور اسی کو پہن کر بازاروں میں پھرتا اور سڑکوں پر ٹہکتا تھا، یا وہ اس شخص سے کسی طرح کم ہے، جس نے خواہ مخواہ اپنی کونھی کی چھتیں کھلوا دیں اور اس کے کنگرے گرا دیئے اور یہی مطلب ہے اس جملہ کا: ”وہی تمام صیغہ“۔ (اور ڈاڑھی مردوں کی ہیئت کو تمام کر دیتی ہے)، پس جو شخص اس کو ضائع کرتا ہے، اپنی ہیئت برباد کرتا ہے، جیسا کہ ایک آستین کی شیروانی والا اپنے لباس کو بگاڑ بیٹھا تھا۔

کہا جاسکتا ہے کہ یہی شبہ مونچھوں کے کٹانے پر بھی وارد ہو سکتا ہے کہ وہ بھی مردوں کی شکل و صورت کے جزء ہیں، ان کا کاٹنا بھی ایسا ہی ہے، جیسا کہ شیروانی سے کسی آستین کو کاٹ دینا، اگر ڈاڑھی کے صاف کرانے سے مردانہ صورت بگڑ جاتی ہے، تو یہی حال مونچھوں کا بھی ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ شاہ صاحب کا کیا مقصد ہے؟

میں جہاں تک سمجھتا ہوں آپ کی غرض یہ ہے کہ کمال ہر چیز کی نقص سے بہتر ہے اور یہ بطور علوم متعارفہ کے عام طور سے مسلم ہے، حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ کمال تو چوری اور ترقی کا بھی کمال ہے اور اسی بنا پر آستین کٹی ہوئی شیروانی ناپسند سمجھی جاتی ہے کہ وہ کامل نہیں، بے چھت کا مکان بنے کا قرار دیا جاتا ہے کہ تعمیری تکمیل اس کی نہیں ہوتی ہے اور ڈاڑھی کے صاف کرانے پر جو اعتراض ہے، وہ بھی یہی ہے کہ اس سے بھی جنس ذکر کی صورت ناقص ہو جاتی ہے اور یقیناً یہی مرتبہ مردانہ شکل و صورت میں مونچھوں کو حاصل ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر کمال قابل عمل کرنے اور برتنے کی ہے؟ اور اگر ہے، تو پھر ڈاکٹر کبھی دو پاؤں والے انسان کو یک پایہ کیوں بنا دیتے ہیں؟ حالانکہ یقیناً دو ٹانگیں بہ نسبت ایک کے جسم انسانی کے لئے کمال ہیں۔

بلکہ اصل یہ ہے کہ نہ نپاں سے نہ، یا روخ تمدن و تہذیب معاشرت باہمی وغیرہ کی

کسی شاخ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، وہ کمال نہ صرف قابل اعراض و ناالتفاتی ہے، بلکہ مصلح کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اسے ممنوع قرار دے۔

یقیناً سحر ایک کمال ہے اور اعلیٰ کمال ہے، لیکن شارع علیہ السلام اسے حرام قرار دیتے ہیں کہ اس سے امن عام میں برہمی کا سخت اندیشہ ہے، وہ ایسے مخفی اسباب و آلات پر مبنی ہے کہ پولیس کی رعب و داب نہ اسے دبا سکتی ہیں اور نہ ساحر کو اپنے دشمن کے مقابلہ کا خوف ہوتا ہے، بے چارہ ڈاکٹر بھی اسی لئے ہاتھوں کو کاٹتا، اور ناگوں کو اڑاتا ہے کہ اس کمال سے بقیہ اعضاء پر بڑا اثر پڑے گا، اس کے زہریلے زخم اپنی جراثیم کو اور دوسرے صحیح و سلام حصے تک پھیلا دیں گے، پس ایسے کمال سے نقص ہزار گنا بہتر ہے۔ اسی طرف میں مانتا ہوں کہ موچھوں سے مردیت کی حقیقت زیادہ شگفتہ ہوتی ہے، لیکن جیسا کہ تم پڑھ چکے اگر پھیپھڑے کی حفاظت پر دل و دماغ کی نگرانی پر ہم اس کمال کو قربان کر دیں، تو تم انصاف کرو کہ کیا برائے ہیں، بلکہ محکمہ ”حفظ صحت“ کا حکم ہونا چاہئے کہ ایسے خوفناک وجود جب کبھی سر نکالیں، تو انہیں قینچیوں کے قدموں سے ٹھکرا دیا جائے۔

ضرورت ہے کہ موچھوں کے کٹانے پر لوگ مجبور کئے جائیں، جیسا کہ اور بہت سے حفظ صحت کے قانون پر عمل پیرا ہونے کے لیے ان پر زبردستی کی جاتی ہے، مگر اب سوال یہ ہے کہ ڈاڑھی کے اندر کیا مضرت ہے؟ اس سے دل و دماغ، یا روح و جسم کو کیا نقصان پہنچتا ہے؟ اور جب کہ کوئی نقصان نہیں، کسی قسم کا گزند نہیں پہنچتا، تو اے بندگان خدا! مجھے بتاؤ کہ پھر وہ کیوں لائق سترونی و تختہ مشق تراشیدنی ہے، حالانکہ علاوہ کمال ہونے کے وہ اپنے اندران منافع کو بھی سمیٹے ہوئے ہے، جس کا بعض حصہ تم پڑھ چکے اور انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ پڑھو گے۔

یہ تو اس عبارت کا ایک ظاہر پہلو تھا، مگر زیادہ ڈوبنے سے اس کا ایک اور دقیق رخ، بھی روشن ہو سکتا ہے۔ غور کرو شاہ صاحب نے تو اس قدر فرمایا کہ ”ڈاڑھی مردوں کی صورت کو کامل بناتی ہے“۔ اس پر کہا جاسکتا تھا، ”مان لیا جاتا کہ وہ کامل بناتی ہے، لیکن اس کے منڈانے میں کیا نقصان ہے؟ اسی سوال کا ایک جواب تھا جسے میں نے اب تک بیان کیا، لیکن جب کہ شاہ صاحب ڈاڑھی کو جزء ہیئت جنس ذکر قرار دیتے ہیں، تو یہاں محالہ معلوم

ہوتا ہے کہ عدم لحمیہ (ڈاڑھی کا نہ ہونا) ان کی ہیئت کی جزء نہیں، پس اب اسی شیروانی کی تمثیل میں صرف اس قدر اور اضافہ کرو کہ ایک شخص اس کی ایک آستین کی جگہ پانچواں کا ایک پانچ لگاتا ہے، یا اپنی قمیض کی پشت پر ترکی ٹوپی کا ایک پھندا جوڑ دیتا ہے، تو کیا مہذب مجلسوں، تعلیم یافتہ سوسائٹیوں میں فسانہ آزاد کے خوبی ہونے سے پہلے، یا لکھنؤ کی قدیم شاہی درباروں کے فریضہ تمسخر کو انجام دینے سے قبل وہ شریک ہو سکتا ہے؟ اور جب کہ نہیں ہو سکتا، تو آہ کہ تم اس قابل رحم شخص کو جس نے اپنے مردانہ صورت کی شاندار شیروانی سے ڈاڑھی کی آستین اڑا کر جنس انات کی سادہ غداری کی باہیں جوڑ لی ہیں، کیوں نہیں کہتے کہ:

”چہ صورتی کہ بھیج آدمی، نمی مانی“

جس شیروانی میں آستینوں کی جگہ پانچ لگے ہوئے ہیں، انصاف کرو کہ میں اسے شیروانی کس طرح کہہ دوں، حالانکہ میں نے کوشش کی کہ شیروانی ہی کہوں، لیکن طبیعت کی فطری واضطراری احکام کا کیا علاج ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس کی دوسری آستین، اسے کے کالر، اس کے بٹن اور اس کے تمام اجزاء وہی ہیں، جو عام شیروانیوں میں ہوا کرتے ہیں، لیکن پانچ کی اجنبی جزء کا ظلم دیکھو کہ وہ مجھے بجنہ اسی طرح خندہ پردازی کے لیے مجبور کر رہا ہے، جیسا کہ ایک مرد جس کی مونچھیں بھی تھیں، اس کے اور تمام اعضاء جو، لتیہ بھی ہے، لیکن رخسار مصنف کے اجنبی رکن نے ایک مستہزائے تبسم پر پھر ایک دفعہ مجھے مضطر کیا تھا۔

غرض یہ کہ مردانہ شکل و شبابت، فحولی ہیئت اگر جنس ذکور کے لیے ایک واقع کسوت اور نفس الامری پیرا مین ہے اور بلاشبہ ہے، تو یقیناً بقول شاہ صاحب قدس سرہ پیرا مین کا ایک جزو ڈاڑھی بھی ہے اور جب کہ وہ جزء ہے، تو علاوہ تمثیلی بیان کے برہانی طور پر بھی وہ شیروانی سے آستین کٹانے کے مترادف ہے کہ جزو کا فقدان نقص حقیقت کو مستلزم ہے، بلکہ اگر تم منطق کے اصول پر جانچو گے، تو نظر آئے گا کہ یہاں ہیئت مردانہ ناقص ہی نہیں ہوتی، بلکہ سرے سے معدوم ہوگئی کہ منطق کا یہ ایک مشہور قانون ہے کہ ہر ایک حقیقت مرکبہ کے کچھ اجزاء ہوتے ہیں، جن کے وجود پر اس چیز کا مہر ہوتا ہے۔ جب تک وہ اجزاء موجود ہوں، شے موجود ہے اور جب ان پر نیستی طاری ہوئی، شے بھی معدوم ہو جاتی ہے۔

مثلاً: وہ درخت جو تمہارے سامنے کھڑا جھوم رہا ہے، اگر اس سے اس کی قوت و نشوونما کی اور اس کی شادابی، تروتازگی، اس کی طاقتِ غازیہ کو الگ کر لیا جائے، تو پھر کیا وہ درخت باقی رہ سکتا ہے؟ اور اگر رہتا ہے، تو پھر جمادات اور نباتات میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ اسی طرح اگر اس سے طول کو بھی، عرض کو بھی، عمق کو بھی، یعنی: جسمیت کو علیحدہ فرض کر لیا جائے، تو پھر کہیں اس کی ہستی نظر آ سکتی ہے؟ ان ہی چیزوں کو منطق میں ”ذاتیات“ کہتے ہیں، جو اشیاء کے توام حقیقت میں گھل مل کر اس کے لیے باعث وجود بن جاتے ہیں۔

پس اسی اصولِ منطقی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر میں یہ کہوں کہ ڈاڑھی کے معدوم ہو جانے سے مردانہ حقیقت نہیں، بلکہ مردوں کی ہیئت کی حقیقت نیست و نابود ہو جاتی ہے؟ تو دنیا کا کوئی فیلسوف منطقی مجھے اس سے نہیں روک سکتا کہ آخر ڈاڑھی میں بھی تو فحولی ہیئت کی ایک جزو ہے، جیسا کہ درخت کو جسمیت سے معرا کرنے کے بعد اس کی ہستی ناپید ہو جاتی تھی۔ یہ الگ گفتگو ہے کہ منطق کا یہ نظریہ کہاں تک صحیح ہے، لیکن مجھے تو ایک الزام قائم کرنا تھا اور وہ مکمل ہے کہ اس وقت قدیم و جدید منطقہ خصوصاً مغرب کے اصحاب کا بھی اس پر اتفاق ہے۔ کفالکم بہم قدوۃ۔

مجھے کسی کی دل شکنی منظور نہیں کہ طریق عمل یہ نہیں ہے، تاہم طرز گفتگو تو یہی ہے صلاح کی، جس کو ضرورت ہو، وہ خود اپنے انصافِ عدل کے میخانہ جذبات میں ڈوب جائے کہ وہاں وہ سب کچھ نظر آ جاتا ہے، جو یہاں کبھی نظر نہیں آتا۔

غفر اللہ الشاعر حیث قال:

در میخانہ راہکشا کہ پیچ از خالقه نکشود

گرت باور بود، ورنہ سخن این بود ما گفتم

ڈاڑھی کے متعلق حضرت شاہ صاحب اس کے بعد فرماتے ہیں:

”وہی جمال الفحول“

”اور وہ مردوں کی خوبصورتی ہے۔“

میرے خیال میں یہ دراصل ایک سخت معارضہ کا جواب ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ گذشتہ جس قدر باتیں بھی بیان کی جا چکی ہیں، وہ زیادہ تر دو باتوں پر مبنی ہیں۔ (۱) ڈاڑھی

منڈانے میں کوئی فائدہ نہیں (۲) اور اس کے رکھنے میں بہت سے منافع ہیں۔

پہلا مقدمہ اگرچہ عام مسلمانوں کے نزدیک بدیہی ہے، لیکن تاہم پھر بھی موجودہ زمانہ میں، بلکہ ہمیشہ سے ایک جماعت چلی آتی ہے، جس کو یہ تسلیم نہیں، بلکہ اس کے برخلاف منڈانے کے بہت سے فائدہ ان کی طرف سے بیان کئے جاتے ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہم فائدہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ڈاڑھی سے میناء حسن و جمال پر بال آجاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ثبوت کے لیے مشاہدہ سے زیادہ قوی چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟ عموماً یہ بحث ہر اس مجلس میں پیش کی جاتی ہے، جہاں ڈاڑھی کے حامیوں کا اجتماع اس کے مخالفوں کے ساتھ ہو جاتا ہے، ظرائف و لطائف کی بھرمار دونوں جانب سے ہوتی ہے، حتیٰ کہ شعرو شاعری تک نوبت آجاتی ہے۔

عام طور سے جو اس معارضہ کا جواب دیا گیا ہے، میں نے اکثر دیکھا ہے کہ اس میں زیادہ تر اس پر زور دیا جاتا ہے کہ مردوں کو حسن و جمال کی کوئی ضرورت نہیں، یہ عورتوں کے لیے ہے، لیکن شاہ صاحب قدس سرہ نے ایسا نہیں کیا ہے، انہوں نے مردوں کے لیے جمال کی ضرورت تسلیم کی ہے؟ اگر ایسا نہ کیا جائے، تو شعار کے لیے جو اصول مقرر کئے گئے ہیں، ان کی یہ صریح خلاف ورزی ہوگی۔ یاد ہوگا کہ شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ شعار کے لیے جہاں اور باتوں کی ضرورت ہے، منجملہ اس کے یہ بھی ہے کہ عام میلان طبعی اس کی طرف ہو۔ ظاہر ہے کہ حسن و جمال خواہ ظاہری، یا باطنی کون اس کا گرویدہ نہیں؟ کون چاہتا کہ اس کی صورت و معنی دونوں خوبصورت اوصاف کیساتھ موصوف نہ ہوں؟

قرآن مجید نے بطور توجیح و زجر کے فرمایا:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ﴾

(الاعراف: ۳۲)

”خدا نے اپنے بندوں کے لیے جو چیزیں پیدا کی ہیں، اس کو کس نے

حرام کیا“

خود سرور کائنات ﷺ پر کبھی کبھی ہزار درہم کا کپڑا دیکھا گیا ہے۔ اصحاب نبی کریم

ﷺ تحمل سے کبھی پرہیز نہیں فرمایا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو جب

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خارجیوں کی فہمائش کے لیے روانہ فرمایا ہے، تو کون نہیں جانتا کہ اس وقت وہ ایک نہایت نفیس گھوڑے پر عمدہ لباس، نہایت قیمتی عطر لگائے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے، حتیٰ کہ جب خارجیوں نے پوچھا: ”ابن عباس! تم تو بڑے نیک لوگوں میں شمار کئے جاتے ہو، یہ جباروں کے لباس میں آپ کو ہم لوگ کیا دیکھتے ہیں۔“ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس وقت یہی آیت پڑھی اور فرمایا کہ: ”اگر چہ یہ آیت ان لوگوں کی شان میں ہے، جو بیت اللہ کے طواف کے وقت ننگے ہو جاتے تھے، لیکن پھر بھی حکم عام ہے۔“

ائمہ میں امام مالک کے لباس فاخرہ زبان زد عام ہیں۔ خود حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جو چادر اوڑھا کرتے تھے، اس کی قیمت چار سو اشرفیوں سے کم نہیں ہوتی تھی اور صرف یہی نہیں اپنے شاگردوں کو بھی اس کا حکم دیا کرتے تھے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تو اس قدر مشہور ہے کہ وہ اچھے لباس پہننے کے بعد فرمایا کرتے کہ میری بیویاں اور باندیاں زیادہ ہیں، میں اپنے کو مزین کرتا ہوں، تاکہ وہ دوسری طرف توجہ نہ کریں۔ حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ پچاس پچاس دینار میں کپڑے خریدتے اور ذرا سا بھی پرانا ہوتا، اسی وقت صدقہ کر دیا کرتے۔

بہر کیف فقہاء کی تصریح موجود ہے کہ تجمل و تزین مستحب ہے، صحیح حدیث ہے:

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: (ان اللہ اذا انعم

علی عبد احب ان یری اثر نعمۃ علیہ).

نبی ﷺ نے فرمایا: ”خداوند تعالیٰ جس کسی بندہ پر انعام فرماتا ہے، تو چاہتا ہے کہ اپنی نعمتوں کا اثر دیکھے۔“

البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کی عبا اکثر پیوند دار ہوتی تھی، یہ اس لئے نہ تھی کہ آپ قصداً ایسا کرتے تھے، بلکہ آپ کی آمدنی جو کچھ مقرر تھی، اس میں اتنی گنجائش ہی نہیں پیدا ہوئی کہ آپ عمدہ کپڑے خرید سکتے۔ آپ رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے، خلافت کے کام سے اتنی فرصت کہاں ملتی تھی کہ اوروں کی طرح مکاسب کی طرف متوجہ ہوتے۔ بہر کیف یہ تو میسر آنے پر ہے اور جس کو میسر نہ ہو وہ کیا کر سکتا ہے۔

الغرض جب کہ جمال، تیزین سے شرع اسلامی مانع نہیں، بلکہ ایک حد تک اس کی معلم ہے، تو پھر یہ کہنا کہ خوبصورتی، یا جمال کی مردوں کو کوئی ضرورت نہیں، ایک بے معنی کلام ہے، اس کے علاوہ سراسر رہبانیت اور جوگ کے مرادف ہے۔ آج دنیا کے اکثر مذاہب و ملل کے مقتداؤں میں سب سے بڑا اور رسیدہ مقتداء وہی ہے، جو سب سے زیادہ کریم المنظر اور گھناؤنا ہو۔ زیادہ تفتیش کی کیا ضرورت ہے، ہاتھ میں چونٹے لے کر جنگلوں میں پھرنے والے سادھوؤں، خاک آلود چہرے اور کمر میں رسی باندھ کر وعظ کہنے والے پادریوں کے بالوں میں ڈوبے ہوئے لب و دندان تم کو اس کا جواب بخوبی دے سکتے ہیں، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو مذاہب اپنے پیروؤں کو جنگل میں نہیں، شہروں میں رہنے کا حکم دیتا ہے، ترک علاقے کا نہیں، بلکہ ان کے پیدا کرنے کی طرف براہیختہ کرتا ہے، وہ تمدن کے خلاف کوئی ایسا حکم صادر کرے، جس پر آبادیوں میں رہ کر عمل ناممکن ہو، بلکہ غور کرنا چاہئے کہ واقعہ کیا ہے اور اصول اسلامیہ کے اعتبار سے اس کی صحیح توجیہ کیا ہو سکتی ہے؟ میں نے یہاں تک شاہ صاحب کے کلام کا جو مطلب سمجھا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں تین صورتیں پیدا ہوتی ہیں:

(۱) ڈاڑھی بالکل منڈادی جائے۔

(۲) اپنی اصلی حالت پر چھوڑ دیا جائے، جس حال میں رہے، رہنے دیا جائے۔

(۳) درمیانی صورت اختیار کی جائے کہ نہ بالکل منڈادی جائے اور نہ چھوڑ دیا

جائے، بلکہ وقتاً فوقتاً اس کو درست کیا جائے، تیل وغیرہ لگا کر کنگھیوں سے اس کی اصلاح کی جائے اور قدر معتد بہ سے بڑھ جائے، تو اسے تراش دیا جائے۔

ان تین صورتوں میں دوسری صورت یقیناً حسن و جمال کے منافی ہے اور اسی طرح

پہلی صورت باعتبار عرف عام حسن و جمال کی مؤید ہے، البتہ تیسری صورت قابل غور ہے،

اب اس کا سمجھنا عقل سلیم پر موقوف ہے کہ آیا تیسری صورت میں جمال وزینت میں مدد ملتی

ہے، یا نہیں؟ وجدان کے علاوہ اس پر اور کیا چیز دلیل ہو سکتی ہے؟ تاہم فرض کرو کہ تمہارے

سامنے دو آدمی آتے ہیں اور دونوں ڈاڑھی والے ہیں، دونوں آنکھ، ناک، کان، رنگ و عمر

وغیرہ میں مساوی ہیں، مگر ایک کی ڈاڑھی الجھی ہوئی، بکھری ہوئی ناف تک پھیلی ہوئی ہے اور

دوسرے نے اسے ہر چار طرف سے برابر کرنے کے بعد اس میں کنگھی وغیرہ کر کے اسے درست کیا ہے، بتاؤ کہ آیا دونوں جمال میں برابر ہیں، یا کوئی ان میں زیادہ وجیہ و خوبصورت معلوم ہوگا؟ ظاہر ہے ثانی الذکر شخص سے پہلے کو کوئی نسبت نہیں، معمولی سی عقل رکھنے والا آدمی بھی پہلے کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ پس اسی سے معلوم ہوا کہ ڈاڑھی رکھنے کی صورت میں بھی انسان حسن و جمال حاصل کر سکتا ہے اور وہ اس کے لئے ہر حیثیت سے کبھی منافی نہیں۔

پس اگر تھوڑی دیر کے لیے تسلیم بھی کر لیا جائے، ڈاڑھی منڈانے سے خوبصورتی پیدا ہوتی ہے، لیکن یہ بے انصافی ہے کہ اس کے صرف ایک پہلو پر نظر ڈالی جائے، ضرورت ہے کہ اس کے مضرات نقصانات پر توجہ ہونی چاہئے، جس کے متعلق بعض باتیں میں کہہ چکا۔ علی الخصوص جب کہ رخسارہ کی صفائی عورتوں کی فطرتی زینت ہے، تو مردوں کا بھی اسی سے زینت حاصل کرنا ایسا ہے، جیسا کہ کوئی مرد اپنے کان میں بالیاں اور بجلیاں ڈال کر اپنے کو خوبصورت بنائے، یا ناک میں بلاق وغیرہ اسلئے پہنے کہ میں خوبصورت ہو جاؤں گا، حالانکہ کوئی مرد اس کو تجویز نہیں کر سکتا اور تو اور یورپ جس نے اپنے کو حیوانوں پر قیاس کرنے کے بہت فطرتی حدود انسانی کو توڑ دیا ہے، وہ بھی مردوں کے لئے میمون کا سایہ، یا ان کے لباس کو تجویز نہیں کر سکتا، تو بتاؤ کہ حیا پرورد غیور ایشیائی شریف اپنے لئے یہ کس طرح تجویز کرے گا کہ جو زینت عورتوں کی ہے، ان سے چھن کر خود اس کو استعمال کرنے لگے....!؟

اور جب کہ صورت حال یہ ہے، تو اس کے لیے کہ خوبصورتی بھی باقی رہے اور عورتوں سے مشابہت بھی نہ ہو، انسان ان نقصانوں سے بچا بھی رہے، جو ڈاڑھی کے منڈانے میں ہے، اس کے علاوہ اور کیا صورت ہو سکتی ہے کہ ڈاڑھی رکھی جائے، لیکن ہمیشہ اس کی اصلاح و درستی کا خیال رہے، جیسا کہ شارع اسلام علیہ السلام والصلوات کا دستور تھا کہ: ”ہسی جمال الفحول“۔ ”یہ ڈاڑھی اس وقت مردوں کے لیے خوبصورتی ہے۔“

روایات میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

(من كان له منكم شعر فليكرمه)

”جس کے بال ہوں، وہ ان کی عزت کرتے۔“

صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا:

”ما کر امتہ؟“ ”بال کی عزت ہے۔“

آپ نے فرمایا:

(یدھنہ ویمشطہ کل یوم)

”اس میں تیل لگائے اور روزانہ کنکھی کرے۔“

امام ترمذی راوی ہیں:

عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده: ان النبي صلى

الله عليه وسلم: كان ياخذ من لحيته من عرضها و

طولها (ترمذی)

یعنی: ”رسول ﷺ اپنی ڈاڑھی کے طول اور عرض سے کچھ حصہ لے کر ترشوا

دیتے تھے۔“

اگرچہ عمر بن ہارون پر لوگوں نے جرح کی ہے اور ارادہ کیا ہے کہ اس روایت کو ضعیف قرار دیں، لیکن اگر روایت اس میں غربت ہے، تو درایت اس کی توثیق ہوتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو اسوہ نبویہ سے جو شغف تھا، وہ ہر ایک شخص کو معلوم ہے، حتیٰ کہ سفر حج میں آنحضرت ﷺ نے جہاں پر پیشاب کیا، اتر کر وہاں یہ بیٹھ جاتے تھے۔

ان سے بخاری راوی ہیں:

(كان ابن عمر اذا حج و اعتمر، قبض على لحيته، فما

فضل اخذہ)

یعنی: ابن عمر رضی اللہ عنہما جب حج، یا عمرہ کرتے، تو اپنی ڈاڑھی کو مٹھی میں

لیتے، جو باہر رہ جاتی، اسے کٹوا دیتے۔“

اس سے اس روایت کی یقیناً تائید ہوتی ہے، علی الخصوص حنفیہ کے نزدیک تو ایک

مشت سے زیادہ اگر بڑھ جائے، تو اس کا کٹانا بہتر ہے، جیسا کہ امام محمد نے کتاب الآثار

میں نقل کیا ہے۔

الغرض ایک معتدل جمال، جس میں تمام پہلوؤں کا لحاظ و پاس ممکن ہے، وہ صرف

اسی صورت میں ہے، جیسا کہ اسلام نے مقرر کیا اور اس بناء پر ”وہی جمال الفحول“۔
”اور وہ مردوں کی خوبصورتی ہے“ بالکل صحیح ہے۔

تین نمبروں میں ڈاڑھی کے متعلق لکھتے لکھتے میں الگ گھبرا گیا ہوں۔ ناظرین کا الگ دم الجھتا ہوگا، لیکن میں کیا کر سکتا ہوں...! ایک شارح اگر مصنف کی پورے کلام کی شرح نہیں کرتا ہے، تو وہ ایک اخلاقی مجرم و خائن ہے، چونکہ حضرت شاہ صاحب اس کا ذکر کسی طرح نہیں چھوڑتے، اس لئے میں مجبور ہوں۔ علاوہ اس کے عصر حال میں ڈاڑھی کی جو کچھ درگت بنائی جاتی ہے، اس کا بھی مقتضی یہی ہے کہ اس موضوع کو زیادہ پھیلا کر لکھا جائے، تعجب ہے کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ، کو اس طوفان بدتمیزی کا قبل از وقت کیوں کر علم ہوا، اور نہ صرف اس میں بلکہ ”حجتہ اللہ البالغہ“ میں وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت لکھ رہے ہیں کہ جبکہ عادات میں اطوار فرنگ کا سیلاب ہندوستان پر محیط ہو چکا تھا۔

میں اس کے مضامین پڑھتا ہوں اور شاہ صاحب کے اس مکاشفہ اور خواب کی صداقت دل میں اترتی جاتی ہے، جو اس کتاب کے متعلق مقدمہ میں درج ہے۔

ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ ”میں عصر کی نماز کے بعد خدا کی طرف متوجہ ہو کر (گویا مراقبہ میں) بیٹھا ہوا تھا کہ یکا یک سرور کائنات ﷺ کی روح اقدس صلوات اللہ علیہ وسلم منجلی ہوئی اور مجھے اوپر سے ڈھانک لیا، ایسا معلوم ہوا مجھ پر کوئی کپڑا ڈالا گیا ہے اور میرے دل میں یہ بات پیدا کی گئی کہ دین کے اسرار و حقائق کے اظہار و بیان کی طرف اشارہ ہے۔“
اس کے بعد ارقام فرماتے ہیں کہ ”میں نے اس وقت اپنے سینے میں ایک روشنی محسوس کی، جو دم بدم پھیل رہی تھی۔“ پھر اپنا ایک اور الہام درج کرتے ہیں: ”میرے پروردگار نے مجھے پھر الہام کیا کہ قلم تقدیر نے لکھ دیا ہے کہ میں اس روشن اور بڑے مہم کو انجام دینے کے لیے اٹھوں گا، خدا کے نور سے زمین منور ہو چکی ہے اور اس کی شعاعیں افق سے چمک اٹھی ہیں۔“
شریعت مصطفویہ کی بجلیاں اس زمانہ میں تڑپ رہی ہیں کہ انہیں دلائل و برہان کے پیرا ہنوں سے آراستہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔“ آگے چل کر ایک خواب کا ذکر کرتے ہیں: ”میں مکہ معظمہ میں تھا کہ خواب میں حضرت حسین و حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو

دیکھتا ہوں کہ گویا دونوں بھائی مجھے ایک قلم عطا فرما رہے ہیں اور فرماتے ہیں یہ ہمارے نانا رسول ﷺ کا قلم مبارک ہے۔“

بلاشبہ یہی ہوا ہے کہ شاہ صاحب نے یہ باتیں لکھی نہیں، بلکہ لکھائی گئی ہیں، خود پیدا نہیں کیں، بلکہ پیدا کرائی گئی ہیں۔ (فصلے اللہ تعالیٰ علی نبیہ الذی ہو رحمة للعالمین و بامتہ رؤف رحیم)

اسی لئے دیکھا جاتا ہے کہ جن چیزوں کی اس زمانہ میں زیادہ ضرورت ہے، شاہ صاحب اس کی بہت زیادہ تفصیل فرماتے ہیں۔ بہر کیف ڈاڑھی کے متعلق لکھتے ہیں:

”وفیہ تغیر خلق اللہ۔“

”ڈاڑھی کے منڈانے میں خداوند تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں کو بدل دینا ہے۔“

مقصد گرامی کو سمجھنے کے لیے پہلے ایک مثال سمجھ لینی چاہئے۔

فرض کیجئے کہ آپ کے سامنے امریکہ کے کسی مشہور کارخانے کا بنا ہوا ایک کلاک (گھڑی) رکھا ہوا ہے اور چل بھی رہا ہے، اب آپ خواہ مخواہ اٹھتے ہیں اور اسے اتار کر کھولتے ہیں اور اس کے بعض پرزوں کو فضول سمجھ کر (حالانکہ آپ کو گھڑی سازی کا کام بھی نہیں آتا) نکال دیتے ہیں، کیا آپ کی یہ حرکت عقل و دانش پر مبنی سمجھی جائے گی؟ اور اگر آپ کی گھڑی کے ساتھ میں حرکت کر دوں، تو کیا آپ اس کی اجازت دے سکتے ہیں؟ نہیں کے علاوہ اس کا اور کیا جواب ہو سکتا ہے؟

پس شاہ صاحب قدس سرہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ جب کہ تمام ادیان و ملل کے ماننے والے خداوند قدیر کو حکیم و خبیر سمجھتے ہیں اور اس حاکم کو اس کی اعلیٰ حکمتوں کا مظہر قرار دیتے ہیں، تو پھر کسی مخلوق نادان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی مشین کے پرزوں کو بلاوجہ الگ کر دے، ڈاڑھی کا رخا خانہ انسانی کا پرزہ ہے اور جب کہ خداوند حکیم نے اسے چہروں پر پیدا کیا ہے، تو اس کے منڈا دینے کے کیا معنی ہیں؟ امریکہ کے گھڑی سازی عقل پر تو اعتماد ہے کہ اس کے جمائے گئے پرزوں کو ”رتی“ کے برابر اپنی جگہ سے ہلانے کو ہم حرام سمجھتے ہیں، لیکن کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ خداوند تعالیٰ کی چیزوں کو الگ کر دینے میں ہم اس درجہ بے باک ہوں۔ ﴿ما قدر و اللہ حق قدرہ﴾ خدا کی قدر اس کے حق کے موافق

انسانوں نے نہیں کی۔“

حضرت شاہ صاحبؒ کا مقصد تو یہی ہے، لیکن یہاں پھر ایک اعتراض واقع ہوتا ہے کہ ”مونچھوں کے منڈانے، ناخنوں کے کٹانے، یا ختنے وغیرہ میں کیا ”خلق اللہ“ کی تغیر و تبدل نہیں؟ پھر شریعت نے اس کا کیوں حکم دیا؟ کیا خدا کی حکمت میں اس سے قدح نہیں عائد ہوتا؟ حالانکہ اس اعتراض کا جواب جملہ ”وہی کمال ہیتہم“ کی شرح میں دیا جا چکا ہے، لیکن آج اسے پھر مکرر کیا جاتا ہے کہ یہاں کچھ اور اضافہ کی ضرورت ہے، اصل یہ ہے کہ خداوند ذوالجلال کے ساتھ مخصوص نہیں، ہم بھی جب کوئی چیز بناتے ہیں، تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

(۱) کبھی تو وہ چیز ہی مقصود ہوتی ہے، مثلاً: ہم مکان اسی لئے بناتے ہیں کہ اس کا بنانا

مقصود ہے۔

(۲) اور کبھی وہ دوسری چیز کے لیے وسیلہ اور واسطہ ہوتی ہے۔ مثلاً: مکان بنانے سے پہلے معماروں کے لیے مچان، سیڑھیاں، ٹھٹھر وغیرہ نصب کئے جاتے ہیں کہ ان سے مکان کا بنانا مقصود ہے، نہ خود انکی ذات۔

ان دو قسموں کے احکام مختلف ہیں، پہلی صنف کی چیزوں کو بنا کر بلاوجہ برباد کر دینا سخت بد عقلی ہے، آخر جو مکان تیار کر کے بلاوجہ ڈھاتا رہے گا، اس کے جنون میں کیا شبہ ہے...!؟

اسی طرح دوسری صنف کے لیے بہت ضروری ہے کہ جب مقصد پورا ہو گیا، تو اسے فوراً تباہ کر دیا جائے کہ اس سے پھر اذیت اور تکلیف پہنچتی ہے، مثلاً: جب مکان بن کر تیار ہوگا، تو اب معماروں کی مچانوں اور ٹھٹھروں کو اکھڑا دینا چاہئے کہ ان سے رہنے سہنے، اترنے چڑھنے میں اذیت ہوگی، یہی حال خداوند تعالیٰ کی مخلوقات کا ہے، ہم گہیزن بوتے ہیں، مقصود صرف دانہ ہے اور پتے بھس وغیرہ محض دانے کی حفاظت کے لیے پیدا ہوتے ہیں، جب خوشہ پک جاتا ہے، تو ہم دانے چن لیتے ہیں اور بھس وغیرہ کو جانوروں کے حوالہ کرتے ہیں، یا مثلاً ہم روٹی کھاتے ہیں، اس سے خون بھی پیدا ہوتا ہے اور فضلات بھی بضرورت پیدا ہوتے ہیں، خون جسم میں جذب ہو جاتا ہے، گوشت بن جاتا ہے اور فضلات

پسینے، سنک، بول و براز کی صورت میں باہر نکل آتے ہیں :-

پھر جب کہ کائنات میں خداوند حکیم کی اس عادت جاریہ کی کھلی کھلی مثالیں موجود ہیں، تو میں اگر اسی اصول کی بنا پر یہ کہوں کہ ڈاڑھی جسم کے اجزاء مقصودہ میں سے ہے اور موچھیں، بغل کے بال، ناخن وغیرہ وغیرہ مقصود نہیں، تو مجھے کون روک سکتا ہے، علی الخصوص جب کہ طبیب روحانی صلوات اللہ علیہ و سلامہ نے خود اس کی تصریح فرمائی تو اب کسی مسلمان میں شک و شبہ کی گنجائش رہنے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے؟ لیکن نہیں! میں صرف اسی پر قناعت نہیں کروں گا کہ اسلام صرف سطوت و جبروت سے کام لینا نہیں چاہتا، وہ ایک نیر درخشاں ہے، جس کی کرنیں صرف چمکنے کے لیے اور چمکانے کے لیے ہیں، عقل و دانش کی سرزمینوں کا وہ دن ہے، جس میں ہر چیز نمایاں طور پر صداقت و حقانیت کے پیکر مجسم نظر آتے ہیں۔ تم نے اگر طب کی بعض ابتدائی مسائل کا مطالعہ کیا ہوگا، تو پڑھا ہوگا کہ بالوں کی پیدائش کی علت کیا ہے اور جسم میں یہ کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ اور اگر خود نہیں پڑھا، تو مجھ سے سنو، اطباء کہتے ہیں کہ ”انسان کی زندگی کا مدار بدل، یا متحائل پر ہے (یعنی: خون، یا گوشت) جو فنا ہوتا رہتا ہے، ضرورت ہے کہ ہر وقت اس کے مقابلہ میں خون وغیرہ پیدا ہو جائیں اور اسی لئے اس میں بھوک پیدا کی گئی، تاکہ رغبت سے کھائے اور غذا کو اندر داخل کرے اور یہی غذا خون وغیرہ بن کر بدل بنتی رہتی ہے، لیکن غذا کا خون بنا قوت ہاضمہ کے علاوہ حرارت پر موقوف ہے کہ وہ اسے پکا کر روٹی سے کیوس و کیلوس، حتیٰ کہ خون اور خون سے گوشت بنا دیتی ہے۔“

بہر کیف حرارت، غذا کو جب پکاتی ہے، تو اس وقت اس سے کچھ اجزات اٹھتے ہیں، جو انسان کو اکثر بعد کھانے کے محسوس بھی ہوتے ہیں، ان ہی اجزات (بھاپ) میں جب زیادہ حرارت پہنچ جاتی ہے، تو وہ اجزات جل جاتے ہیں، جس سے ایک قسم کا دھواں پیدا ہو جاتا ہے اور یہی دھواں بالوں کا مادہ ہے، صورت پیدائش کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان اوخنوں (دھوؤں) کے بعض اجزاء تو بہت لطیف ہوتے ہیں اور غایت حرارت کی وجہ سے وہ جسم سے اڑ کر باہر ہو جاتے ہیں اور بعض کثیف و غلیظ ہوتے ہیں، وہ جسم ہی کے اندر گھٹتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ طبیعت کو ان سے ازیت پہنچنے لگتی ہے اور امراض و آلام کا احتمال پیدا ہوتا

ہے، اس وقت اضطراباً طبیعت ان کو براہ مسامات باہر پھینکتی ہے، چونکہ کثیف ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ابتداء میں ان کی مقدار تھوڑی ہوتی ہے، اس لئے مسامات ہی میں انک کر رہ جاتے ہیں، پسینے اور حرارت پھر دیر پائی کی بدولت اس میں ایک خاص قسم کی صلابت اور سختی پیدا ہو جاتی ہے اور یہی بال کہلاتا ہے، لیکن ابھی تک یہ جلد (چمڑے) کے اندر ہی چھپے رہتے ہیں، پھر اسی قسم کے دوسرے اوخنوں کو طبیعت باہر پھینکتی ہے، وہ اپنی جگہ نکالنے کے لیے اس چھپے ہوئے جرم شعری (بال) کو باہر پھینک دیتے ہیں، اسی طرح پے در پے طبیعت و خانوں کو روانہ کرتی رہتی ہے اور یہ آگے کو بڑھنا شروع ہوتے ہیں، حتیٰ کہ وہ سب آپس میں متصل ہو کر ایک دن لمبے اور بالوں کو دراز صورت میں ہمارے سامنے ظاہر ہوتے ہیں۔

(۱)..... بال اس حرارت کا نتیجہ ہے، جس سے انسان کی غذاء پک کر اس کی زندگی کو برقرار رکھتی ہے۔

(۲)..... خداوند تعالیٰ نے محض طبیعت کو مضرات سے بچانے کے لیے اوخنہ کو بال کی صورت میں نکال کر انسان کو بہت سی بیماریوں سے محفوظ فرمایا۔

(۳)..... بال انسان کے اعضاء اصلیہ میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ بمنزلہ فضلات، بول و براز، سبک، پسینہ وغیرہ کے ہے، جن کی پیدائش کے بعد حتیٰ الوسع انہیں الگ ہی کر دینا مناسب ہے، علی الخصوص جب کہ اسے کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔

چونکہ آخری نتیجہ کا یہ بدیہی فیصلہ ہونا چاہئے کہ انسان (خواہ مرد ہو، یا عورت) اپنے سر، ابرو پلک، مونچھ، ڈاڑھی اور اس کے بعد تمام جسم کے بالوں کو منڈا دے، اس لئے علی بن عباس رضی اللہ عنہما نے بالوں کی تقسیم کر کے سمجھانا چاہا ہے کہ کن بالوں کو منڈانا چاہئے اور کن کو نہیں؟ لکھتے ہیں کہ اگر بالوں کا فائدہ صرف استقدر ہوتا کہ طبیعت (ان کے مادہ، یعنی: دھواں) کی اذیتوں سے بچ جائے، تو اس وقت البتہ یہی کرنا چاہئے کہ تمام بالوں کو جسم سے الگ کر دیا جائے، جیسا کہ بول و براز کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے، لیکن یہ سراسر غلطی ہے، بلکہ بالوں کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک تو وہ ہیں جن سے علاوہ فائدہ کے اور بھی منافع ہیں، مثلاً: سر کے بال زینت اور حفاظت دماغ و سر کے لیے ہیں، یا پلک اور ابروؤں کے بال علاوہ زیب و زینت کے

آنکھوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

(۲) دوسرے وہ ہیں جو محض بالغرض پیدا ہوتے ہیں اور بجز گذشتہ فائدہ کے ان سے اور کوئی مقصد نہیں، جیسے: بغل اور زری ناف، سینہ، مونچھ اور تمام جسم کے بال۔

علامہ نے ڈاڑھی کو پہلی قسم میں شمار کیا ہے، لیکن اس کا فائدہ صرف حسن اور رب بتاتے ہیں، مگر تحقیقات کا دائرہ دور روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔ میں نے خود تو نہیں دیکھا ہے، لیکن ہمارے ایک فاضل عزیز سید معین الدین (گیلانی) جو انگریزی کے انتہائی مدارج تک پہنچ چکے ہیں، مجھ سے بیان کرتے تھے کہ حال میں ایک یورپین ڈاکٹر نے ثابت کیا ہے کہ بال مجوف (یعنی: خولدار) ہوتے ہیں، وہ اپنی نالیوں کے ذریعہ سے جسم کے بعض زہر لے جراثیم اور مادوں کو کھینچ کھینچ کر دانٹوں اور جڑوں کو آفات سے محفوظ رکھتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اگر اس ڈاکٹر کا یہ قول صحیح ہے، تو شاید ڈاڑھی کے بال ان خراب مادوں کو کھینچنے میں جو عورتوں سے بذریعہ ایام (خون حیض) نکلتا ہے اور اسی لئے قدرت نے عورتوں میں ڈاڑھی نہیں پیدا کی کہ ان کو اس کی ضرورت ہی نہیں۔

بہر نوع اگر ڈاڑھی میں یہ فائدہ نہ بھی ہو، جب بھی میرے متذکرہ بالا منافع جنہیں میں چند نمبروں میں بیان کر آیا ہوں، اس کی اہمیت کے لیے کب نا کافی ہیں، بخلاف موچھوں کے، یا ناخن وغیرہ کے کہ ان سے کوئی فائدہ متصور نہیں، بلکہ نقصان ہوتا ہے، جسے میں مفصلاً بیان کر آیا ہوں، یا آئندہ کروں گا اور اس بنا پر یہ دعویٰ مدلل ہو جاتا ہے کہ ڈاڑھی مخلوقات الہیہ کے اس صنف مقصود میں داخل ہے، جس میں دراندازی کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں اور یہی مراد ہے حضرت شاہ صاحب کی: ”وفیه تغییر خلق اللہ“ اور ڈاڑھی منڈانے میں خدا کی مخلوقات (جو مقصود میں) ان کی تغیر لازم آتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (ماہنامہ القاسم، دیوبند)

یہودیوں کی ایک زبردست سازش اسلام میں

اسی طرح یہودیوں پر ذلت و مسکنت کی مہر قرآن میں ہو چکی تھی، اس لیے مسلمانوں میں روایت مشہور کی، جس سے زیادہ ذلت آفریں واقعہ ممکن نہیں اور نہ صرف ایک

روایت، بلکہ سینکڑوں باتیں جن سے مسلمانوں کی توجہ بچائے خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت کی سخت اہانت ہوتی ہے۔ میں نمونہ ایک واقعہ ”ناخ التواخ“ سے لے کر درج کرتا ہوں، لکھتا ہے: ”جب ابو بکر خلیفہ ہوئے، تو رات کے وقت حضرت علی، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایک گھوڑے پر سوار کر کے حضرت حسن و حسین کے ہاتھ پکڑ کے مہاجرین و انصار کے گھر گھر گھومنے لگے، ہر ایک گھر پر کھڑے ہو کر فرماتے کہ میری مدد کرو، چنانچہ چوالیس شخصوں نے مدد کا وعدہ کیا۔“

آپ نے فرمایا: ”صبح سرمنڈوا کر مسلح ہو کر ہمارے پاس آؤ اور موت پر بیعت کرو“ مگر خوف کے مارے کوئی نہ آیا، پھر دوسری رات بھی آپ اسی طرح گھر گھر تشریف لے گئے اور لوگوں کو قسمیں دے کر آمادہ کیا، مگر کوئی آمادہ نہ ہوا، آخر آپ قرآن جمع کرنے کے لیے مکان کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے، عمر رضی اللہ عنہ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا، اگر علی رضی اللہ عنہ بیعت نہ کریں گے، تو خلافت کو استحکام نہ ہوگا، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلوا بھیجا اور بیعت کی درخواست کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: ”کیا اس قدر جلد رسول اللہ صلی علیہ وسلم پر افراتفری کیا گیا۔“

ابو بکر رضی اللہ عنہ اور ان کے تمام حاشیہ نشین لوگ جانتے ہیں کہ خدا اور رسول خدا نے مجھے خلیفہ مقرر کیا ہے، الغرض دونوں میں اسی طرح مکالمہ ہوتا رہا، دوسرے روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ علی رضی اللہ عنہ اور ان کے علاوہ چند لوگ ہیں، جنہوں نے اب تک بیعت نہیں کی، جس طرح ممکن ہو، بلوایا جائے، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کام کے لیے کون مناسب ہوگا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قنفذ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک سخت اور بے مروت آدمی ہے، چنانچہ ایک جماعت بسر کردگی قنفذ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے در دولت کی طرف روانہ ہوئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قنفذ کو دروازہ ہی پر ٹوکا اور اجازت اندر آنے کی نہ دی، وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ زبردستی گھس جاؤ اور جس طرح بن پڑے، پکڑ لاؤ، مگر قنفذ اس بار بھی کامیاب نہ ہوا، اس نے کہلا بھیجا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں گھر گھسنے نہ دوں گی، عمر کو غصہ آ گیا اور کہا کہ عورتوں کو ان معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت

ہے؟ چند آدمیوں کو لے کر خود مکان پر آئے، لوگوں کو اندر بھیج دیا اور آپ باہر کھڑے رہے اور پکارا: ”اے علی (رضی اللہ عنہ) باہر نکلو! اور خلیفہ رسول اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرو، ورنہ اس دروازے کو جلا دوں گا۔“ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اندر سے نکلیں اور کہا: اے عمر! تمہیں ہم سے کیا تعلق؟“ حضرت عمر نے کہا کہ: ”دروازہ کھولو، ورنہ جلا دوں گا۔“ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ: ”تم خدا سے نہیں ڈرتے، جو بلا اجازت میرے گھر میں آتے ہو۔“ آخر عمر رضی اللہ عنہ مجبور ہو گئے اور لکڑیاں منگوا کر گھر میں آگ لگا دی، جب جل گیا، تو دروازہ کو توڑ کر اندر داخل ہو گئے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا چیختی چلاتی باہر نکل آئیں اور اے ابا جان! میری مدد کیجئے کہتے ہوئے رونے لگیں، اس وقت عمر رضی اللہ عنہ نے تلوار کو جو کابھی میں تھی، ان کی کمر پر ماری۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ عمر نے کوڑا مارا، فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فریاد کی کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے خدا کو چھوڑا، دین سے پھر گئے۔

اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا اور عمر رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر زمین پر دے مارا، ناک و گردن کو ایسا دبا یا کہ دم نکل جائے اور کہا حکم قضا اور رسول خدا کا عہد میرے ذمہ نہ ہوتا تو، تو میرے دروازہ پر نہ آسکتا تھا، عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ شکار کی طرح شیر کے پنجے میں قید ہے، فریاد کر کے باہر کے لوگوں سے مدد چاہی۔ قنفذ نے دوڑ کر ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ماجرا بیان کیا، ان کو اندیشہ ہوا کہ مبادا کہیں علی رضی اللہ عنہ تلوار کھینچ کر باہر نہ نکل آئیں اور کچھ لوگ اس کے ساتھ ہو کر فتنہ و فساد برپا کریں، پھر پنجے کو فوراً قنفذ کو واپس لوٹایا اور کہا کہ اس کا انتظام رکھ کہ وہ باہر نہ نکل آئیں، اگر یہ ممکن نہ ہو، تو گھر میں آگ لگا دے، قنفذ دوڑا اور لوگوں کو لے کر گھر میں گھس گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے تلوار چھین لی، گرفتار کر کے گلے میں رسی باندھی اور اس طرح کھینچتا ہوا مسجد کی طرف لے جانے لگا، فاطمہ رضی اللہ عنہا لوگوں کو دروازہ پر روکتی تھیں، حضرت سے پٹ گئیں کہ لوگ ان کو چھوڑ دیں، لیکن قنفذ نے ایک کوڑا در سے ان کے ہاتھ پر دے مارا، جس کا اثر نمایاں ہو گیا اور وفات تک باقی رہا۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دروازہ کے پٹ کو اس زور سے دبا کہ فاطمہ رضی اللہ

عنها کی پسلی کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور حمل ساقط ہو گیا، اسی صاحبزادہ کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن قرار دیا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ اس میں علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بھی پٹ کے دبانیے میں شریک تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بیتاب ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ چھوڑ دیا، قنفذ اسی رسی کو جو حضرت علی کی گردن میں پڑی ہوئی تھی، کھینچتے ہوئے مسجد میں لے آیا۔ خالد بن ولید و دیگر انصار وہاں موجود تھے، ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر ہمارے ہاتھ میں تلوار ہوتی، تو اس طرح ہمیں نہیں لاسکتے تھے، واللہ اگر چالیس آدمی میری رفاقت کرتے، تو تمہاری تمام جماعت کو پراگندہ کر دیتا، خدا ان لوگوں پر لعنت کرے، جنہوں نے میری بیعت نہ کی۔

حضرت باقر سے روایت ہے کہ اس وقت بجز مقداد رضی اللہ عنہ، سلمان رضی اللہ عنہ، ابوذر رضی اللہ عنہ کے سب مرتد ہو گئے تھے، غرض اس ذلت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوئے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اس ذلیل حال کے ساتھ مسجد میں پہنچے، تو فاطمہ رضی اللہ عنہا نہات خستہ و پریشان حال گھر سے نکلیں، بنی ہاشم کی تمام عورتیں ساتھ تھیں، آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اقدس پر حاضر ہوئیں اور کہا کہ میرے چچا کے لڑکے علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دو، ورنہ میں اپنے بال بکھیر دوں گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیض اپنے سر پر رکھوں گی اور خدا کی طرف رجوع کر کے چیخوں گی، کیا صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی شرافت مجھ سے زیادہ تھی؟ یا اس کا بچہ میرے بچوں سے افضل تھا؟ علی رضی اللہ عنہ نے سلمان رضی اللہ عنہ سے کہا: ”دیکھو، محمد کی لڑکی کے پاس جاؤ، میں دیکھ رہا ہوں کہ مدینہ دو طرف سے زیروزبر ہو رہا ہے۔“

سلمان نے جا کر کہا کہ اے پیغمبر خدا کی صاحبزادی! خدا نے تمہارے والد کو رحمتہ للعالمین بنایا تھا، اس خیال سے باز آؤ، فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا اے سلمان! کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ لوگ علی (رضی اللہ عنہ) کے قتل کا سامان کر رہے ہیں اور جب وہ قتل ہوں گے، تو مجھ سے صبر ناممکن ہوگا، مجھے چھوڑ دو کہ میں خدا سے فریاد کرو، داد چاہوں۔ سلمان نے

کہا خوف ہے کہ مدینہ کہیں دھنس نہ جائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجھ کو آپ کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ آپ گھر چلی جائیں، چنانچہ اس فرمان کو سن کر وہ اٹھیں اور گھر روانہ ہو گئیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اسی صورت و ہیئت کے ساتھ کہ گلے میں رسی بندھی ہے اور قنفذ اس کو پکڑے ہوئے ہے، ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سامنے بیٹھے رہے۔

ابو بکر کہہ رہے ہیں کہ اگر تم بیعت نہ کرو گے، تو ہزار ذلت و خواری سے ہم تمہیں قتل کر دیں گے، حتیٰ کہ جواب و سوال کے ایک طویل سلسلہ کے بعد حضرت ابو بکر نے (العیاذ باللہ) کہا کہ: ”اے علی! دیکھو، اگر تم بیعت نہیں کرتے ہو، تو میں تمہارا سراڑا دیتا ہوں“۔ یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنکھ آسمان کی طرف اٹھائی اور کہا کہ الہی! تو گواہ رہ اور یہ کہہ کر بیعت کر لی۔

اس واقعہ کی صحت کے متعلق خود یہ واقعہ گواہ ہے پسلی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں والی عورت، جس کا حمل بھی ساقط ہو گیا، اس کا دوڑنا اور پھرنا، ہلچل مچانا کیا سمجھ میں آنے کی بات ہے؟ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسے بہادر جس نے اکیلے اپنے ہاتھ سے درخبر کو اکھاڑ کر پھینک دیا ہو، اس سے قنفذ جیسے آدمی کا تلوار چھیننا یعنی چہ؟ اسی طرح جن متضاد باتوں سے یہ روایت بھر پور ہے، ہم اس کی تفصیل کرنا نہیں چاہتے۔

اصل یہ ہے کہ یہی وہ روایت ہے، جس میں یہودیوں نے تمام غصول اور کینوں کا اظہار کیا ہے، عبداللہ بن سبآن نے اپنے نقیبوں کے ذریعہ سے اسے پھیلا دیا اور جو کچھ رسوائیاں یہودیوں کے ذمہ تھیں اس کا انتقام پورا ہو گیا۔

۱۔ فاتح خیبر کی ذلت و رسوائی قیامت تک اسی روایت کے ذریعہ سے مشہور ہوئی۔
 ۲۔ یہودیوں کو جس نے خیبر سے جلا وطن کیا، اس کی توہین و تکفیر کے لیے اس میں کافی سامان موجود ہے۔

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے بت پرستی اگر ان کے پیچھے کی، تو ابو بکر جیسے مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس کے سامنے مرتد ہوئے، (فلعنہ اللہ علی الکاذبین)

۴۔ یہودیوں نے نبیوں کو قتل کیا تھا، اس روایت نے بتا دیا کہ مسلمانوں نے بھی نبی

کی اولاد کو مارا، ان کی پسلی توڑی اور اسی میں ان کا انتقال ہوا۔

الغرض خیبر سے بھاگنے والے یہودیوں کی سازش نہایت کامیاب سازش ثابت ہوئی، عبداللہ ابن سبا ایک بڑا شخص ہوا، جس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسلام کے سفید دامن کو ان ذلیل دھبوں سے سیاہ کر دیا۔

دوسرے موقعہ پر:

﴿سماعون للكذب اكالون للسحت﴾

”جھوٹی باتوں کے سننے والے حرام خور ہیں“۔

اور اخیر میں غضب الہی ان پر اس قدر شدید ہوا کہ ان کو ملعونیت و منحوسیت کی خبریں وحی میں نازل فرمادیں:

﴿لعن الذين كفروا امن بنى اسرائيل على لسان داؤد

وعيسى بن مريم ذلك بما عصوا و كانوا يعتدون﴾

”ملعون کئے گئے وہ لوگ جنہوں نے بنی اسرائیل سے کفر کیا، داؤد (علیہ

السلام) کی زبان پر اور عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) کی زبان پر، یہ اس

لیے کہ نافرمانی کرتے تھے اور وہ حد سے بڑھ جاتے تھے“۔

ایک دوسرے موقع پر جتلا دیا گیا کہ تم ملعون ہو چکے، اپنی ان حرکتوں کی بدولت جو آئے

دن مدینہ میں کرتے رہتے ہو، خدا نے تمہیں ہمیشہ کے لیے مردود کر دیا اور ہر جگہ پٹو گے۔

﴿لئن لم ينته المنافقون والذين في قلوبهم مرض

والمرجفون في المدينة لنعرينك بهم ثم لا

يجاوزونك فيها الا قليلا ملعونين﴾

”منافقین (جو اکثر یہود تھے) اور وہ لوگ جن کے دل میں بیماری ہے اور

جو مدینہ میں بری بری خبریں اوڑھتے رہتے ہیں، اگر اپنی حرکتوں سے باز

نہ آئے، تو ہم تم کو ان کے ساتھ جنگ پر آمادہ کریں گے، پھر یہ تمہارے

ارد گرد بہت کم رہیں گے“۔

﴿اينما ثقفوا اخذوا وقتلوا تقتيلا﴾

”یہ ملعون ہیں جہاں کہیں بھی رہیں گے، پکڑے جائیں گے اور خوب اچھی طرح قتل کئے جائیں گے۔“

اور نہ صرف اس قدر، بلکہ آسمانی آوازوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ ان کی ملعونیت اب کسی خاص زمانہ تک محدود نہیں ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا کی ماران پر پڑی اور ذلت و بیچارگی ان پر ماردی گئی۔

﴿ضربت عليهم الذلة والمسكنه و بئاء و ابغضب من الله﴾
 ”ذلت اور محتاجی ان پر ماردی گئی اور اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹے۔“

اور ایک مقام میں نہیں، مختلف مقامات میں اس واقعہ آئندہ سے خبر دی گئی اور صرف انہیں آیتوں میں کیا.....! تم قرآن پڑھو، ایک حصہ ہے، جس میں یہودیوں کی شرارت، بے ہودگیوں، سرکشوں کو اللہ تعالیٰ نے نہایت لفظوں میں ذکر کیا ہے۔

یہود ہر ایک مسلمان کی زبان سے اپنے ان حالات و شفاعات کو سنتے تھے اور مسلمانوں کی جانب ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا، جو کچھ ان سے ہوسکا کر گزرے، لیکن وعدہ الہی کو پورا ہونا تھا، یہ تباہ ہوئے اور اچھی طرح تباہ ہوئے، حتیٰ کہ ان کا اصلی مقام خیر بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک سے فتح ہوا اور یہ پہلا واقعہ تھا جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عداوت کو خصوصیت کے ساتھ ان کے دلوں میں راسخ کر دیا۔

یہود جب مفتوح ہوئے، تو انہوں نے مسلمانوں سے امن کی درخواست کی، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عرض داشت قبول کی۔ قول و قرار کے بعد آپ خیر میں داخل ہوئے کہ اسی عرصہ میں ان لوگوں نے ایک گہری سازش کی، یعنی: سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت کے بہانے سے زہر کھلا دیا، جس کا قصہ غام طور سے مشہور ہے کہ خیر میں آپ کے سامنے بھنی ہوئی بکری ایک یہودیہ عورت نے پیش کی تھی، جس میں زہر ملا ہوا تھا۔ آپ نے جس وقت اس کا لقمہ منہ میں ڈالا، گوشت نے اطلاع دی کہ مجھ میں زہر ہے، آپ نے فوراً ہاتھ اٹھا لیا، ایک صحابی کھا چکے تھے، ان کا تو اسی وقت انتقال ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہے کہ بعض روایتوں میں آپ کی وفات خیر کے زہر سے ہوئی، جو ایک زمانہ کے بعد پھرا بھرا اور جان ہی لے کر ملا۔

بہر کیف یہودیوں کی انہی شرارتوں کے بدولت آپ نے ارادہ کر لیا تھا کہ خیبر سے ان کو نکال ہی دیا جائے، مگر ان مکاروں نے پھر گریہ زاری کی، آخر آپ اس پر راضی ہو گئے کہ تم لوگ ابھی خیبر میں رہو، لیکن ہمیں اختیار رہے گا کہ جب چاہیں، تم لوگوں کو یہاں سے نکال دیں۔ سرور کائنات ﷺ نے عہد مبارک، بلکہ صدیقی تک وہ اس رعایت کی بدولت خیبر ہی میں رہے، لیکن آئے دن فتنے اٹھاتے رہتے تھے، روز بروز نئی نئی ترکیبوں کے ساتھ مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہے، بالآخر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی اختیار کی بنا پر جس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول میں کر چکا ہوں، ان کو خیبر سے جلا وطن ہی کر دیا اور ہمیشہ کے لیے ان مفسدوں سے زمین عرب پاک ہو گئی۔

یہودی خیبر سے نکلنے کو تو نکلے، لیکن مسلمانوں کے بغض کا کاٹنا ان کے دل سے نہ نکلا اور کیونکر نکلتا، روز بروز واقعات و حالات تو اس کو اور بھی زیادہ گہرا کر کے ان کے دلوں میں پیوست کر رہے تھے۔

الغرض انہی باتوں کا آخری نتیجہ وہ تھا جو اسلام کے لیے ایک فتنہ عظیمہ کی صورت میں ظاہر ہوا اور اس طرح ظاہر ہوا کہ پھر کبھی دب نہ سکا۔

یہودیوں کی دولت برباد ہوئی، ان کا اقتدار مٹا، مسلمانوں کے منہ سے ہر وقت لعن طعن کی بوچھاڑیں ان پر برسیں، ان کا ملک ہاتھ سے گیا، اخیر میں یہ کہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو ملک سے بدر کیا، گھر سے بے گھر ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان سخت سخت حالتوں سے جو سازش پیدا ہو سکتی تھی، وہ کتنی عمیق اور کس قدر مخفی ہوتی، پتہ تک نہیں چلتا کہ کیونکر اسلام اس سازش کا شکار ہو گیا، تاہم تاریخی واقعات بکھری ہوئی صورتوں میں اس وقت بھی موجود ہیں، ان سے ایک عقلمند صاحب بصیرت آدمی اصل حال تک پہنچ سکتا ہے، تاریخ ”کامل بن اشیر“ میں جو سنوں کی ایک مستند کتاب ہے، اسی طرح ”ناخ التواریخ“ میں جو شیعوں کی ایک معتبر اور جلیل القدر تاریخ ہے، ایک واقعہ نقل کیا ہے، جس سے یہودیوں کی اس سازش کا راز واضح ہوتا ہے۔

کامل صفحہ: ۹۸ اور ناخ التواریخ: ۴۲۵ کا خلاصہ یہ ہے کہ:

جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وفات پائی اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

خلیفہ مقرر ہوئے، تو یہودیوں میں سے ایک شخص نے جس کا نام عبد اللہ بن سبا تھا، اپنے کو مسلمان ظاہر کیا، اس طرح وہ مسلمانوں میں آکر شامل ہو گیا، اس کے بعد کچھ معلوم نہیں کہ کس غرض سے وہ مسلمانوں کے مرکزی شہروں میں گھومتا رہا، حجاز آیا، بصرہ گیا، کوفہ پہنچا، شام کے شہروں میں چکر لگاتا رہا، آخر میں وہ مصر پہنچا، وہاں کے مسلمانوں سے اس نے بہت ربط و ضبط پیدا کیا، چونکہ اس کی تقریر نہایت شستہ اور بیان عمدہ تھا، لوگ عموماً اس کی باتیں سننے کے لیے اس کے پاس آئے۔

ایک دن برسبیل تذکرہ اس نے کہا کہ میں اب تک اس مسئلہ کے سمجھنے سے عاجز ہوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لوٹنے کی خبر پر ہم لوگ یقین کرتے ہیں، لیکن اپنے نامدار سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی موت ابدی کے قائل ہو گئے، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کیا حقیقت ہے.....!

اگر حضرت عیسیٰ دوبارہ اس دنیا میں آئیں گے، تو کوئی وجہ نہیں آپ سے جو افضل و اعلیٰ ہیں، وہ واپس نہ ہوں، مسلمانوں نے جس وقت اس کی یہ تقریر سنی، تو بہت سے لوگ اس کے حامی ہو گئے اور اکثر مصری مہمان قائل ہو گئے کہ بیشک ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی واپس تشریف لائیں گے اور یہ پہلی بات تھی کہ ایک خاص عقیدہ میں وہ بعض مسلمانوں کا پیشوا ہو گیا، چند دنوں تک تو اس پر زور آزمائی کرتا رہا اور رجعت پسند فرقتے کو اس نے عام مسلمانوں سے الگ کر لیا۔

اس کے بعد اس نے پھر ایک دن کہا کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کے لیے ایک وزیر و وصی ہارون تھا، تو کیا اس کی فضیلت سے ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم محروم تھے؟ مسلمانو! کیا بات سمجھ میں آسکتی ہے؟ بادشاہ بغیر وزیر کے نہیں ہوتا، نبی بغیر وصی کے نہیں ہوتا، پھر اگر آپ نبی تھے، تو ضرور ہے کہ آپ کا کوئی وصی بھی ہو، امت کی تمام مشکلات کو حل کرنے والا نبی کے بعد وصی ہی ہوتا ہے، پھر مسلمانو حالانکہ وہ موجود ہے، لیکن تمہاری اندھی آنکھوں نے اس کو نہیں پہنچانا، یا پہچانتے ہو، تو پھر تم کو تنبیہ نہیں ہوتی کہ وہ بیچارہ کس حال میں گرفتار ہے۔

قاعدہ ہے کہ جب ایک شخص کسی فرقہ کا ایک مسئلہ میں پیشوا ہو جاتا ہے، تو عموماً اور

مسائل میں بھی لوگ اسی کی تقلید کرتے ہیں، مثلاً: ہندوستان میں علم غیب کا ایک مسئلہ ہے، جس کی بدولت مولوی احمد رضا خان صاحب ایک خاص فرقے کے پیشوا ہیں، مگر کیا یہ ممکن ہے کہ ان کے پیروکار اس مسئلہ کے علاوہ کسی اور مسئلہ میں ان کی مخالفت کر سکیں اور یہی حال ہر فرقہ کا ہے، پیشوائی کے لیے صرف ایک مسئلہ کافی ہے۔

جو فرقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رجعت کا قائل ہو گیا تھا، وہ بیتاب ہوا کہ آخر آپ ہی بتائیے کہ وہ وصی کون ہے، کیونکہ بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی کی ضرورت ہے۔ آخر آپ موسیٰ علیہ السلام سے تو کسی طرح کم نہیں تھے۔ عبد اللہ بن سبا کی پہلی کامیابی تھی کہ اس نے مسلمانوں کو وصی کا منتظر بنا دیا اور جب ان کی تمنا حد سے زیادہ ہوئی، تو اس نے اعلان کر دیا کہ وہ وصی حضرت علی کرم اللہ وجہہ دانا اور برادر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لیکن آہ عثمان نے اپنی زبردستی سے اس کی خلافت پر قبضہ کر لیا، جس طرح ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے محض خود غرضی سے ان کو منصب سے الگ کر دیا، مسلمانو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لانے والے ہیں کیا یہی اسلام و ایمان ہے کہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی تو یوں در بدر مارے پھریں اور ظالم و غاصب لوگ ان کی جگہ لیں، ہم اپنے پیغمبر کو کیا منہ دکھائیں گے؟

مصر کے بد قسمت مسلمان اس کو مسئلہ رجعت سے پیشوا مان چکے تھے، چلائے کہ آخر وصی کے حقوق کیونکر واپس ہو سکتے ہیں عثمان کو قوت مسلم ہے اور تمام فوج ان کے ہاتھ میں ہے، ہم کس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلافت دلا کر اپنے خدا و رسول کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں؟

عبد اللہ بن سبا اس کی تدبیر پہلے کر چکا تھا، جس مقصد سے اس نے پہلے اسلامی شہروں کا دورہ کیا تھا، اس کے کارآمد ہونے کا وقت آ گیا، اس نے کہا کہ اس کی تدبیر تو آسان ہے، تم میں کچھ لوگ تیار ہو جائیں، وہ اسلام کے مرکزی شہروں میں پھیل جائیں اور عثمان کے مقرر کردہ حکام و قاضیوں کی شکایت سے ہر ایک جگہ بددلی پھیلا دیں، تم جانتے ہو کہ قضاة ایک ایسا عہدہ ہوتا ہے کہ جس میں دو فریق کے درمیان محاکمہ کیا جاتا ہے، فیصلہ میں ہمیشہ ایک شخص محروم اور دوسرا کامیاب ہوتا ہے، محرومیوں کو قاضی سے اسی لئے عداوت ہوتی

ہے، تم جس وقت ان کی شکایت کرو گے، ایسے لوگ بکثرت ملیں گے، جو تمہارے ہم نوا ہو جائیں گے، بلکہ اس وقت مسلمانوں میں دولت کی کثرت ہے، عموماً لوگ عیش پسند ہو گئے ہیں، اونچے اونچے مکانات، اچھے کپڑے پہنتے ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود نہ تھے۔ تم ایسے حکام پر اعتراضات کی بوچھاریں برسانی شروع کر دو اور عبرت دلاؤ کہ یہ تمام امور بدعت ہیں اور مسلمان وہ مسلمان نہیں رہے، جو عہد نبوی میں تھے، خواہ مخواہ لوگوں کو تمہاری طرف میلان ہوگا اور ایک بڑی جماعت تمہارے ساتھ ہو جائے گی، اس کے بعد سلطنت میں انقلاب کا پیدا کر دینا آسان ہے۔

الغرض اس کے نقباء ملک میں پھیل گئے، عبد اللہ بن سبا ان سے پہلے ہی ہر شہر میں اپنے ہم خیال لوگوں کو چھوڑ کر آیا تھا، جن میں اکثر وہ لوگ تھے، جو یہودی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گئے تھے۔ جہاں جہاں اس کے نقیب پہنچے، اندرونی طور پر انہوں نے کاروائی شروع کر دی، سازش چونکہ مستحکم تھی، بہت جلد مشر ہو گئی اور شہر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکام کی جانب سے دلوں میں عداوت و مخالفت پیدا ہو گئی، عبد اللہ بن سبا کے اشارے سے یہ لوگ ایک کمیٹی کی صورت میں مجتمع ہونے لگے، جس کی صدر کمیٹی مصر میں قرار پائی۔

عبد اللہ بن سبا نے ایک اور تدبیر بھی بتائی تھی، یعنی: اس نے اپنے نقیبوں سے تاکید یہ حکم کیا تھا کہ تم ہر شہر کے حاکم کی شکایت دوسرے شہر کے لوگوں کو لکھو، تاکہ عموماً دوسرے شہر کے لوگ اس حاکم سے بدظن ہو جائیں۔

الغرض اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک شہر میں ایک جماعت پیدا ہو گئی، جو اپنے حاکموں سے ناراض تھی اور ایک دوسرے شہر کے رعایا اپنے حاکم کے علاوہ اور دوسروں سے بہت زیادہ برسر پر خاش ہو گئی تھی، حتیٰ کہ رفتہ رفتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک بھی یہ خبریں پہنچیں، آپ نے فوراً لوگوں کو بھیجا، انہوں نے جب خفیہ طور پر خود حاکموں کا معائنہ کیا، تو رپورٹ دی کہ شکایات محض بے اصل ہیں، آپ سن کر خاموش ہو گئے، آپ تو خاموش تھے، لیکن عبد اللہ کی کاروائیاں وسیع ہو رہی تھیں، حتیٰ کہ جب شورش پسندوں کی ایک کافی جمعیت پیدا ہو گئی، تو متفق ہو کر انہوں نے خلافت عثمانیہ سے اعلان بغاوت کر دیا، مصر سے بقول ”ناخ التواریخ“ دو ہزار آدمی مسلح اور اسی قدر بصرہ، کوفہ سے مدینہ منورہ پایا گاہ خلافت کی طرف

روانہ ہو گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں کی اس سازش کی خبر پہلے دے چکے تھے، آپ نے فرمایا تھا کہ: ”لغت ہے ذی مروہ، اعوض، ذی اخب میں اترنے والی فوجوں پر“ اور یہ لوگ انہیں تینوں مقاموں میں اترے، کہا جاتا ہے کہ مصر کا لشکر ذی الروہ اور لشکر کوفہ اعوض اور لشکر بصرہ ذی اخب میں آ کر اترتا تھا۔ بہر حال انہوں نے مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا اور اسی جنگ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے اور آہ کہ یہودیوں کا قدیم کینہ آج اس صورت میں ظاہر ہو گیا۔

تاریخ کامل میں ہے کہ ابن سبا کی اس جماعت نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لاش کو بے گور و کفن تین دن تک یوں ہی ڈال دیا، حتیٰ کہ آپ کے پائے مبارک کو کتے کھا گئے تھے، اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی کوشش بلخ سے باغیوں نے دفن کرنے دیا اور اسی کے بعد ان تمام فتنوں کا دروازہ کھل گیا، جس کا علم ہر ایک مسلمان کو ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مصیبتوں میں مبتلا ہونا پڑا، عبد اللہ بن سبائے اپنی اس سازش کا سارا الزام فاتح خیبر کے سر ڈال دیا، مسلمان حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر ٹوٹ پڑے اور یوں اسلام کے شیرازہ میں ابتری پیدا ہو گئی، عبد اللہ بن سبائے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو وحی مشہور کیا، حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو غاصب قرار دیا، حتیٰ کہ اخیر میں اس نے اعلان کر دیا کہ ابو ذر رضی اللہ عنہ مقداد، سلمان رضی اللہ عنہ کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام صحابہ (العیاذ باللہ) ملحد و بے دین ہو گئے تھے حتیٰ کہ شیعوں میں وہ حدیث جو عبد اللہ بن سبا کی اوڑائی ہوئی ہے، اب تک مشہور ہے۔

”ناسخ التواریخ“ جلد دوم میں ہے:

”از ابی جعفر حدیث کنند قال: ”کان الناس اهل ردة بعد

النبي صلى الله عليه وسلم الا ثلاثة“. پرسش کروند یا ابن

رسول اللہ آن سرتن کینند۔“

قال: مقداد بن اسود، ابو ذر الغفاری و سلمان

الفارسی“. فقط

یہ جواب تھا یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں کو کہ مسلمان کہتے تھے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جب کہ تورات لینے گئے، بت پرستی شروع کر دی، یہودیوں نے مسلمانوں میں یہ عقیدہ پھیلا دیا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام صحابہ اس وقت مرتد ہو گئے۔

الغرض یہودیوں کا جو کچھ عقیدہ تھا، ان کی جو کچھ رسوائی نصیب ہوئی تھی، ایک ایک کر کے مسلمانوں میں خفیہ طور پر پھیلائی، مثلاً: یہودیوں کا عقیدہ تھا جس کا پتہ ”السلل والنخل“ سے ملتا ہے، ممکن ہے کہ اب نہ ہو:

”یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام یا تو غائب ہو گئے ہیں اور پھر آئیں گے اور بعضوں کا عقیدہ ہے کہ نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو قتل کر دیا اور پھر دوبارہ زندہ ہوں گے۔“

مسلمان اس عقیدہ میں مضحکہ اڑاتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس نے بھی یہ بات ایک خاص فرقہ تک پھیلا دی، حتیٰ کہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک جماعت اب بھی امام العصر کے سرداب سے نکلنے کی منتظر ہے، اسی ”السلل والنخل“ سے معلوم ہوتا ہے کہ: ”یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ نبوت حضرت موسیٰ، ہارون علیہما السلام کے اندر مشترک تھی اور حضرت ہارون علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے وصی بھی تھے، لیکن جب ہارون علیہ السلام کا انتقال موسیٰ علیہ السلام ہی کے زمانہ میں ہو گیا، تو یہ وصیت یوشع بن نون کے پاس ودیعت کر دی گئی اور موسیٰ علیہ السلام نے سبھا دیا کہ تورات کے اسرار والواح کے اصلی وصی ہارون کے بیٹے شبر و شبر ہیں، جب وہ بڑے ہوں، ان کو پہنچا دینا۔“

چونکہ یہ محض بے اصل باتیں تھیں، مسلمانوں نے اس پر لعن طعن کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ عبداللہ بن سبا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصی قرار دے کر شبر و شبر، حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو بنایا، حتیٰ کہ آج آپ دونوں کے نام بھی شبر و شبر مشہور ہیں۔

(علماء دیوبند کی یادگار تحریریں)

(بحوالہ ماہنامہ القاسم، دیوبند)

الجنة والنار

تمہارا عقیدہ ہے کہ سکھیا زہریلا ہے، اس کے عناصر کی ترکیب امتزاجی نے وہ آتشیں مزاج بہم پہنچایا ہے، جس کی ایک ہلکی سی چنگاری نہر حیوۃ کی چلتی ہوئی کیاریوں کے دھوئیں اڑا دیتی ہے۔ تم یقین کرتے ہو کہ اس کا ایک ہلکا سا ریزہ، بڑے سے بڑے تناور جٹوں، نفل پیکہ ہیکلوں کے استوار و محکم نظام کو چند انون میں درہم و برہم کر دے سکتا ہے اور آہ! کہ تمہیں اپنے اس عقیدہ پر اس درجہ اصرار ہے کہ خود وہ تو وہ، اس کی صورتِ مخیلہ بھی تمہاری نگاہوں میں بھیا تک معلوم ہوتی ہے، کھانا تو کجا، اس کے چھونے تک پر تم آمادہ نہیں، مزعفر، کی قعبوں، تورموں کے پیالوں (دوروزہ فاقہ کی شدید گرسنگی کے ساتھ بھی) تم لات مارنے سے اس وقت نہیں بھجکتے، جبکہ خدا نخواستہ اس میں ایک رتی سکھیا ہونے کا یقین نہیں، بلکہ صرف شک ہو جائے۔

یہ سب کچھ ہے اور ہمیں بھی اس کی سمیت جان گسل میں کوئی شبہ نہیں، لیکن کیا تم نے اپنے یقین پروردل سے کبھی یہ بھی پوچھا کہ آخر اس تصدیقِ راسخ، اس اعتقادِ مستحکم کو تم میں کس نے پیدا کیا؟ کس قطعی وسیلے سے یہ نہ مٹنے والی تسلیم اندرون قلب میں اتر آئی۔

کیا اس کی سمیت قاتلہ کو آنکھوں نے دیکھا؟ حالانکہ نہیں دیکھا کہ وہ دیکھنے کی چیز نہیں، تو پھر کیا اس کے زہر کونا کون سے سونگھا؟ حالانکہ نہیں سونگھا کہ وہ سونگھنے کی چیز نہیں، پھر کیا اس کے ہل ہل پاش اثرات کو کانوں نے سنا؟ حالانکہ نہیں سنا کہ وہ سننے کی چیز نہیں اور جب یہ سب کچھ نہیں، تو کیا ہاتھوں نے اسے چھو کر ہمیں خبر دی کہ وہ اپنے اندر مرگ پر داز خاصیت کو سمیٹے ہوئے ہے؟ حالانکہ نہیں چھوا کہ وہ چھونے کی چیز نہیں، پھر آہ! جب کہ وہ ان تمام احساسی وسائل کی ادراکی سرحدوں سے باہر ہے، تو کیا میں نے اسے کھا کر سمجھا، چکھ کر جانا؟ حالانکہ یہ بھی نہیں ہوا کہ جس نے اسے کھایا ہے، اس نے پھر کچھ نہیں کھایا، جس نے اسے چکھا، پھر اس نے کچھ نہیں چکھا۔

تم نے دیکھا کہ ایک یقین ہے، تمہارے دل و دماغ میں رچا ہوا ہے، اور اس پر تمہیں

مختصر سوانح حالات و خدمات

ہر طرح کا اطمینان و بھروسہ ہے، پس اب جبکہ تم کو اپنے حواسوں سے صاف جواب مل چکا ہے، پوچھو ان سے جو اپنے یقینات کو صرف حواس کی تحصیلوں پر منحصر کر رہے ہیں، ان سے دریافت کرو کہ یہ یقین دل میں میرے غیر سبب کیا معنی؟ یقین، و اعتقاد، تو حادث ہے، ممکن ہے، پھر علت سے غناء تو ممکن نہیں، حواسوں پر علت کا شبہ تھا، وہ بھی صاف ہو گیا۔ تم جانتے ہو کہ وہ اس کا جواب اب کچھ نہیں دے سکتے کہ ان کے آلات یقینہ بیکار ہو چکے اور جب وہ نہیں دے سکے، تو اب میں تم سے کہتا ہوں کہ ان حواس پرستوں پر سمجھ کے دروازے بند ہو چکے، ان کے سینے تنگ اور دل تاریک ہو کر برباد ہو چکے اور یہ کوئی عجب نہیں کہ ان کی قسمت میں یہی مقدر ہو چکا ہے۔

﴿وَمَنْ يَرِدْ أَنْ يَضِلْهُ صَدْرُهُ ضَيْقًا حَرَجًا كَانَمَا

يَصْعَدُ فِي السَّمَاءِ كَذَا لَكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرَّجْسَ عَلِي

الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ (الانعام: ۴۱)

”اور جس کے متعلق خدا ارادہ کرتا ہے کہ وہ سیدھی راہ نہ پائے، تو اس کے

دل تنگ کر دیتا ہے، حق کے سمجھنے میں وہ ایسا خیال کرتا ہے کہ آسمان کی

طرف چڑھ رہا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بے ایمانوں پر ناپا کیوں کا

چھاپا لگا دیا ہے۔“

جھٹلانے والے دماغوں، ٹھٹھے کرنے والے دلوں کا یہی حال ہے کہ فہم و فراست کی

بارشیں ان پر روک دی جاتی ہیں، پھر وہ سب کچھ دیکھتے ہیں، مگر سمجھتے نہیں، سب کچھ سنتے

ہیں، پر بوجھتے نہیں۔

تم ان کی کوتاہ عقلوں، تنگ سمجھوں پر نوحہ ماتم کرتے ہوئے، فطرت کے مسلمہ قواعد،

نظام ہستی کے غیر مکذوب اسباب کے اندر ڈھونڈو، ان احمقوں سے الگ ہو کر خود وقفِ جستجو ہو

جاؤ۔ کوئی مشکل راز نہیں، چنداں الجھا ہوا عقدہ نہیں کہ سلجھ نہ سکے۔

﴿فَمَنْ يَرِدْ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ﴾

”جن کو خدا سیدھے راستے پر چلانا چاہتا ہے، ان کے سینے اسلامی امور

کے سمجھنے کے لیے کھول دیتا ہے۔“

تم غور کرو گے تو واضح ہوگا کہ اصل وجہ اس حدوث یقین کی کچھ نہیں ہے، بجز اس کے جب سے تم نے ہوش و حواس سنبھالے، فہم و ادراک کی تم میں طاقت آئی، دنیا کو تم نے اس پر متفق پایا، جس سے سنا، جب سنا، یہی سنا کہ سنکھیا قاتل ہے۔ ہلاہل ہے، زہر ہے، قوموں میں پھرے، کتابوں کا مطالعہ کیا، ہر ایک سمت سے یہی آواز آتی رہی کہ سنکھیا جانسوز ہے، پیغام اجل ہے، سم ہے، یقین کرو کہ یہی متفقہ صدا، یہی اجماع ام، دراصل علت ہے اس نہ لٹنے والی کیفیت اعتقاد یہی کی، جس کے بیان علت میں دلدادگان حواس۔

﴿كالذی استهوتہ الشیطنین فی الارض حیران﴾

”مثال ان کی جنہیں شیطانوں نے جنگل میں بھٹکا دیا اور وہ سرگرداں ہو

رہے ہیں۔“

کے پورے مصداق بن چکے تھے۔

اور بلاشبہ یہ وہ اصل عظیم ہے کہ جس پر ہمارے ہزار ہا نظریات، صد ہا تصدیقات کی بناء قائم ہے، یہ وہ زبردست آکہ تصدیق ہے، جس کے مقابلہ میں ممکن ہے کہ غلطی ہو اور ہوتی ہے، بڑی چیز چھوٹی، اور چھوٹی بڑی نظر آتی ہے، رسی کو سانپ کی صورت میں کبھی دیکھتے ہیں اور کبھی سانپ کو چکنی لاٹھی سمجھ کر ہاتھوں سے دھر لیتے ہیں اور یہ صرف میں ہی نہیں کہتا، خود اسی مغرور جماعت کو بسا اوقات اپنی غلطی مانی پڑتی ہے، بلکہ انتہائی بوالہجھی یہ ہے کہ کبھی جب اپنے مزعومات فاسدہ کے ثبوت میں ایک کو دقتیں حاصل ہوتی ہیں، اپنے بافہدہ عقائد کو دلائل کے اسلحہ سے خالی دیکھتے ہیں، تو پھر یہ بھی اسی کے سائے میں پناہ لیتے ہیں، تم نے سنا ہوگا کہ کچھ دنوں سے فیثا غورس کی ایک ہونے انہیں دیوانہ بنا دیا ہے، اس نے کہا تھا کہ ”دن رات کے پیدا ہونے کی علت، تبدیل موسم کا سبب، حرکت زمیں ہے۔“ جب اس نے یہ کہا تھا اس وقت اس کے منہ پر اس نظریہ کو مار بھی دیا گیا تھا، لیکن یہ ”جبارین فی الارض“ جن کی عادت ہے کہ عام مسلمات کے خلاف کسی پارہ عقیدہ کی احیا کر کے، عصر موجود، اور قرون سابقہ کی عقلوں کا مضحکہ اڑائیں، فیثا غورس کے اس اشارے کو پاتے ہی چلا اٹھے، نا سمجھی نے ان کی تکمیل تھامی اور یہ اس کے پیچھے روانہ ہو گئے، ان سے پوچھا جاتا ہے کہ حرکت تو آنکھوں سے دکھائی دیتی ہے، زمین اگر متحرک ہوتی، تو بجائے اس کی

احساس کے آفتاب کیوں چکر کا ثنا نظر آتا ہے۔ ہمیں اس سے ابھی بحث نہیں کہ یہ اعتراض ان پر کس حد تک صحیح ہے، صرف سنا نا یہ ہے کہ اس کے جواب میں انہوں نے بھی اپنے قابل وثوق حاسوں کو بدنام کیا، اون یقینیات کے دیوتاؤں پر، غلط فہمی کا الزام تھوپا، انہوں نے کہا کہ آنکھ کو اگر زمین کی حرکت محسوس نہیں ہوتی، تو اس کی غلطی ہے، آفتاب گھومتا ہوا، اس کو نظر آتا ہے، تو یہ دھوکہ ہے، زمین پر ہاتھ رکھنے سے اگر اس کا چکر آنا معلوم نہیں ہوتا، تو حرکت کا تصور نہیں، قوتِ لامسہ کا گناہ ہے، اگر ہوا میں کوئی چھوٹا سا جسم گھمایا جاتا ہے اور اس کی ہینہناہٹ کان سنتے ہیں اور زمین جو کڑھ ہوا میں اس قدر سرعت سے گھوم رہی ہے، اس کی آوازاں میں نہیں پہنچتی، تو زمین کا کیا جرم، کان ہی بھرے ہیں۔

﴿انظر كيف كذبوا على انفسهم و ضل عنهم

ما كانوا يفترون﴾

”تو دیکھو، کس طرح خود اپنے اوپر جھوٹ بولے اور کھوئی گئی ان سے وہ

باتیں جو بنایا کرتے تھے۔“

غرض یہی وہ لوگ ہیں، جو کہتے تھے کہ ”جن کو ہمارے حواس نہیں دیں گے، ہمیں ان کے نفی و اثبات سے کوئی بحث نہیں۔“ آج دیکھو حواس سے بھی بھروسہ اٹھالیا گیا اور کچھ دور نہیں کہ یونان کے سوفسطائیوں کی طرح دیوانے ہو کر یہ بھی ہلاکت و بربادی کے جنگلوں میں گم ہو جائیں۔

خیر ابھی اس سے کیا بحث، ان مسکینوں کی مردہ عقلوں پر نالہ و شیون کرنے کے لیے ہمارے پاس انشاء اللہ تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ سامان موجود ہیں۔ اگر زندگی نے وفا کی، تو اسے بھی کبھی سن لینا، ہمارے ساتھ استہزاء و تحریہ کرتے ہیں، مگر ہمیں ان کی نادان عقلوں پر رونا آتا ہے، رحم آتا ہے۔

﴿مالهؤلاء القوم لا يكادون يفقهون حديثاً﴾

”آخر اس قوم کا کیا ہو گیا ہے کہ بات سمجھنے کے گرد بھی نہیں بھٹکتے۔“

اس لئے ہمدردی اور سوز جگر سے مجبور ہو کر کبھی کوئی جملے نکل آتے ہیں، ورنہ وقت اس کا نہ تھا، بلکہ گفتگو اس میں تھی کہ مندرجہ بالا اصل سے کسی ثابت شدہ نظریہ کی کیا ہم تکذیب

کر سکتے ہیں؟ تم نے سکھیا کی مثال میں سمجھ لیا ہوگا کہ یقیناً یہ وہ اصل ہے، جو ہمارے تمام معاشرتی، تمدنی، منزلی امور میں بہ نسبت اورالاتِ ادراک کے بہت زیادہ کارآمد ہے، ہمیں حاسوں کی ادراک کا انکار نہیں، ان کے فوائد سے میں اعراض نہیں کرتا، لیکن کہنا صرف اس قدر ہے کہ جہاں ان پر تصدیقات کی بناء قائم کی جاتی ہے، ان کو نہایت مہتمم پیرایوں میں اکتسابِ نظریات کے مواقع میں پیش کیا جاتا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ اس کے مقابلے میں توافقِ ام، تو اطواءِ اقوام کے قانون کو تحقارت و ناتوجہی کی ٹھوکروں سے ٹھکرایا جائے، کیونکہ تم جانتے ہو کہ جس نے اس کی پروانہ کی اور تمام عالم سے الگ ہو کر غرور و اجتہاد میں مست ہوتا ہوا جدت پرستی کی شراب میں مخمور ہو کر ان عقائد کی زنجیروں کو جن میں تمام عالم، ہر ایک تنفس کی قوی دماغی، جکڑے ہوئے ہیں، توڑ کر مثلاً: سکھیا کی تاثیرات کو خرافاتِ الحجائز کہہ کر آزمائش ہی کے لیے کہا گیا، تو پھر اس کا نتیجہ کس خطرناک صورت میں رونما ہوگا، میں اس کا جواب اس دیوانہ کو کچھ نہیں دینا چاہتا کہ وہ وقت دور نہیں، جبکہ اسی سکھیا کے لب و دندان سے وہ جواب اس وقت سن لے گا، جس کے بعد سنناریکار ہو جاتا ہے اور عبرت و رجوع کا خیال لاسود ثابت ہوا ہے۔ وہ محسوس کرے گا کہ اس کے جسم میں دوڑنے والے خون کھول کر کھول کر خشک ہونے لگے ہیں، رگیں اینٹھ رہی ہیں۔ اس کے منہ پر جھاگ جھاگ پر آئیں گے، پیاس کی شدت سے اپنے تمام جسم میں چنگاریاں اڑتی ہوئی نظر آئی گی، وہ چلائے گا، دوایں مانگے گا، لیکن آہ! کس قدر حسرت کا وقت ہوگا، جبکہ جسم کے ہر ہر عضو سے:

﴿لَا عَاصِمَ لَكُمْ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ﴾

”آج کوئی خدا کے حکم سے بچانے والا نہیں۔“

سنے گا اور بصد کرب و تکلیف اس کی سانس اُکھڑنے لگے گی۔ آہ! کہ ایک طرف اس کے بیجا غرور، و تشدد کی دیواریں پست ہو جائیں گی اور دوسری جانب ہمیشہ کے لیے اس آزمائش و ابتلاء کے گھر کو، جسے اس نے کھیل، کود، ہنسی، تفریح کا کاشانہ سمجھ رکھا تھا، یکا یک تہسپتے ہوئے چھوڑ دینے پر مجبور ہونا پڑے گا، پھر اس کے بعد جو کچھ ہے، وہ خود جان لے گا۔

﴿وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ﴾

”عنقریب ظلم کرنے والے جان لیں گے کہ کس پھلو قرار لیتے ہیں۔“

آہ! کہ بگڑی ہوئی طبیعتوں کے بوسیدہ عقلوں پر روئے، واحسرتا! کہ وہ کس قدر ابتر ہو رہی ہے، کم فہمی، بے سمجھی کی کتنی سیاہ و کوہ پیکر موجوں میں وہ ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، نجات و فوز کی کشتی سامنے ہے، لیکن وہ مغرور کس درجہ سراب پرست ہو گیا ہے کہ اپنی ناچیز، بے مقدار، قریب پرواز ادرا کی قویٰ کو پہاڑوں کی چوٹیاں سمجھ کر کشتی پر بلانے والوں کی مشفقانہ آوازوں کو ”لعلی ساوی الی جبل“ (میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا) کی متجرانہ ڈانٹ کے نیچے دبانا چاہتا ہے۔ اس کی عقل نے سمجھایا کہ پانی کا اس قدر چڑھ آنا جو ہالیہ کی چوٹیوں کو بھی ڈھانک لے عادت اور نیچر کے خلاف ہے، لیکن اسے کیا معلوم کہ ”فطرت“ اور ”نیچر“ کی کہاں تک حد ہے، جس نے موجودات کو طبیعت کا پابند بنایا ہے، اسی نے ان میں کس حد تک طاقت رکھی ہے، اسے کس نے سمجھایا کہ ہر وقت ہر زمانہ ہر گھڑی، ہر مکان کے لئے، طبیعتوں میں کیا کچھ باتیں محفوظ کی گئی ہیں۔ اگر ماضی کا پتہ تاریخ نے بتایا، حال کا اندازہ اس نے خود لگایا، تو مستقبل کی اسے کیا خبر؟ پس یہ غلط ہے کہ ”وہ ستہ اللہ“ کا پابند ہے، نہیں، بلکہ اپنے محدود واقفیتوں کا وہ ایک ہی پجاری ہے، وہ اپنی سطحی معلومات کے بت کا اکیلا پرستار ہے، ”اف لکم ولما تعبدون“ (تف ہے تم پر اور جس چیز کو تم پوجتے ہو) اور پھر اس پر بھی تو قرار نہیں، اس کے معارف و مدارک بھی عجوبہ پرداز یوں کی نہایت ہی مضحکہ خیز نمونے ہیں۔ تم خود غور کرو، وہ کس درجہ عجب النظریات ہستی ہے، آہ! کہ یہ وجود، جس کو آنکھوں نے دیکھا اور بارہا دیکھا، چند آنی جانی والی گھڑیوں کے بعد، مشت استحوال سے زیادہ اس کی کوئی وقعت نہیں رہتی، کانوں نے سنا کہ تشدد، استکبار سے لبریز کھوپڑیاں کتنی ہیں، جو آج گدھوں کے کہروں کے نیچے بصد ہزار کس میرسی پامال ہو رہی ہیں۔ الغرض باوجود اس قطعی یقین کے کہ ماحصل اس برف اساحیوۃ کا گداخت و زوال کے علاوہ کچھ نہیں اور یقیناً کچھ نہیں، مگر وہ نادان و جہول، صرف صرف اس کے بچانے کے لیے (حالانکہ کب تک بچا سکے گا) کس مستعدی کے ساتھ اضطرابی طور پر اس کی حراست و حفاظت میں سرگرم کار ہے۔

غصہ کی انتہا دیکھو کہ ایسے موقعوں پر اگر اسے خوف کا کھٹکا بھی ہوتا ہے، کسی چیز کا شک

بھی ہوتا ہے، تو مدہوش ہو کر تمام قوانین عقلیہ سے الگ ہو کر، اسے یقین کی صورت میں بدل لیتا ہے۔ اس وقت وہ شک کا بھی اس درجہ پابند ہو جاتا ہے کہ شاید یقین کا کبھی نہ ہوا ہوگا، اس کا صحیح انداز تم اس وقت کر سکتے ہو، جب وہ اپنی کسی ضرورت سے، آبادیوں کو چھوڑتا ہو اور نکل جاتا ہے اور یکا یک ہیبت ناک پہاڑوں کے سلسلوں میں اونچے اونچے گھنے درختوں کا خوفناک منظر اس کے سامنے آ جاتا ہے، تو اس وقت باوجودیکہ تمام عالم کی متفقہ آواز نہیں، کڑہ امکان کے تمام مشاہیر و اکابر کی خبر نہیں اور آہ! کہ ایک لاکھ بیس ہزار آسمانی نشانیوں والوں کی پر زور باجلال تبلیغیں نہیں، کچھ نہیں، صرف شیراز کے بوڑھے آدمی کی ایک ہلکی سی بھنگ ع شاید کہ پلنگ خفتہ باشد، سے اس کی ہر رگ و پے کی حرکت طبعی پر ایک زبردست دھچکہ پڑتا ہے، اس کے عضلات و اعصاب نفس ناطقہ کی پابندی کا جو اتار کر پھنک دیتے ہیں، بدن پر ریشہ پڑ جاتا ہے، روح حیوانی تمام جسم سے سمٹ کر دل کے کسی کونے میں دبک جاتی ہے، اس کا چہرہ زرد ہو جاتا ہے اور پھر کسی معمولی سی آہٹ (خواہ وہ ہوا کی اٹھکھیلیاں ہی کیوں نہ ہوں) پا کر، یا تو اپنے تمام ہوش حواس سے مفلس ہو کر وہیں کہیں گر کر ایڑیاں رگڑنے لگتا ہے اور اگر کچھ اوسان قائم رکھ سکا، تو وہ حرکت فرار اس کی عجیب ہوتی ہے کہ ابھی ابھی شہر میں تھا، یقیناً کو جھٹلانے میں، متواتر خبروں کی تکذیب میں اسے کوئی باک نہ تھا اور یہاں وہ تمام کلیات بھول کر صرف شک کی بناء پر، بے تحاشا، نامہذب سے نامہذب بھاگ میں پناہ کی راہیں ڈھونڈتا ہے اور انتہائی سراسیمگی کے ساتھ اپنے اس فانی جسم کو کسی ماموں مکان میں ڈال دیتا ہے۔

تم نے دیکھا! کہ زندگی مستعار کے لیے شک نے اس کے دل میں کس قوی یقین کی صورت حاصل کی اور وہ اس کا کس درجہ فرمانبردار غلام بن کر اس کے ادا امر کی بجا آوری میں مشغول ہوا، لیکن تعجب کرو، بلکہ ہنسو! یا افسوس و حسرت کیساتھ غور کرو! اس کی بیمار فکر، مریض نظر کی کہ اسی کو جب کڑہ زمین کی اکثر آبادیاں آدم کی تقریباً ہر نسل کی گویا تمام امتیں، متفق ہو کر خبر دیتی ہیں کہ ”انسان کی زندگی کا پھیلاؤ صرف دنیا ہی تک نہیں، بلکہ یہ تو راستہ ہے، جہاں کبھی آرام ہے اور کبھی مصیبت ہے، کبھی چین ہے کبھی بے چینی ہے، باں اس کے بعد

پھر ایک دور موت کے بعد آتا ہے، جس میں یا صرف عیش و طرب کے لذائذ ہمیشہ کے لیے ہیں، یا صرف دکھ، درد، رنج و مصیبت کے سامان ہیں جس سے کبھی نجات نہیں۔

یہ وہ صداقت مشخون آواز ہے، جو صرف بطحاء^۱ و حجاز کے کوہستانوں میں نہیں گونجی، سینا^۲ ہی کے پہاڑوں سے ٹکرا کر، اسرائیلوں کے لیے باعث نجات نہ بنی، صرف کشام و کنعان کے باغوں اور بکریوں کے چوپانوں ہی کے اندر سے نہیں اٹھی، وہ سعیر^۳ ہی کی ان گاؤں اور شہروں میں غلغلہ پرواز نہیں ہوئی، جہاں اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کی تلاش میں خدا کا بھیجا ہوا آیا تھا۔

بلکہ آپ کو یقین کرنا چاہئے کہ جس طرح ان پاک و برگزیدہ مقاموں میں اس کی

۱..... یعنی: صرف مسلمانوں کا عقیدہ نہیں، جو آج ایشیا افریقہ کے ہر شہر اور تقریباً ہر گاؤں میں چالیس کروڑ نفوس کی صورت میں پھیلے ہوئے ہیں، حتیٰ کہ ان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ مشرقی یورپ اور امریکہ و جزائر امریکہ میں بھی موجود ہے، الغرض یوں سمجھنا چاہئے کہ موجودہ اقوام میں دنیا کی ایک بڑی قوم، اس اعتقاد کا اقرار اور بہت سی قوموں کیساتھ کر رہی ہے۔

۲..... سنیا یا سیناء اس کوہستانی سلسلہ کا نام ہے، جس کا ذکر خدا نے ”طور سینین“ کے لفظ میں کیا۔ یہاں پر موسیٰ علیہ السلام پر تجلی ہوئی اور تورات ملی۔ نہر سوئس اس کو مصر سے الگ کرتی ہے، اور خلیج عقبہ عرب سے میری مراد قوم یہود ہے، جن کی تعداد بھی دنیا میں لاکھوں سے زیادہ ہے، وہ بھی اس کے مصدقین میں ہے۔ ۱۲

۳..... یعنی: ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب، اسحاق، یوسف، ایوب علیہ السلام کے دین میں بھی یہ عقیدہ موجود تھا۔ ۱۲

۴..... سعیر اس پہاڑ کا بھی نام ہے، جو عرب کے مردہ دریا سے شروع ہو کر خلیج الامان تک پھیل گیا ہے اور ایک دوسری پہاڑی ہے، جس کا ذکر کتاب پیدائش میں ہے، حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ”بدایہ النبیاری“ میں لکھتے ہیں کہ: ”اس کے نیچے ”سعیرہ“ نامی ایک گاؤں اب تک موجود ہے۔“ ممکن ہے کہ جسے آج کل ”سارلس“ کہا جاتا ہے وہی ہو۔ اس کے علاوہ وادی حرارہ کے جنوبی طرف ایک گاؤں سعیرہ ہے، لیکن جبل سعیرہ سے وہ بہت دور ہے، بہر کیف اختلاف قرون، و تمدنی اعصار سے ممکن ہے کہ وہ جگہ جہاں عیسیٰ علیہ السلام پر تجلی ہوئی ہو، وہ بدل ہو گیا۔ میری مراد اس سے عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور آج دنیا کے بہت بڑے حصے میں ان کی امت پھیلی ہوئی ہے، جسکی تعداد بھی ۵۰ کروڑ نفوس سے کم نہیں بتائی جاتی۔ انجیل کے ماننے والے اسی عقیدہ پر اپنی نجات اور آسائش آخروی کے منتظر ہیں۔ الغرض تورات، انجیل اور دوسرے انبیاء کے جو صحف موجود ہیں۔ جنہوں نے اس کے مطالعے میں اپنا وقت صرف کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ نام کتابیں اخروی عذاب ڈاب کی تبلیغیں کھلے کھلے لفظوں میں کر رہی ہیں۔ ۱۲

صیت جلال و رحمت اٹھ کر کرۂ زمین کے اکثر خطوں تک پھیل گئی، بحسنہ اسی طرح وہ کبھی ہمالہ کے دامنوں میں موجود تھی، تبت اور برہما، جاپان کے سنکستانی علاقوں، جزیروں، میں بھی اس کا اعلان بہت دن تک رہا، فارس کی چمنستانوں میں اس کے راگ الاپے گئے۔

۱:..... یعنی ہندوؤں کی قدیم کتابوں میں اسک کا ذکر بالتفصیل موجود ہے، لیکن بنظر اختصار ہم صرف انسائیکلو پیڈیا (دائرۃ المعارف عربی) کے قول کو یہاں پر نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں:

”رہا رہا (یعنی ہنود) تو ان کے جہنم کا نام ”زکھ“ ہے، اور جنت کو ان کی زبان میں سرگ (ہیکلٹھ) کہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ دنیا کی بربادی کے وقت دشمنوں کا ہونا ہوگا، اس کی صورت سپید گھوڑے کی مانند ہوگی، جس وقت وہ زمین پر پاؤں رکھے گا، تو دنیا کے پرزے اڑ جائیں گے، پھر نیک لوگوں کو سرگ میں روانہ کرے گا اور شریروں کو ”زکھ“ میں پھینک دے گا، ہیکلٹھ میں ہر طرح کے لڑائو دہانتے ہیں اور جہنم میں ہر قسم کے عذاب“ (دائرۃ المعارف، صف: ۴۰۰، ج: ۶)

البتہ بعد میں اگر یہ تنازع، یعنی: اداگوں کے قائل ہوئے، میں اس مسئلے پر تاریخی حیثیت سے اس مضمون کے آخر میں بحث کروں گا اور بتاؤں گا کہ یہ عقیدہ ہندوؤں میں کب آیا اور کیوں آیا، اصلی منشاء اس کا کیا تھا۔

۲:..... یعنی بودھ مت کے قیام میں بھی اس عقیدہ کو بہت دن تک مانتے آئے، ان مکانوں کی خصوصیت اس لئے کی گئی کہ اب زیادہ تر بودھا کے ماننے والے ان مقامات میں آباد ہیں، اس کی شہادت بھی اسی کتاب سے نقل کی جاتی ہے:

”لیکن بودھین، تو ان کے نزدیک جہنم کے طبقات ایسے ہیں جو ہمیشہ آگ سے بھرتے رہتے ہیں، اور آٹھ طبقات محض نجد ہیں، ان میں سخت سے سخت سردی پائی جاتی ہے، پوری مسافت جہنم کی ان کے یہاں ۳۴۳ ہزار میل ہے اور اسی طرح جنت کی بھی تفسیریں کرتے ہیں“۔ (دائرۃ المعارف، صف: ۴۰۰، ج: ۶)

اس کا پتہ اس کی تعلیم میں ضرور موجود ہے، لیکن افسوس کہ بعد کو بودھ فرقہ مختلف عقائد و خرافات کا پابند ہوا۔ اگر ناظرین نے دلچسپی کا اظہار کیا، تو کبھی ان خرافاتوں کو نقل کر کے اسلام کی پاک اور سیدھی تعلیم کے مقابلے میں پیش کیا جائیگا، تاکہ جاننے والے سمجھیں کہ اسلام میں کتنی رحمتیں ہیں۔

۳:..... یعنی پارسی قوموں کا بھی عقیدہ تھا اور ایک حد تک بادی اختلاف مجوس اس کو ایک بھی مان رہے ہیں۔ دائرۃ المعارف میں ہے:

”اور پارسی تو ان کے یاں جہنم کو ”دردنہ“ کہتے ہیں (شاید یہ دوزخ کے ہم معنی لفظ زندگی کا ہے) اس کا مالک ”ایرمن“ ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ اور مزد ہر سال اس کے دروازے کھول دیتا ہے اور ۵ دن تک وہ کھلے رہتے ہیں، پھر جو وہیں کرجات کی سختی ہو جاتی ہیں وہ باہر ہوتی رہتی ہیں، عالم کی آخری گھڑیوں میں پہاڑ پکھیل جائیں گے اور زمین بدل جائے گی، مردے زندہ ہو کر پھر اٹھیں گے، پھر ایرمن اور مزد (یزدان) کی شریعت کو قبول کرے گا، اور نیکیوں کے ساتھ بہشت میں سعادت اور ابدیہ حاصل کرے گا“۔ (صف: ۴۰۰، ج: ۶، خلاصہ) اس سے بھی جو نتیجہ نکلتا ہے، وہ ظاہر ہے بہشت و دوزخ فارسی الفاظ ہیں۔ یہی دلیل ہیں کہ ان کے یہاں بھی یہ کوئی چیزیں ہیں، رہا درمیان کی باتیں کہ اور مزد جہنم کو کھولتا ہے، وہ جو تھوڑے تفسیر کے بعد بالکل اسلام کے موافق ہیں اور دراصل اسلام اسی لئے آیا ہے کہ نظام ایام سے لوگوں نے مغیبات میں بہت کچھ اپنی جانب سے جو اضافہ کر دیا ہے، اسے صاف کر دے، لیکن آہ! کہ ہمارے علماء و عظیمین نے بھی جمہوری روایتوں کو اس سے زیادہ طوماروں کے اتارنگا دیئے ہیں! خدا ان پر رحم فرمائے۔

مختصر سوانح حالات و خدمات

نیل کی وادیوں، افریقہ کی ریگزاروں میں بھی اس کا جڑ چہ رہا، ایڈریا تک کے اس مغرور ساحل (یونان) سے بھی مدتوں اس کی موجیں ٹکرائیں، وہاں کی عقل کے پجاریوں میں مدت تک اس کا شہرہ رہا۔

یورپ کے ابراؤدہ مطلعوں پر اس کی تصدیق کا آفتاب ہمیشہ چمکتا رہا اور آج تک

۱..... یعنی: قدیم مصری قومیں بھی اس کی تصدیق کرتی تھیں، دائرۃ المعارف میں ہے: ”مصریوں کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی دنیا کے یا قطر اعلیٰ کی طرف جاتا ہے، اسے ”مسکن سعداء“ کہتے ہیں، جو بعینہ ”جنت“ کے معنی کو ادا کرتا ہے، یا قطر اسفل کی طرف، اسے ”مسکن شررہ“ اور ”اسفل“ کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جہنم کے دارونے ۴۲ ہیں، اس کے دروازے پر تین سر کا ایک کتاب پھٹا ہوتا ہے، آدمی کے اعمال تو لے جاتے ہیں، تو لے والے فرشتے کا نام ”ہوروس“ اور ”انولیس“ ہے، عمل لکھے بھی جاتے ہیں، لکھے والے کا نام ”طوٹ“ ہے، جہنم میں جب آدمی جاتا ہے تو اس کے جسم کی ہیت کبھی تو بازئی ہوتی ہے، چہرہ آدمی کا کبھی وہ کر کے شکل پر ہوتا ہے، وہاں کے فرشتے تنگی تنگی ٹکرائیں کھینچتے ہر وقت روجوں پر مسلط رہتے ہیں، جہنم کے بعض محافظوں کی شکل سر کے بھوتوں کی جیسی ہے، بعض کا دل سینے سے باہر ہے۔ الی غزولک۔ (صف: ۲۱۰، ج: ۶)۔ مصریوں کی عام عادت ہے، وہ اکثر ان صفات کو جو حیوانوں کے ساتھ خاص ہیں، اپنی تعبیروں میں انہیں کی صورت فرض کر لیتے ہیں اور اسی بنا پر ایسی ایسی تشریحیں کرتے ہیں۔ اسی مقام سے عجائب الخلقات میں فرشتوں کی صورتیں مختلف طرز کی بنائیں گئیں ہیں، حالانکہ ان کی کوئی اصل نہیں، بعد کو مصری قوم، آواگون کی قائل ہوئی، جہاں تاسخ کی بحث ہوگی وہاں اس کا بھی راز واضح ہو جائیگا۔ فائنل ۱۳

۲ یونانیوں نے قبل عیسائیت کے بھی اس عقیدہ کی تصدیق کی اور جب تک ارسطو طالیس نے حدوث روح کا دعویٰ نہ کیا تھا، ان کا عقیدہ یہی رہا، بعد کو بعض ارسطو کے معتقدین معاد جسمانی کے منکر، سرور روحانی، و تعذب روحانی کے قائل ہوئے، تاسخ کے بعد اس مسئلے کی بھی اصل حقیقت سے نقاب انشاء اللہ تعالیٰ اٹھایا جائیگا۔ یونانیوں کے یہاں جہنم کو ”ترتاروس“ کہتے ہیں اور جنت کو ”الیسیوم“۔ دائرۃ المعارف کا مصنف ان کی جہنم کی کچھ تشریح بھی کرتا ہے، لیکن زیادہ تر ان میں وہی واعظوں کے بیہودہ، اور عامیانہ خرافات ہیں، جس سے قدیم مذاہب تو خیر، آج اسلام جس کی تعلیم قرآن وحدیث، فقہ، اسماء الرجال، کی صورت میں جکڑی ہوئی ہے، علماء حق کی کمی نہیں، پھر بھی غلو، اغراق کا اندازہ، ہنگام، و گہرات کے شہروں اور قصبوں میں لگاؤ کہہ سکتے، عجوبہ پرداز قالبوں میں جنت اور جہنم کے نقشے ڈھلتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اسلام حالانکہ تمام دنیا کے مذاہب کی اصلاح کے لئے آیا تھا، اسی لئے اس نے تمام انبیاء کی تقدیس، و اسرار کی تعلیم دی، لیکن لوگوں نے اسے ”باد“ سمجھ کر مخالفت پر آمادگی ظاہر کی۔ اسلام کا دعویٰ تھا اور ہے: (کان الناس امۃ واحدة) پھر یہ اختلاف عجیب ہے۔

۳ یورپ کی عام قدیم اقوام میں یہ عقیدہ، نہایت صریح لفظوں میں پایا جاتا ہے۔ سلاوی اور توتونی (ٹینین) نسلوں میں قبل مسیح خلیۃ السلام کے موجود تھا، ناروے، ڈنمارک وغیرہ کی پرانی آبادیاں اس پر شاہد عدل ہیں، سکندیا کے باشندے (سکندنیادیوں) جو گویا اکثر یورپین قوموں کی اصل اصول ہیں، ان کی زبان میں جہنم کو ”فلیسیم“ کہتے ہیں اور جنت کا نام ”جلمت“ ہے، ان کا عقیدہ تھا کہ جہنم سات طبقتوں پر منقسم ہے، پھر ہر کی تشریح عام مذہبی عقائد سے بہت ہی ملتی جلتی ہے۔ تسلیکن جرمن گالیہ وغیرہ قوموں کے اندر بھی یہ عقیدہ موجود تھا۔ الغرض یورپ کی تقریباً ہر پرانی قوم اس کی صدق رہی ہے۔ (دیکھو دائرۃ المعارف، صف: ۳۹۷، ج: ۶)

وہاں کی آبادیوں میں سوائے چند ذہریوں کے ہر ایک شخص اس کا معتقد ہے۔

رومیوں نے اپنی زبردست تمدن کے نشہ میں بھی اس کو فراموش نہیں کیا، کلدانیوں اور ہابیوں نینوا والوں پر بھی اس کی حکومت رہی، سامی نسلوں میں ایسی کوئی نسل موجود نہیں، جس نے انکار کیا، چین کے دیوار کے نیچے بھی آدم علیہ السلام کی اولاد نے یقیناً تمام عالم کی ہمنوائی کی ہے اور اپنے باپ کے اصلی مقام کی پھر خواہش کی ہے اور اخیر میں یہ کہ زمین کے اس پشت آباد پر جو انسانی تجسس سے، مدتوں بے لگاؤ رہ چکی ہے، جس کا تعلق پرانی دنیا سے اس وقت الگ ہوا ہے، جس کی تاریخ کا آج باوجود انتہائی کوششوں کے پتہ نہیں چلتا، کس قدر عجیب ہے کہ وہاں کے نحاسی اجسام والے وحشی بھی جہنم کے خوف سے تھرائے اور بہشت کی غیر مکذوبہ مسرتوں کو یاد کر کے اپنے معبود کے آگے جھک پڑے ہیں

۱..... رومیوں کا عقیدہ اس باب میں یونانیوں سے بالکل متحد ہے، حتیٰ بام بھی وہی ہیجو یونانیوں کے نزدیک تھا۔

دائرة المعارف، صفحہ: ۳۹۷

۲..... دائرة المعارف، صفحہ: ۳۹۸

۳..... دیکھو دائرة المعارف، صفحہ: ۳۹۷، عبرانی زبان میں جہنم کو "شاول" اور سریانی میں "شیول" کہتے ہیں۔ تشریحات ان کی اسلام سے بہت زیادہ اقرب ہیں۔ فردوس کے قریب الماخذ لفظ میں جنت کی تعبیر ان زبانوں میں پائی جاتی ہے۔

۴..... چین کے متعلق مشہور جی (علم عقائد الاقوام والامم) کے محققوں کا خیال اگرچہ زیادہ تر اسی طرف ہے کہ وہ کسی خاص طرز کا عقیدہ ان چیزوں کے متعلق نہیں رکھتے تھے اور دائرة کا مؤلف بھی اسی خیال کے مرتحمین میں ہے، مگر جبکہ تاریک نسلوں میں اس عقیدہ کا رسوخ پایا جاتا ہے، حتیٰ کہ جب وہ جبل ارل اور ممالک تائی وغیرہ سے پھیلتے ہوئے (خرین ۱۲) یورپ کے شمالی حصوں میں آباد ہوئے، تو اس عقیدہ کو بھی ساتھ لائے، اس کے بعد پھر اس کا بھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ چینوں میں یہ عقیدہ کیوں نہیں تھا۔ "شی کنگ" مجموعہ کلیات، جس میں کنفوشس کی تعلیم جمع کی گئی ہے، تو اس میں صراحتاً اس کا ذکر نہیں ملتا، لیکن جب دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنی دعاؤں اور مناجاتوں میں، ایک ہستی قدیر و جبار کو "اکاش" کے نام سے پکارتے ہیں، اس سے نجات کی درخواست کرتا ہے، اس کے خوف سے اس کا جسم لرزتا ہے، تو ہم کو اس امر کے یقین کرنے میں کوئی شبہ نہیں باقی رہتا کہ وہ ضرور مستقر الثواب، ودارالعداب کا قائل تھا، ورنہ نجات اور ہراس کے معنی لٹو ہو جائیں گے، خصوصاً جبکہ ارد گرد کی قوموں میں یہ عقیدہ پورے طور پر پایا گیا ہے۔ بہر کیف کنفوشس اور تاؤ کی اشاروں میں علماء مشہور لو جیا کو اس کے دلائل ملے ہیں۔ ہاں بودہ مت کے پھیل جانے کے بعد تاریخ کا خیال پیدا ہوا اور یہی وجہ ہے کہ وہ عقیدہ مٹ گیا، حتیٰ کہ دھوکہ ہونے لگا، ان میں موجود بھی تھا، یا نہیں۔

اور آج بھی ان ستائی ہوئی نہتی جانوں سے پھاڑ کی کھو ہوں اور امریکہ کے سحرائوں میں جا کر دریافت کرو گے، تو اسی اعتقاد پر مرنا اپنے لئے مبارک خیال کریں گے اور اسی قدر نہیں، اکثر جزائر کے برابرہ اور صحرائی اقوام اوشینسا وغیرہ کے رہنے والوں میں بھی یہ پایا گیا۔

ستبعہا رادفہا

للسید ابی الضیاء مناظر احسن (گیلانی) مدون القاسم دار الشید

عفی اللہ عنہ عن والدیہ عن رباه

(ماہنامہ القاسم دیوبند)

۱۔ امریکہ کے اصلی باشندے جن سے کولبس کی پہلی دفعہ ملاقات ہوئی اور بوجہ اپنے سرخ جسموں کے وہ نحاسی (تانبہ نما) آدمی، ڈانڈ بن کہے جاتے ہیں، تحقیق کے بعد بخوبی ثابت ہو چکا ہے کہ وہ اس کے قائل تھے اور جو ابھی تک عیسائی عیسائی نہیں ہوئے ہیں، اسی عقیدہ کو مضبوط طرح تقاضے ہوئے ہیں اور عیسائی ہونے کے بعد بھی اس عقیدہ سے کب چارہ کہ وہ دنیا میں اس دعوے کا سب سے بڑا حامی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھو انسائیکلو پیڈیا عربک ۱۲ (دائرۃ المعارف)۔

۲۔ دیکھو دائرۃ المعارف، صفحہ ۳۹۹۔ مغرب لوچی کے معشین نے اپنی تمام تحقیقات کو اس پر ختم کر دیا ہے کہ بادی اختلاف آخرت کا خیال ہر نفس، ہر روح انسانی کے اندر موجود ہے، جن کی بعض مباحث عنقریب انشاء اللہ تعالیٰ آتے ہیں ۱۲

اسلامی رواداری اور مساوات و بے نفسی کا ایک دل آویز موقع

وہ ایک طرف بیٹھے زار و قطار روز ہے تھے

تذکرہ رحمانیہ، ص: ۲۶۱

یہ زار و قطار رونے والے صاحب اردو زبان کی سب سے بڑی انقلابی نظم (مسدس حالی) کے مصنف مولانا الطاف حسین حالی تھے، ان کے استاذ و شیخ حضرت مولانا قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی کا انتقال ہو رہا تھا، ذریعہ کا عالم طاری تھا، سعادت مند شاگرد اس حال کو دیکھ کر بے قابو ہو گیا اور ڈھاڑھیں مار کر رونے لگا۔ اسی زمانہ میں اخبار میں مضمون بھی لکھا تھا۔ ان الفاظ کے بعد کہ:

”نہایت افسوس ہے کہ پانی پت ایک ایسے بزرگ سے خالی ہو گیا ہے، جو نہ صرف پانی پت کے لیے، بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے باعث فخر تھا۔“

مولانا حالی کے ذمہ دار قلم کی اس شہادت کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجئے، لکھا ہے کہ:

”جن کا مثل آئندہ زمانہ میں پیدا ہونا محالاتِ عادیہ میں معلوم ہوتا ہے۔“

آخر عربی کے اس مشہور مثالی شعر کو مولانا نے اس موقع پر درج کیا ہے کہ

وما كان قيس هلكه هلك واحد

ولكن بنیان قوم تهدما

خود ہی ترجمہ بھی اس شعر کا اردو میں بایں الفاظ فرمایا ہے:

”قیس کا مرنا ایک آدمی کا مرنا نہ سمجھو، بلکہ وہ قوم کی بنیاد تھی جو گر گئی۔“

(تذکرہ رحمانیہ، ص: ۲۶۷)

قاری صاحب کیا تھے، کن کن کمالات و صفات سے سرفراز تھے، جاننے والوں کے لئے شاید اس سلسلہ میں اتنا لکھنا کافی ہو سکتا ہے کہ سیدنا شاہ عبدالعزیز کے نواسے حضرت

مولانا شاہ اسحاق صاحب کے ارشد تلامذہ میں ایک غیر معمولی ممتاز ہستی اپنے زمانہ میں قاری صاحب کی بھی شمار ہوتی تھی، جیسا کہ معلوم ہے نسبی طور پر خانوادہ ولی اللہی کی علمی و عملی خصوصیتوں کے آخری چشم و چراغ شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے۔ غدر سے پہلے ہندوستان اپنی زبوں حالیوں میں جس حد تک پہنچ چکا تھا، شاہ صاحب ان کے دیکھنے کی تاب نہ لاسکے، انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں وطن (سرزمین ہند) کو سلام کر کے ہجرت کی نیت سے جازا پہنچے اور خاک پاک ججاز ہی میں آسودہ ہوئے، مکہ معظمہ کے مشہور مقبرہ ”جنت معلیٰ“ میں مجو خواب ہیں۔

قاری صاحب کی علمی جلالت شان کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، حکیم الامت حضرت مرشد تھانوی جیسے بزرگوں نے تبرکاً قاری صاحب سے حدیث کی اجازت حاصل کی تھی۔ ان ہی اجازت حاصل کرنے والوں میں ایک طرف نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمن خاں شروائی مغفور بھی نظر آتے ہیں اور دوسری طرف قاری صاحب کے حلقہ افادہ میں شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کو بھی ہم پاتے ہیں۔ لکھا ہے کہ:

”مولانا (حالی) نے حضرت (قاری صاحب) سے صحاح ستہ کی کتابیں پڑھی تھیں۔“

(ذکرہ رحمانیہ، ص: ۲۷)

جس کے معنی یہی ہیں کہ ہم وطنی کے علاوہ مولانا حالی نے قاری صاحب کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور اپنے ان ہی ذاتی مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر کم از کم ان کا ذاتی احساس کہیے، یا خیال یہی تھا کہ اب دنیا ان نمونوں کو شاید کبھی نہ دیکھ پائے گی، جن کی نمائندگی قاری صاحب نور اللہ ضریحہ کا وجود کر رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ قاری صاحب کے زمانہ میں جدید تعلیم کے اسکولوں اور مدرسوں سے ملک روشناس ہو چکا تھا، لیکن قاری صاحب ان نئے اسکولوں کو کس نظر سے دیکھتے تھے؟ اس کے لئے یہی کافی ہے کہ بجائے ”تعلیم گاہوں“ کے ہمیشہ ان اسکولوں کو وہ ”محلے“ کے نام سے موسوم کرتے رہے۔

(دیکھئے ان کی سوانح عمری!)

بہر حال ان کی تربیت و تعلیم اول سے آخر تک پرانے نظام ہی کے تحت ہوئی تھی، ان

ہی پرانے خیال والے مسلمانوں میں وہ پیدا بھی ہوئے۔ ان ہی کے حلقائے درس و تدریس میں لکھا پڑھا اور ساری زندگی اسی ماحول میں گزاری، لیکن باوجود اس کے کہ آپ کے جو کچھ وہ دکھاتے رہے، اس کا اندازہ آپ کو ان چند خاص نمونوں سے ہوگا۔ قاری صاحب کے صاحبزادے مولانا عبدالسلام راوی ہیں کہ ریل کے سفر میں وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ تھے، ڈبہ جس میں قاری صاحب سوار ہوئے بھرا ہوا تھا، زیادہ تعداد ہندو مسافروں کی تھی، قاری صاحب کی خاص شکل و صورت کو دیکھ کر خود بخود مسافروں نے خواہش کی کہ آپ تنگ ہو کر نہ بیٹھیں، ہماری طرف پاؤں پھیلا لیجئے، جواب میں اپنے مذہب (اسلام) کا حوالہ دیتے ہوئے وقت کا ایک محدث ان ہی ہندو ہم سفروں سے یہ کہہ رہا تھا:

”میرا مذہب اجازت نہیں دیتا کہ کسی انسان کے چہرے کی بے ادبی کروں، ہم ہر شخص کے چہرے کا احترام کریں گے۔“

(تذکرہ رحمانیہ، ص: ۲۸۷)

اس لیے باوجود اجازت، بلکہ اگر حضرت والا پاؤں پھیلا دیتے، تو شاید ان کے ہم سفروں کو مسرت ہی ہوتی، لیکن ”انسانیت“ کے احترام کی تعلیم مذہب کی طرف سے اس کو جو ملی تھی، اسی پر اصرار کرتے ہوئے سفر کو پورا فرمایا۔ لکھا ہے کہ سفر کے ان رفیقوں سے حضرت نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

”تمہیں اختیار ہے جس طرح چاہو بیٹھو، مگر میں اپنے اصول کے خلاف نہیں کروں گا۔“

سفر میں جس کا یہ حال تھا، حضر میں اس کے ہم وطنوں کو اس رنگ میں اگر پایا گیا، اتھا، تو اس پر تعجب کیوں کیجئے، لکھا ہے کہ جس گلی یا بازار سے گزرتے اور کوئی ہندو حقہ پیتا ہوتا، تو حضرت کو دور سے آتا دیکھ کر حقہ اٹھا دیتا، یا ادھر ادھر ہو جاتا۔

دوامی عادت پانی پت کے ان ہی عام باشندوں کی یہ تھی:

”جب آپ (قاری صاحب) بازار میں سے گزرتے، تو ہندو آپ کو جھک جھک کر سلام کیا کرتے تھے۔“

جس دن حضرت والا کا انتقال ہوا، تو لکھا ہے کہ:

”ہندوؤں نے اپنی دوکانیں اور کاروبار بند کر دیئے اور بہت رنج و غم کا اظہار کیا۔“

صبح و شام دیکھنے والے جس پانی پت میں انہی جان افروز، روح پرور نظاروں کا تماشا کر رہے تھے، اس وقت مسلمانوں کا پانی پت سے سیاسی اقتدار کا دباؤ اٹھ چکا تھا، مسلمان اور ہندو دونوں تیسری بیرونی طاقت کے نیچے دبے ہوئے تھے، مگر اس وقت تک ”انسانیت“ کے احترام کا جو درس اسلام نے دیا تھا، ابھی یہ سبق ان کو یاد تھا، حافظہ سے اس قسم کی قرآنی آیتوں کا اثر مٹا نہیں تھا، مثلاً: از شاد ہوا ہے:

﴿وَقُلْ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّيْطَانَ

يَنْزِعُ بَيْنَهُمْ﴾ (سورہ بنی اسرائیل، ۵۳)

”اور کہہ دو میرے بندوں سے بولا کریں ایسی باتیں جو اچھی ہوں،
۰۰ الشیطان چھیڑ خانی کرتا رہتا ہے، باہم ان میں۔“
جس کی تفسیر میں قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:

”يقولوا التي هي احسن الكلمة، التي هي احسن ولا
يخاشنوا المشركين“.

”بولا کریں ایسی باتیں جو اچھی ہوں“ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسی بات
زبان سے نکالیں، جو اچھی ہو اور مشرکین کے ساتھ سخت کلامی سے کام نہ
لیں۔“

مگر بجائے ”الانسان“ کے احترام کے یورپ سے قوم پرستی کی بلاناازل ہوئی، پھر
وہی پانی پت تھا، اس کا وہی آسمان تھا اور اس کی وہی زمین تھی، دیکھنے والوں نے جو کچھ وہاں
دیکھا تھا اور اس وقت تک دیکھ رہے ہیں، وہ بھی سب کے سامنے ہی ہے اور ہندو تو خیر
محکومیت میں مسلمانوں کے ہر وقت ساتھی تھے۔ آپ کون کر حیرت ہوگی کہ انگریز جو حکومت
سے محروم کر کے مسلمانوں کے سینوں پر چڑھے ہوئے تھے، سروں سے وہ خونیں سیلاب بھی
گزر چکا تھا، جس کا نام عہد شکن حکومت نے غدر رکھ چھوڑا تھا، جو آسمان پر تھے، وہ زمین پر
ٹپکے جا رہے تھے۔ دلی میں بیٹھ کر جس وقت یہ الفاظ غالب کا قلم شاید خون کے حروف میں لکھ

رہا تھا:

ہر سٹور انگلستان کا
 زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا
 گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
 تشنہ خون ہے مسلمان کا
 آدمی واں ہ جا سکے یاں کا
 وہ ہی رونائے دل و جاں کا
 شوش داغہائے پنہاں کا
 ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

بسکہ فعال ماہرید ہے آج
 گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
 چوک جس کو کہیں وہ قتل ہے
 شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
 کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
 میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
 گاہ جل کر کیا کئے شکوے
 گاہ رو کر کہا کئے باہم

خطوط میں ایک خط غالب ہی کا ہے، جس میں لکھا ہے:

”معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیہ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں،
 اناث میں جو پیرزن ہیں، وہ کٹنیاں اور۔۔۔۔۔!“

امراء اسلام میں اموات گنوا!

پھر طویل فہرست ان کی درج کر کے آخر میں لکھا ہے:

”قصہ کوتاہ قلعہ اور بھڑ اور بہادر گڈھ، بلب گڈھ، اور فرخ نگر کم و بیش بیس لاکھ کی
 ریاستیں مٹ گئیں، شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں، ہنرمند آدمی کیوں پایا
 جائے۔“ (اردوئے معلیٰ، ص: ۳۲۲)

لیکن جن انگریزوں نے مسلمانوں کو پایہ تخت دلی سے نکالا تھا اور اس طریقہ سے نکالا
 تھا کہ بقول غالب:

”یہاں (دلی میں) باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔“

اور آخر اس خطرہ پر تحریر ختم کی ہے کہ دلی میں ابھی دیکھنا چاہئے مسلمانوں کی آبادی
 کا حکم ہوتا ہے، یا نہیں۔“ (ص: ۶۶)

اسی دلی سے کچھ فاصلہ پر ”باندرا“ کی ریاست جہاں اس زمانہ میں حضرت قاری

صاحب مہرور کا ایک مدرسہ تھا، بیان کیا گیا ہے کہ:

”جب بغاوت زوروں پر تھی، تو پچھتر انگریز مردوزن تلاش امن میں حضرت (قاری صاحب) کے پاس آئے۔“

جس قوم کی حکومت نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے باہر نکالا تھا، اسی ظالم قوم کے افراد امن لینے کے لیے اسلامی اخلاق کے ایک قدیم نمونے کے سامنے آتے ہیں، مذہبی جنون (فٹنی ازم) کا بہتان مسلمانوں کے جن غریب ملاؤں کے سر تھوپا گیا ہے اور آج تک تھوپا جا رہا ہے، آنکھیں کھول کر دیکھئے، وہی ملا کھڑا ہوتا ہے، لکھا ہے:

”ان سب (انگریزوں کو) اپنا مدرسہ (قاری صاحب نے) دے دیا۔“

صرف یہی نہیں کیا، یہ انگریز مدرسہ میں اتارے جا رہے تھے اور طلبہ و علماء جن کا مدرسہ سے تعلق تھا، ان کو خطاب کر کے قاری صاحب فرماتے جا رہے تھے:

”ان مظلوم اور بے کس انگریزوں کی مدد و حفاظت اور خاطر مدارات لوجہ اللہ بموجب حکم خدا اور رسول کرو۔“

پناہ مانگنے والوں نے پناہ مانگی ہے، ان کو اپنی ذاتی رائے کی بنیاد پر نہیں، اللہ اور رسول علیہ السلام کے منشاء کے مطابق پناہ دی جاتی ہے۔ یہ اسلامی کردار تھا، جس کا نمونہ نازک ترین گھڑیوں میں اسلام اور اسلام کے ایک فینک ملا کی طرف سے پیش ہوا تھا اور اس کے مقابلہ میں ”سلف رسپکٹ“ یا خوہاری پر فخر کرنے والے انگریزوں کو اسی مدرسہ میں دیکھا گیا تھا کہ:

”ڈنکن نامی ایک انگریز اپنی میم اور ناکتھرالٹ کی سمیت چھ ماہ مدرسہ میں پناہ گزین رہا وہ (یعنی: سٹڈنٹن) اور اس کی بیوی اور اسکی لڑکی، تینوں مسلمان ہو گئے تھے۔“

لیکن جب امن و امان قائم ہو گیا، تو بیان کیا گیا ہے کہ چھ مہینے تک مسلمان ہونے کا اعلان کرنے والا یہی انگریز دو تین سال بعد قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، معلوم ہوا کہ اپنے آبائی دین کی طرف واپس ہو گیا۔ قاری صاحب نے دریافت فرمایا کہ:

”پھر اس وقت تم نے مسلمان ہونے کا اعلان کیوں کیا تھا؟“

جواب میں اسی خود ار انگریز نے اقرار دیا تھا کہ

”جنسور! جان کا خوف تھا، اس لیے مسلمان ہو گیا تھا۔“

حالانکہ ڈنکن کے سوا آپ دیکھ چکے کہ انگریزوں کی کافی تعداد باوجود عیسائی رہنے کے قاری صاحب بنی نے مدرسے میں پناہ لئے ہوئے زندہ رہی، سب کو خوزش و پوشش کا جہاں تک امکان میں تھا، نظم کیا گیا۔ سوانح نگار نے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ:

”یہ اس کی (ڈنکن) کی غلطی تھی، مسلمان ہو جانے کے لیے حضرت نے کسی پر کوئی جبر نہیں کیا تھا اور نہ مسلمان ہو جانے والوں کے ساتھ بہ نسبت دوسرے انگریزوں کے کوئی خاص رعایت و سلوک آپ کرتے تھے“۔ (س: ۶۳)

یہ ڈنکن کی اخلاقی کمزوری تھی کہ بغیر ضرورت کے نفاق کے اس طریقہ کو اس نے اختیار کر لیا تھا، جو اسلامی نقطہ نظر سے کفر سے بھی زیادہ بدتر ہے، بالجبر مسلمان بنانے کا اہتمام مسلمانوں پر لگانے والے یہ شاید بھول جاتے ہیں کہ جبراً اسلام قبول کرنے والا، یعنی: دل سے تو اسلام کا منکر ہو اور زبان سے اس کی صداقت کا اقرار کر لے، ایسا آدمی کافر ہی نہیں، منافق بن جاتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ بجائے کافر کے کسی کو منافق بنا لینا، یہ مسلمانوں کے نزدیک دین کا نیک کام کسی حیثیت سے بھی ہو سکتا ہے، لیکن ابلہ یہی کہتے چلے جاتے ہیں، اسی کو جو دیوانے ہیں، باور بھی کر لیتے ہیں۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان انگریزوں کو اللہ اور اس کے رسول علیہ السلام کے منشاء کے مطابق اپنے مدرسہ میں پناہ دی تھی، یہ دعویٰ صرف زبان ہی سے نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اس کے سوا اور کسی قسم کی پوشیدہ غرض اور مصلحت آپ کے سامنے نہ تھی، قدرت کی طرف سے اس کے امتحان کا بھی ایک دلچسپ نظم ہو گیا۔ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ قیام امن کے بعد انگریزی حکومت تک جب خبر کسی طرح پہنچی کہ ”باندا“ میں انگریزوں کی کافی تعداد مسلمانوں کے ایک ملا کی بدولت قتل ہونے سے محفوظ ہو گئی، تو علاقہ کے کاشتر صاحب کے نام حکومت کا پروانہ پہنچا، جس کی نقل کمشنر نے حضرت قاری صاحب کی خدمت میں ”باندا“ بھجوائی۔ اس میں کمشنر صاحب نے لکھا تھا:

”ایک لاکھ روپے سالانہ کی جائداد کے آپ مستحق سمجھے گئے ہیں۔“

حکم دیا گیا تھا کہ اس انعام کے حاصل کرنے کی درخواست دیجئے، مولانا حالی صاحب نے جو دھویں صدی اخبار (راولپنڈی) میں جو مضمون قاری صاحب کی وفات پر

لکھا تھا، اس میں اس انعام کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ:

”حضرت نے کمشنر کے پاس جانا، یا جائداد کا لینا دونوں باتیں نامعلوم فرمادیں۔“

ایک انگریز جو پناہ گزینوں میں تھا اور اسی کی کوشش سے یہ صورت پیش آئی تھی، وہ خود

حاضر ہوا، لیکن اس کے شدید اسرار پر بھی بس اسی قدر فرماتے ہوئے خاموش ہو گئے:

﴿لَا تَرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا﴾

یعنی: ”نہ بدلہ ہی کے لیے میں نے یہ کیا تھا اور نہ اس کے لیے کہ تم اس کا گن گاؤ گے۔“

ہم نے تمہاری خدمت کسی دنیوی طمع اور لالچ سے نہیں کی تھی، بلکہ ہمارے نزدیک

اس وقت تمہاری امداد اور اعانت مذہباً و اخلاقاً لازمی و ضروری تھی اور انسانی ہمدردی کا

تقاضا تھا کہ مصیبت زدوں کو حتی الوسع ہم بچاتے، مجھے حکومت سے کسی صلہ کی ضرورت

نہیں اور تمہاری ذاتِ خاص سے بھی کچھ نہیں چاہتا، مجھے معاف رکھو۔“

مولانا حالی مرحوم نے لکھا ہے کہ اس تقریر کو سن کر انگریز کے لیے کوئی چارہ کار اس

کے سوانہ تھا کہ:

”نہایت ادب کے ساتھ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔“

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ اس زمانہ کا قصہ ہے، جب مسلمانوں کی تمام تباہیوں میں سب

سے زیادہ اہم معاشی تباہیوں کے قصے تھے اور یہ کہ ایک لاکھ جاگیر اس زمانہ کے کچھ ہی دن

بعد دس پندرہ لاکھ کی آمدنی والی جائداد بن جاتی تھی، لیکن اللہ کے کچھ بندے اس زمانہ میں

بھی تھے، جو یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ: ”مناظروں پر معاش کے دروازے ایک ایک کر کے بند

ہوتے چلے جاتے ہیں، مگر ان ہی حالات میں لاکھوں روپے کی جائداد کی بھی کوئی قدر

قیمت ان کی نظر میں نہ تھی، ان کی نگاہ صرف ”السزاق ذوالقوۃ المتین“ کے مواعید

: ﴿نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَى﴾ ”ہم تجھے روزی پہنچائیں گے اور آخری انجام تو

بس تقویٰ ہی کا ہے“ پر تھی۔ صدر کے اس ہنگامہ کے بعد اسی دنیا میں حضرت قاری صاحب کو

اپنی ناسبیتی زندگی کم و بیش تقریباً چالیس سال گزارنے پڑے، یکے بعد دیگرے دو دو

شادیاں آپ بگی ہوئی، بکثرت بال بچے ہوئے، پانی پت کے خوشحال گھرانوں میں آپ کا

شمار ہوتا تھا، اچھا کھاتے، اچھا پیتے، اچھا پہنتے رہے اور خدا کا وعدہ ”نحی نرزقك“ پورا ہوتا رہتا تھا۔ یہی نہیں، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ رزق میں اتنی کافی کشائش کی گئی تھی کہ دس پانچ کے سوا کبھی کبھی لوگوں کو لکھے پڑھے بغیر قاری صاحب نے ہزار ہزار روپے تک بطور قرض دیئے۔ لطافت اور نفاست پسندی آپ کے جلیقی اقتضاؤں کے لازمی اجزا تھے۔ ٹیڑھی بچھی ہوئی چار پائی کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ وہی نظام تحمل ہو جاتا ہے، اگر کوئی چیز بے ترتیب نظر آتی ہے۔ ایک طرف طبعی لطافت پسندی کا حال یہ تھا کہ لوٹے کی ٹوٹی سے پانی پینے والوں کو آپ ٹوک دیا کرتے تھے، فرماتے کہ پیالہ میں پانی نکال کر پینا زیادہ مناسب اور بہتر ہے، لیکن ان ہی قاری صاحب کا قصہ بھی لوگ نقل کرتے ہیں ایک مسلمان بھنگی عبداللہ نامی پانی پت میں تھا، نماز کے لیے مسجد بھی آتا تھا، مسلمان اس کو روک تو نہیں سکتے تھے، لیکن مسجد کے لوٹوں کو چھپا دیا کرتے، تاکہ عبداللہ ان میں وضو نہ کرنے پائے، اس حال کا احساس قاری صاحب کو بھی ہوا، بیان کیا ہے کہ ایک دن مسجد میں جب لوگ بھرے ہوئے تھے، آپ نے آواز دی:

”میاں عبداللہ! کوئیں سے تازہ پانی کا ایک لوٹا بھر کر لاؤ۔“

عبداللہ نے حکم کی تعمیل کی، اسی کے لائے ہوئے پانی سے قاری صاحب نے وضو کیا، پھر ایک دن یہ کر کے بھی دکھایا کہ عبداللہ بھنگی کو پکار کر بلارہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ بھئی! ذرا پانی تو پلاؤ۔ عبداللہ نے بھی غضب ہی کر دیا، انگلیاں ڈبو تا ہوا ایک یہالہ بھر لایا، قاری صاحب نے فرمایا کہ بھائی! یہ پانی تو زیادہ ہے، کچھ تم پہلے پی لو، چند گھونٹ جب عبداللہ پی چکا، تو اسی کے جھونٹے پانی کو بتو پینا! میں رہ گیا تھا، مسجد کے مسلمانوں کے سامنے قاری صاحب کو دیکھا گیا کہ بخندہ پیشانی نوش فرما رہے ہیں۔

آج چھوت چھات کے خلاف کوششوں کا ایک سلسلہ ہے، جو ملک کے طول و عرض میں جاری ہے، لیکن درد کی یہ داستان کسے سنائی جائے کہ بنی نوع انسانی کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفادار غلام اسی ملک میں کیسے کیسے نمونے کر کر کے لوگوں کو دکھا رہے تھے، دھتکاری ہزنی انسانیت کو جو گلوں سے لگا رہے تھے، جو گرانے گئے تھے، ان ہی کو وہ اٹھا رہے تھے، اف ان ہی پر الزام لگایا جا رہا ہے کہ دزدوں کو اپنے نیچے دیائے ہوئے

تھے۔

الغرض ہندو مسلمان انگریز اونچوں نیچوں کے متعلق یہ اور اسی قسم کے مثالی نمونوں کا ایک دراز سلسلہ تھا، جسے تقریباً (۸۶) سال کی عمر تک حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی ہندوستان میں پیش فرماتے رہے، مولانا حالی جو ان کے جناس عقیدت مند تلامذہ میں ہیں، ارقام فرماتے ہیں کہ ہر جمعہ کو بڑوالی مسجد میں وعظ کہنے کا دستور تھا، قاعدہ تھا کہ وعظ کرتے ہوئے فرماتے:

”باقی انشاء اللہ آئندہ ہوگا۔“

لیکن آخری جمعہ جس کے بعد دنیا نے پھر آپ کا وعظ نہ سنا، ختم وعظ کے بعد خلاف دستور یہ فقرہ سنا گیا:

”باقی بشرط زندگی۔“

مسجد سے گھر آئے، پچیس کا دورہ پڑا، شہر میں ہنگامہ برپا ہو گیا، مقامی اطباء کے سوا دیکھا گیا کہ سرہانے پر حضرت والا کے مہاراجہ پٹیلالہ کے معالج ڈاکٹر کریم اللہ بیٹھے ہوئے ہیں، آنکھیں قاری صاحب نے کھول دیں، ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر فرمانے لگے:

”کیوں نہ ہو، آخر محبت ہی تو ہے۔“

دلی سے بھی دوا آئی، یونانی اور ڈاکٹری مشورے کے تحت علاج میں زور جتنا ممکن تھا، لگایا گیا، دو شنبہ کا دن تھا، عصر سے کچھ پہلے پیر بقاء اللہ صاحب کا بیان ہے کہ مولانا خالی تو زار و قطار رو رہے تھے اور میں نے دیکھا کہ قاری صاحب کا رشتہ ناسوتی ہیکل سے ٹوٹ گیا۔

”میں نے فوراً حضرت کے دونوں قدم چوم لئے۔“ (ص: ۲۹۱)

یوں اللہ کا یہ بندہ ۱۳ ستمبر ۱۸۹۶ء کو جہاں سے آیا تھا، چلا گیا۔ اب مسلمان ان ہی پرانے مدرسوں کے ان نمونوں کو ان لوگوں میں تلاش کر رہے ہیں، جن میں کہ بجائے انسانیت کے کہ اپنی قوم، اپنے وطن، اپنی زبان، الغرض اپنی خودی کے عشق کی آگ بھڑکا دی گئی ہے۔ ”کلچر“ کے لفظ کا ایک خوش نما لفظ ہر قوم کے ہاتھ میں تھا دیا گیا ہے، حق و ناحق، راستی و ناراستی، بھلائی اور برائی کے سارے معیار ختم کر دیئے گئے ہیں۔ ”کلچر“ کے اس لفظ میں جو کچھ بند ہے، چونکہ ہمارا ہے، اسی لئے اس پر اصرار بھی ہمارا قدرتی حق

ہے۔ آج افریقہ کے صحرائی مردم خور باشندے بھی ”کلچر“ کے اسی لفافے میں بند کر کے اپنے آباؤ اجداد کی ساری ناکردنیوں کو کردنی قرار دینے پر اصرار کر رہے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی کلچری مسلمانوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے، خوش خیالوں کا ایک گروہ ان کو دیکھ دیکھ کر شاید وقتی خوش فہمیوں کا شکار ہو رہا ہے، سمجھا جاتا ہے کہ ”اسلامیات“ یا ”مسلمیات“ پر خدا کا شکر ہے، اب ہمارے اندر بھی فخر کرنے والے پیدا ہو گئے ہیں، لیکن کلچریت کی وجہ سے اسلام کی صداقت پر اصرار سوچنا چاہئے واقعی اسلام کی صداقت پر اصرار ہے۔ اللهم انی اعوذ بک من الفتن ما ظہر منها وما بطن.

(ماہنامہ الرشید، دیوبند)

فیصلہ آسمانی

در باب

مسیح قادیانی

عین اسی شب میں جبکہ مسلمانوں کی قسمت کا آفتاب گھنارہا تھا، یعنی: ”بالمومنین رؤوف رحیم صلوات اللہ علیہ و سلامہ“ پر مرض الموت کی تکلیف کی ابتدا ہو چکی ہے، تقریباً نصف رات گذرے آپ ”ابومویبہ“ اپنے خاص غلام کو جگاتے ہیں اور فرمانے ہیں کہ اٹھو! قبرستان ”بقيع غرقہ“ کی طرف چلیں کہ مجھے ان کے لیے استغفار کا حکم دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ آپ مع ابومویبہ اس سنسان بھیا تک رات میں مقبرہ کے اندر داخل ہوئے اور قبروں کے قریب ہو کر ایک درناک لہجہ میں زمین کے نیچے سونے والوں کو ان لفظوں کے ساتھ مخاطب فرمایا:

”بہت مبارک تھے وہ دن جن میں تم نے زندگی گذاری، بخلاف ان دنوں کے جس میں دنیا آج داخل ہوتی ہے، رات کی سیاہ تاریک ٹکڑوں کی طرح فتنے سامنے آرہے ہیں، ایک فتنہ دوسرے فتنہ کے پیچھے لگا ہوا ہے اور ہر پچھلا پہلے سے زیادہ اترے۔“

عزیز علیہ عنہم صلوات اللہ علیہ و سلامہ، تو آخر چند ہی دنوں کے بعد رفیق اعلیٰ سے جا ملے، پر وہ بکثرت انگیر قروں ہماری قسمت میں تھے کہ فتنوں کا تار بندھا ہوا ہے، ایک نہ ختم ہونے والا تانتا ہے، جو کسی طرح نہیں ٹوٹتا اور ایک ہی باب نہیں، بلکہ شرارتوں کے سیکڑوں دروازے کھل پڑے ہیں، اسلامی معاملات کے ہر شعبہ، ہر سلسلہ میں مفاسد کے سمندر ہیں، جو اٹھنے چلے آتے ہیں اور بلاشبہ اہل بصیرت کے نزدیک اس سمندر کے ہر موج اخیر، اول سے زہراک، خطر آفرین ہے۔

اوروں کو، بہنے دو، تم تھوڑی دیر کے لئے اس دجالی لائن پر ایک آدھ نظر ڈالو، جس پر

میلہ ساج اسود غنسی وغیرہ کے علاوہ تمہارے سامنے مصر کا مہدی، جوینور کا مہدی، اصفہان کا نبی اسحق، جوزستان کا مہدی (بانی فرقہ باطنہ، یا اقرامطہ) نیشاپور کا فرندین، فروزین، مدعی نبوت، جبل سوس کا مہدی، محمد بن نو مرث، دولت عثمانیہ کا مشہور عیسیٰ، جو دراصل یہودی تھا اور عیسیٰ ہونے کا مدعی ہوا، اخیر میں خلیفۃ المسلمین سلطان محمد کی تہدید کے بعد تائب ہو کر مسلمان ہوا، اسی کے ساتھ ایک مسلمان نے مہدیت کا بھی دعویٰ کیا، مغیرہ بن سعید اسلام کا دوسرا عیسیٰ، فارس بن تکلیٰ مصری تیسرا عیسیٰ، نیا بن بن سمعان مدعی نبوت، ”مقتع“ مدعی الوہیت اور پھر آدمیت، عیسائیت، موسویت، ادریسیت، ابراہیمیت، محمدیت، تہدیت، مجددیت، محدثیت، امامیت وغیرہ عادی کو ایک صندوق میں بند کر کے اپنے سر پر تن تہا اٹھنے والا، عربی اور فارسی کا مشہور انشاء پرداز احمد کیال، جو کہا کرتا تھا کہ ان تمام صفتوں کو خدا نے گھول کر ایک ہی گھونٹ میں سب ہمارے اندر پیوست کر دیا ہے۔

ایران کا بہاء اللہ نبوت کا مدعی وغیرہ ذلك من الممہدئین، والمجانین، والمنتین، العیسائین کی ایک غول نظر آئے گی، جو یقیناً تاریک راتوں کے سیاہ ٹکڑوں سے کسی طرح کم نہیں۔

اسلام کی بہت کم صدیاں ایسی ہیں، جن میں اس قسم کی شرارتوں کا سیلاب اسلامیوں میں تہلکہ انگیز نہ ہوا، ہر قرن میں ان ابلسی غیاب و ظلمات نے مسلمانوں کے دل و دماغ میں روحانی تاریکیاں پیدا کی ہیں، لیکن الحمد للہ کہ جہاں ان صورتوں کے ساتھ شیطان اپنے سوار و پیادوں کے جلو میں ظاہر ہوتا رہا ہے، وہیں قہار قدوس کی جبروتی طاقتوں نے اسے روشن و تیز شعاعوں والے آفتاب بھی پیدا کئے، جن کی تاباں اور گرم گرم کرنوں نے ان ناپاک چشموں کو خشک کر دیا، جو اس قسم کے نجس دلوں سے پھوٹ پھوٹ کر روحانی آبادیوں میں اکٹھے ہوئے تھے، حتیٰ کہ تم دیکھتے ہو کہ آج نہ مہدیوں کا پتہ ہے، نہ ان جعلی عیسوں کو کائی ذکر، نہ ان متبعیوں کا کوئی نام لیا، بلکہ نہ اس نبوت بوقلمونی کے مدعی احمد کیال کا، جو اپنے کو عیسیٰ بھی کہتا تھا اور موسیٰ بھی، مہدی بھی، محدث بھی، لیکن آج ان تمام دعویوں سے کسی ایک کی بھنک نہیں سنی جاتی اور اگر کہیں ہیں بھی، تو اس کی وقعت کسی تاریک کوچہ کی ان پرنالوں سے زیادہ نہیں، جن پر آفتاب کی روشنی پہنچ سکتی، یا پہنچتی ہے، تو مٹی کی موٹی تہیں اس کی شعاعوں کو

وہاں تک نافذ ہونے نہیں دیتی اور ایسا ہونا ضروری ہے کہ وہ باطل تھا، جس کی قسمت میں زہوق، فرسودگی کے علاوہ اور کچھ نہیں اور یہ حق و صداقت تھا، جس کی پیشانیوں پر ہمیشہ بلندی کے تاروں کو چمکتا ہوا دیکھا گیا ہے اور جبکہ ایسا ہے، تو پھر تم قادیان کے اس فتنہ مظلمہ سے کیوں خوف کرتے ہو، جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، اس زنجیر کی اور کڑیاں، جہاں ناپید ہوئیں، آخر کیا وجہ ہے کہ اس کا حشر بھی وہی نہ ہوگا۔ ولن تجد لسنة الله تبديلا

اور رب قدر تو یہ کربھی چکا، جس کی بعض وجوہات کا علم، لاہور و قادیان دونوں پر نظر ڈالنے کے بعد ہو سکتا ہے اور سب سے مستحکم، متین مدبیر الہی وہ ہے، جو مونگیر (صوبہ بہار) خانقاہ رحمانی کی مسلسل مجاہدات، و متعدد رسائل منشورات کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔

حضرت مولانا محمد علی صاحب قبلہ مدظلہ العالی کو خدا جزاء خیر دے کہ بلا خوف ”لومۃ لائم“ آپ ادھر متوجہ ہوئے اور چند ہی دنوں میں آپ کی مرکزی جماعت علمیہ نے اس فتنہ کے سدباب میں علی الخصوص صوبہ بہار میں نہایت شاندار کامیابی حاصل کی، حتیٰ کہ مقدمہ کی بھی نوبت آئی، مناظرے بھی ہوئے، لیکن جیسا کہ سنت اللہ جاری ہے کہ اس نے ہمیشہ جھوٹ کے سر کو سچائی کے چٹانوں سے کچل دیا ہے، ان موقعوں میں بھی یہی ہوا۔ والقصہ بطولھا۔ اس وقت ہمارے سامنے اسی مجاہدہ دینیہ، وسیعی ملی کے شاداب نتائج کا ایک خوبصورت پھول ”فیصلہ آسمانی“ کے نام سے مضمون ہو کر رکھا ہوا ہے۔

میں اس رسالہ کو دیکھ رہا تھا، جب کتاب ختم ہوئی، تو یکا یک میرے ذہن میں معلومات کا ایک سلسلہ مرتب ہو گیا، جو گویا رسالہ کا ایک عکس تھا، میں نے اسی وقت ارادہ کیا کہ اس سے قلم بند کر لوں، تاکہ ناظرین ”الرشید“ (جن میں اکثر کو قادیانوں کے ساتھ معاملہ پڑتا ہوگا) بھی اس سے مستفید ہو سکیں، ذیل کے خیالات اسی آسمانی فیصلہ سے ماخوذ ہیں۔ گرچہ مولانا نے مدوح نے اس سے بہت زیادہ ارقام فرمایا ہے، وہیں بطور تقریظ کے اس کے جتہ جتہ مضامین کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ درج کروں گا۔

”اس رسالہ میں نہایت شد و مد سے ثابت کیا گیا ہے کہ مرزا غلام احمد، سکند قادیان، علاقہ پنجاب میں ہرگز اس کی صلاحیت نہ تھی کہ کوئی مسلمان اس کی اتباع کرے اور نہ صرف یہ، بلکہ اہل کی پیروی براہ راست انسان کو گرم مقام تک پہنچا دیتی ہے۔“

اس دعوے کو جس خوبی سے مدلل کیا گیا ہے، درحقیقت اتنی ملامت پسندی، اور متانت کی نظیر تردیداتِ قادیانی کی کسی اور کتاب میں مل نہیں سکتی۔ فرماتے ہیں، جس کا ماحصل یہ ہے کہ امتِ اسلامیہ اس وقت تین طائفوں میں منقسم ہے:

۱۔ صوفیاء کرام جنہیں خداوند عزیز نے نورِ باطن، صفاءِ قلب، روشنی، بصیرت، فراستِ ایمانیہ سے نوازا ہے، جس کے ذریعہ سے وہ حق و باطل کو الگ الگ کر کے دیکھ لیتے ہیں۔

۲۔ علماءِ عظام جن کے ہاتھ میں قرآن و حدیث، آثار و سنن موجود ہیں، جس میں مہدی، عیسیٰ علیہما السلام کی علامات واضح طور پر بیان کی گئیں ہیں۔

۳۔ مسلمانوں کا وہ طائفہ جو نہ نورِ باطن رکھتا ہے اور نہ علمِ ظاہر سے کوئی بہرہ۔

اب ظاہر ہے کہ اربابِ باطن میں سے کسی نے مراز کی تصدیق نہ کی، حالانکہ اگر وہ واقع مہدی ہوتا، تو سب سے پہلے اس کے قدموں میں سر ڈالنے والا گروہ ہوتا۔ اسی طرح علماء میں بجز چند عبدالدرہم و الطاغوت کے اور سبہوں نے انکار کیا کہ مہدی، یا مسیح کی کوئی علامت اس میں نہیں، ہم اسے مکرر کرتے، لیکن چونکہ وہ طریقہ علماء کے دریافت کرنے کا ہے اور وہ اسے جانتے ہیں، اس لیے ضرورت نہیں۔

البتہ عوام بیچاروں کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، وہ دل کی بینائی سے محروم ہیں اور ان کے ہاتھ میں حدیث و آثار کی شمع بھی نہیں، بیشک ان کے لیے سخت وقت ہے۔ خصوصاً اس وقت جبکہ آزادی کا زمانہ ہے، مشکلات اور بھی پیچیدہ ہو گئے، کیونکہ آسان طریقہ تو ان کے لیے یہی تھا کہ صوفیہ و علماء کی تقلید کرتے، مگر کچھ علماء شرار و صوفیاء بد اطوار اور کچھ اثر زمانہ نے ان کی تقلید کے بازار کو سرد کر دیا ہے، اس لیے میں نے ان لوگوں کے لیے کسی عالم کا نہیں، کسی صوفی کا نہیں، کسی مناظر کا نہیں، کسی فقیہ کا نہیں، حتیٰ کہ کسی نبی کا بھی نہیں، بلکہ حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ کا ایک آسانی فیصلہ جو آسان بھی ہے اور مختصر بھی ہے، مسلمانوں کے ہاتھ میں دیتا ہوں، انشاء اللہ ان پر خود حق واضح ہو جائے گا اور معلوم ہوگا۔ زمین پر تو خیر، آسمانوں پر مرزا کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہوگا، اور خدائے برتر کی نگاہوں میں اس کی سیاہ حقیقت کیا رتبہ رکھتی تھی، اس کے بعد تیرہ بختی ہے کہ انسان اپنے مالک یگانہ کے فیصلہ سے بھی منہ موڑے، اگر انسانوں کی آراء قابلِ سماعت نہیں، تو نہ ہو، لیکن کیا خدا بھی اس قابل نہیں کہ

اس کی آواز نہ سنی جائے اور اس کے فیصلہ کے آگے گردن نہ ڈال دی جائے، یقیناً اتباع ہوئی ہے، اگر ان کے بعد لوگ خدا کی طرف خلوص دل کے ساتھ نہ بھاگے اور مرزا کی اتباع میں جو کچھ ناسزا باتیں ان سے سرزد ہوئیں، اس سے تائب نہ ہوئے۔

﴿ففر و الی اللہ انی لکم منہ نذیر﴾

”پس بھاگو طرف خدا کی، میں اس سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔“

پوری تفصیل کا علم بغیر رسالہ کے دیکھنے کے ممکن نہیں، لیکن اختصار جو ممکن ہے مطلب کے ادا کرنے میں شاید کافی ہو، یہ ہے:

وہ آسمانی فیصلہ ہم تک بذریعہ خاتم النبیین، السید العربی الامی صلی اللہ علیہ وسلم نسلًا بعد نسل تو اتر کے ساتھ منتقل ہوتا رہا ہے، یہ ہے:

۱. ﴿فلا تحسبن اللہ مخلف و عدہ﴾

”ہرگز ہرگز خدا کو گمان نہ کرو کہ وہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے

گا۔“ (سورہ ابراہیم، رکوع نمبر ۷)

یہ ایک صریح و ناطق فیصلہ ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ رسولوں کی علامت یہ ہے کہ خدا ان سے وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

۲. ﴿لن یخلف اللہ و عدہ﴾

”ہرگز نہیں خدا وعدہ کا خلاف کرتا ہے۔“

۳. ﴿ان اللہ لا یخلف المیعاد﴾

”یقیناً خدا اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔“

۴. ﴿لا یخلف اللہ و عدہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون﴾

”نہیں خلاف کرتا ہے خدا۔ اپنے وعدوں کا، لیکن آدمی نہیں جانتے۔“

۵. ﴿ما یبدل القول لدی﴾

”ہمارے نزدیک (ہمارے اقوال میں) تغیر نہیں“

۶. ﴿لا تبدل لکلمات اللہ﴾

”اللہ کی باتوں میں تبدیلی و تغیر نہیں۔“

ان سب کا حاصل یہ ہے کہ خدا عموماً کسی سے وعدہ خلافی نہیں کراتا اور خصوصاً رسولوں

سے، جیسا کہ ہر ایک شخص ان فیصلوں کے بعد سمجھ سکتا ہے، بس اب تمام دنیا کے علما اور صوفیہ سے قطع نظر کر کے محض ان فیصلوں کو ہاتھ میں لو اور مرزا غلام احمد ولد مرزا غلام مرتضیٰ، پسر مرزا عطا محمد، سکنہ قصبہ قادیان (احاطہ پنجاب) پر اسے جاری کر کے دیکھو کہ وہ نبی ہے، یا نہیں، اگر نہیں ہے، تو پھر بیچارہ مسلمان بھی تھا، یا نہیں، اگر مسلمان نہیں ہے، تو صرف گمراہ ہے، یا گمراہ ہونے کے ساتھ مغضوب اور دوسروں کو گمراہ کرنے والا تھا۔ انشاء اللہ اسی کے ذریعہ سے تمام سوالوں کا جواب مل سکتا ہے۔

چاہیے کہ تمہارا دماغ اس وقت جبکہ تم انصاف، وعدالت کی کرسی پر بیٹھ کر آسمانی فیصلہ کے ماتحت ہو کر رائے قائم کرنے والے ہو، کسی مولوی، یا ملا، یا صوفی کے خیالات سے متاثر نہ ہو، محض آزاد و مخلصی بالطبع ہو کر سوچو، پس سنو:

اگر مرزا نبی ہوتا، تو آسمانی فیصلہ کے اعتبار سے ضرور تھا کہ خدا اس سے خلاف وعدگی نہ کرتا، لیکن معمولی معمولی پیشگوئیاں تو خیر سب سے عظیم الشان، منج القدر پیشگوئی (یعنی: دختر احمد بیگ سے نکاح کی پیشگوئی) جس کے متعلق مرزا صاحب کو ہر ایک قسم کا بھروسہ تھا اور جس کی صداقت پر اعتماد کر کے آپ کی پنجابی اردو نما الاپ یہ تھی:۔

پیشگوئی کا جب انجام ہویدا ہوگا قدرتِ حق کا عجب ایک تماشا ہوگا

جھوٹ اور حق میں جو ہے فرق وہ پیدا ہوگا کوئی پاپائے گا عزت کوئی رسوا ہوگا

اور جس کے متعلق مرزا سترہ برس انتظار کرتا رہا، دھوم مچائی شور کیا، لیکن تمام عالم کو معلوم ہے اور اس وقت کم از کم ہزاروں، بلکہ لاکھوں آدمی گواہ ہیں کہ اس پیشگوئی کے متعلق مرزا صاحب کا لفظ، لفظ، حرف غلط ہوا۔ بتاؤ کہ آسمانی فیصلہ:

﴿فلا تحسبن الله مخلف وعده رسله﴾

”ہرگز ہرگز خدا کو گمان نہ کرو کہ وہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا۔“

..... اس فصاحت و بلاغت کی بھی کوئی انتہا ہے ”پا جائے گا“ میں ”جائے گا“ کی ترکیب کتنی صحیح ترکیب ہے۔ سچا کو مخاطب کرتے ہوئے مسیلہ نے جو کچھ کہا تھا، اس سے مرزا نے باوجود مقصد مشترک ہونے کے، یعنی: دونوں نکاح و ہمسری کی خوشخبری دے رہے ہیں، مرزا صاحب کا بیان ذرا مہذب ہے، مسیلہ نے بھی جب سچا (ایک عورت تھی) پہلے ایک وحی پڑھی، جواز حدیث ہے، لیکن اس کے بعد کچھ اشعار پڑھے:

کا کیا اقتضاء یہ نہیں کہ مرزا نبی نہ تھا؟ بلاشبہ ایسا ہی ہے، ورنہ لازم آتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کا قول غلط ہو اور جبکہ نبی نہ تھا، تو کیا مسلمان تھا، اس کے لیے بھی تمہارے سامنے ایک آسانی فیصلہ پیش کرتا ہوں:

﴿ومن اظلم ممن افترى على الله كذبا﴾

”اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے، جس نے خدا پر جھوٹ باندھا۔“

اس فیصلہ کا حاصل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والے سے زیادہ ظالم نہ کافر ہے، نہ مشرک ہے، نہ بدعتی، نہ فاسق، خدا پر جھوٹ باندھنا سب سے بدترین کفر ہے، جیسا کہ اسی فیصلہ کی شرح میں دوسرے مقام میں وارد ہے:

﴿قل ان الذين يفترون على الله الكذب لا يفلحون﴾

متاع فى الدنيا ثم الينا مرجعهم ثم نديقهم العذاب

الشديد بما كانوا يكفرون﴾

الا قومى الى النيك فقد هنى لك المضجع

فان شئت ففى البيت وان شئت ففى المخدع

وان شئت سنلقاك وان شئت على اربع

وان شئت بثلاثيه وان شئت به اجمع

سجاح پہلی صورت سے راضی ہوگئی، چونکہ اشعار فحش ہیں، اس لیے ترجمہ سے معذور

سمجھا جائے۔

”سو کہو (اے محمد) جو لوگ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں، کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے، دنیا

کی ایک ذلیل پونجی (کے علاوہ اور ان کے افتراء سے کوئی فائدہ نہیں) پھر ہماری

طرف ان کی بازگشت ہے، ہم پھر انہیں دکہہ چکھائیں گے انکے کفر کی وجہ سے۔“

اس سے صاف معلوم ہوا کہ ”افتراء علی اللہ“ کفر ہے، اب ظاہر ہے کہ جب آسمانی

فیصلہ آسمانی کے حکم سے مرزا صاحب کی نبوت باطل ہوگئی اور ثابت ہوا کہ وہ نبی نہ تھے، تو پھر

اب مرزا صاحب کا یہ دعویٰ کرنا:

”میں نبی ہوں، میرا انکار مستوجب سزا ہے۔“ (توضیح مرام: ۱۱)

یا کہنا:

”سچا خدا وہی ہے، جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا۔“

”خداوند تعالیٰ نے اس امت میں سے مسیح موعود بھیجا، جو اس پہلے مسیح سے اپنی تمام شان میں بڑھ کر ہے اور اس نے اس دوسرے مسیح کا نام غلام احمد رکھا“ یہ سب خدا پر افتراء نہیں تو اور کیا ہے اور جو شخص خدا پر جھوٹ باندھا کرتا تھا، کیا اب وہ

﴿ثم نذيقهم العذاب الشديد بما كانوا يكفرون﴾

”ہم پھر انہیں دکھ چکھائیں گے ان کے کفر کی وجہ سے“

کے عواقب میں مبتلا نہ ہوگا اور کیا اس کے پیروکاروں کو بھی اس آسمانی تحویف سے

کانپنا نہیں چاہئے.....؟

مندرجہ بالا بحثوں سے بخوبی ثابت ہو گیا کہ مرزا غلام احمد پر غلام مرتضیٰ، سکندہ قادیان نہ نبی تھا اور نہ ولی، اور نہ مسلمان، بلکہ ایک مفتری، ظلم، کاذب، کافر شخص تھا اور جو ایسا ہو، اس کی پیروی کرنے والا اپنا ٹھکانہ اگر ہاویہ کی خندقوں میں نہیں بنا رہے ہیں، تو کہاں بنا رہے ہیں؟ خدا ان کو اپنے غضب سے بچائے کہ شیطان نے اپنی کامیابیوں کا انہیں اچھا آلہ بنا رکھا ہے اور اپنی پرانی تمنا:

﴿لا قعدن لهم صراطك المستقيم ثم لا تينهم من بين

ايديهم ومن خلفهم وعن ايمانهم وعن شمائلهم

ولا تجد اكثرهم شاكرين﴾

”یقیناً ضرور بیٹھوں گا تیرے سیدھے راستے پر ان کے لیے، پھر ان کے

سامنے سے بائیں دائیں جانب سے آؤں گا، تو (اے خدا) ان میں

اکثروں کو شکر کرنے والا نہیں پائے گا۔“

اس زمانہ میں ان سوختہ عقلوں کے ذریعہ سے نکال رہا ہے، کتنے ہیں جن کے دلوں پر

مہر اور آنکھوں پر پردے اور کانوں میں ڈاٹ ڈال دیئے گئے، جو اب سیدھا راستہ نہیں

پاسکتے۔

مسئلہ جذب و کشش

پر

ایک تنقیدی نظر

حدیث از مطرب و میگو در از دہر کمتر جو کہ کس نکشو و نکشاید حکمت اس معمارا کہا جاتا ہے کہ عقلمن فطرۃً آزاد ہے، لیکن جب پوچھا جاتا ہے کہ کن چیزوں کے لیے؟ تو قولاً نہ سہی، تاہم عملاً ہمیشہ حاملانِ لواءِ حریت و آزادی سے ہمیں یہی جواب ملتا ہے کہ مذہبی دائروں کے لیے، الہی احکام و حدود کے لیے، مسائلِ نبوت و تعلیماتِ سماوی کے لیے اور بس۔

ورنہ آخر پھر یہ کیا ہے کہ تعلیم و تمدن، تہذیب و معاشرت، خیالات و عقائد کے سوا آج جتنے ابواب ہیں، سب میں مشرقی عقلیں، بصد نیاز و اضطرار، محرابِ مغرب کے آگے سر بسجود ہیں اور یہی نہیں آزادی کا میدان جس قدر فلسفہ میں وسیع ہے، شاید دنیا میں اتنی فراخی کسی کو نصیب نہیں۔ فلسفی دعویٰ کرتا ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، ان ہی قوتوں کے ذریعہ سے کہتا ہوں جس میں ہر ایک انسان شریک ہے، وہ خود تقلیدِ اشخاص پروری کا دشمن ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دیتا ہے، وہ چیلنج دیتا ہے کہ ہمارے دلائل و قیاسات پر جس کو شبہ کرنا ہو، کرے۔

لیکن اس تیرہ بختی کا اندازہ کرو کہ ہم اس میں بھی یورپ کی کورانہ تقلید کرنے سے باز نہیں آتے، اس کی متکبرانہ تحدیوں کو سنتے ہیں اور دم بخود ہو کر چپ چاپ بیٹھ جاتے ہیں۔ ایشیائی عقلموں کی یورپ تضحیک و توہین کرتا ہوا اپنے دعاوی کو تحقیقات کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، لیکن وانے برجمود! کبھی اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ آخر ہم بھی آدمی ہیں، ہمارے پاس بھی ادراک و علم کے وہ آلات موجود ہیں، جس سے یورپ کام لیتا ہے، پھر یہ مرعوبیت کیوں؟ تذلیل و نیازی کی وجہ؟ آخر عقل اگر آزاد ہے، تو اس کی آزادی

اتنے تنگ دائرہ تک کیوں محدود ہو (العیاذ باللہ) جب وہ خدا اور اس کے انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پابندیوں سے بیزار ہے، تو پھر نیوٹن اور ہملٹن کو مسٹ ڈیکارٹ کی زنجیروں کو کیوں نہیں توڑ سکتی؟

بلاشبہ علمی میدانوں میں عصبيت و وطنيت کو گذر نہیں، لیکن آزادی کا تقاضا یہی نہیں کہ یورپ جو کچھ کہتا ہے، کبھی کبھی اسے ہم بھی معیار صحیح پر جانچیں، دیکھیں تو سہی کہ ان بڑھے چڑھے دعووں میں سچائی کا کتنا حصہ ہے؟ حریت کی تلوار اگر یورپ نے ہمارے ہاتھوں دی ہے، تو کیا اس کی مشق کے لیے سب سے پہلے یورپ کی تقلید سزاوار نہیں؟ تمہارے نزدیک نہ ہو، لیکن ہم تو یہی سمجھتے ہیں اور آج اس کے لیے ”جذب و کشش“ کے مسئلہ کو منتخب کیا جاتا ہے کہ فلسفہ جدیدہ کے اکثر اصول کا مرجع بحث اخیر میں یہی مسئلہ ٹھہرتا ہے۔ موجودہ ”نظام کشی“ کا دلفریب تحلیل اس کے ثمرات و نتائج میں سے ہے، پھر ساتھ ہی اس کے اہل وطن کے نزدیک اس کا مفہوم اجنبی بھی نہیں رہا ہے۔

لیکن تقریر و نقد سے پہلے مجھے بتادینا چاہئے کہ آئندہ میں جو کچھ بھی لکھوں گا، وہ گویا بمنزلہ شہادت و شکوک کے ہوں گے، جدل و طعن خواہ مخواہ مجھے منظور نہیں، بلکہ سمجھنا چاہتا ہوں، پھر اگر کوئی صاحب میری تسلی کر سکتے ہیں، تو میں اس کو نہایت سکوت و خاموشی اور انصاف سے سنوں گا، اگر تشفی ہوگئی، تو اپنے شکوک کو واپس لینے کے لیے بھی تیار ہوں۔

تقریر مسئلہ جذب و کشش

یورپ کے سامنے جس شخص نے سب سے پہلے اس مسئلہ کو ایک علمی صورت میں پیش کیا، وہ سراسحاق نیوٹن تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے سے وہ اس پر غور کر رہا تھا کہ درختوں کے پھل، ٹہنیوں سے خود بخود کس طرح ٹپک پڑتے ہیں؟ آخر تحقیق و تلاش کے بعد وہ اس

..... میں نے یورپ کی تخصیص اس لئے کی کہ مشرق میں اس کی آواز آج سے صدیوں پہلے اٹھائی جا چکی ہے۔ ثابت بن قرہ نے اسکی تقریر و اثبات میں بہت زیادہ زور لگایا ہے اس کا خیال تھا کہ اگر زمین کے کرہ کو اس مقام سے جہاں اس وقت ہے اٹھا کر آفتاب کے قریب ڈال دیا جائے گا تو جو ڈھیلہ یا یہاں سے پھنکا جائے گا وہ کھینچ کر اٹھا کر سے مل جائے گا۔ تفصیل کے لئے دیکھو مباحث مشرقیہ امام رازی و نیز تفسیر کبیر، بلکہ فارسی کا مشہور کرہ مرآة الخیال بھی اس کی تصریح کرتا ہے۔ شعرا کی کتابوں میں اسکے متعلق بہت زیادہ معلومات ملتی ہیں۔ ۱۲

نتیجہ تک پہنچا کہ زمین میں ایک خاص قسم کی قوت جذبہ موجود ہے، جو پھلوں کو ٹہنیوں سے اور ڈھیلوں کو (جسے کسی نے پھینکا ہو) ہوا سے بندوق کھا کر مر جانے والے شکاروں کو درختوں سے نیچے کھینچ لیتی ہے۔

اس کی مثال بجنسہ ایسی ہے کہ تم زمین پر مقناطیس کی تہ جمادو اور درختوں میں مصنوعی پھل لوہے کے لگا دو، وہ درخت سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس مقناطیسی سطح پر گر جائیں گے۔ ابتداء ابتداء میں یہ مسئلہ صرف چند چیزوں تک محدود رہا، لیکن رفتہ رفتہ نیوٹن کی نازک خیالیوں نے اس کے دامن کو پھیلا نا شروع کیا، حتیٰ کہ دنیا کے سامنے وہ دن بھی آ گیا کہ نیوٹن اس قوت کو تمام اجسام میں خواہ سفلی ہوں، یا علوی ثابت کرنے لگا، اس نے دعویٰ کیا کہ آفتاب زمین کو کھینچتا ہے، زمین آفتاب کو اپنی طرف جذب کرتی ہے، حتیٰ کہ تمام اجرام سماویہ، سیارات ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ غرض کہ چند ہی دنوں میں آسمان و زمین کے قلابے ان غیر محسوس زنجیروں کے ذریعے سے آپس میں ملا دیئے گئے، جو اخلق کو شاہ بلوط کے نیچے نظر آئی تھی۔

حتیٰ کہ اخیر میں غلو و اغراق اس درجہ تک ترقی کر گیا کہ اس سے متاثر ہو کر ایک جدید

مصنف لکھتا ہے:

”قوت کشش کے ذریعے سے صرف زمین ہی اور اشیاء کو اپنی طرف نہیں کھینچتی، بلکہ یہ قوت کل اجسام میں ہے، عام اس سے ذی روح ہوں، یا غیر ذی روح، اگر دنیا میں ہمارے اور آپ کے سوا کوئی ہستی نہ ہوتی، تو ہم اور آپ چپک جاتے، کیونکہ ہماری قوت کشش آپ کو ہماری طرف کھینچتی اور آپ کی قوت جذبہ ہم کو آپ کی طرف، پس دونوں مل جاتے۔“

ایک اعتراض اور اس کا جواب

نیوٹن نے جب اپنے اس نظریہ کو اس قدر عام کیا، تو اعتراض کیا گیا کہ زمین جب آفتاب سے دس لاکھ حصہ چھوٹی ہے اور آفتاب کے جذبات کا اثر اربوں میل دور رہنے والے سیاروں پر پڑتا ہے، تو زمین پر بدرجہ اولیٰ زیادتی کے ساتھ پڑنا چاہئے، علی الخصوص جب زمین بھی آفتاب کو کھینچتی ہے، تو چاہئے کہ دونوں آپس میں ٹکرا جائیں۔

اس عقدہ کی گرہ کھولنے کے لیے اس نے ایک مثال سے کام لیا، یعنی: فلاخن (جس میں بچے ڈھیلے کھکر گھمایا کرتے ہیں) لے کر اس نے کہا کہ اسے خوب زور سے گھماؤ، جب وہ اپنی پوری تیزی پر آجائے، تو اندازہ کرو کہ ڈھیلے کی طبیعت کیا چاہتی ہے، تم دیکھو گے کہ جو دائرہ اس کی گردش سے پیدا ہو گیا ہے، اس سے نکل بھاگنے کی کوشش کرے گا، حتیٰ کہ کبھی نایت زور میں آ کر نکل بھی جاتا ہے۔

الغرض اسی کے ساتھ مخصوص نہیں، جو چیز اس طرح چرخ کھاتی ہے، اس میں قطعی طور پر یہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس قوت کا نام ”قوت المرکز“ ہے، یعنی: مرکز سے جسم کو الگ کرنے کے درپے ہوتی ہے، پس اسی طرح یہاں بھی سمجھو کہ زمین آفتاب کے ارد گرد چرخ کھا رہی ہے اور یہ گردش اس قدر تیز اور شدید ہے کہ گھنٹہ میں اڑسٹھ ہزار دو سو ستر میل مسافت زمین طے کر لیتی ہے۔ ایسی حالت میں اس میں قوت تارک المرکز کا پیدا ہونا ضرور تھا، جس کا تقاضا ہے کہ زمین اپنے مدار سے نکل کر اس کے مرکز (آفتاب سے) بہت دور جا پڑے اور مدار کے وسط میں اس کا مرکز چونکہ آفتاب ہے، وہ اپنی پوری قوت سے اسے کھینچ رہا ہے اور زمین بھی اسے کھینچ رہی ہے، جسے ہم ”قوت طالب المرکز“ سے تعبیر کرتے ہیں، پس قوت تارک المرکز اور قوت طالب المرکز کی باہمی تزام و مقابلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ زمین اپنے مدار پر گھوم رہی ہے، ورنہ ان قوتوں میں سے اگر ایک بھی نثار ہو جائے، تو اس وقت زمین یا تو آفتاب سے ٹکرا جائے گی (یہ اس صورت میں کہ قوت تارک المرکز معدوم ہو جائے) یا آفتاب سے اس قدر دور ہو جائے کہ وہاں تک نہ آفتاب کی پوری حرارت پہنچ سکتی ہے اور نہ روشنی، جیسا کہ بعض تاریک سیاروں کا حال ہے (یہ اس صورت میں کہ قوت طالب المرکز باطل ہو جائے) اس طویل کلام کی تحلیل کرنے لینے کے بعد جو صورت رہ جاتی ہے، وہ اس قدر ہے:

- ۱۔ پھل چونکہ درخت سے ٹپکتے ہیں اور ان کے لیے کوئی دوسرا سبب نہیں، اس لیے معلوم ہوا کہ زمین اپنی طبعی کشش سے ان کو کھینچ لیتی ہے۔
- ۲۔ اسی پر ہم آفتاب، زمین اور تمام سیارات کو قیاس کر لیں۔
- ۳۔ زمین آفتاب سے اس لیے نہیں ملتے کہ اس میں ایک قوت تارک المرکز بوجہ دوری

حرکت کے پیدا ہوگئی ہے، جیسا کہ فلاخن کے ڈھیلوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔

ہم ان تمام مقدمات پر بائفصیل گفتگو کرتے ہیں۔

اولاً یہ غلط ہے کہ پھلوں کے ٹپکنے کی علت علاوہ جذب و کشش کے اور کوئی نہیں نکلتی، حالانکہ کہا جاسکتا ہے کہ جب تک پھل چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، اس وقت ان کا وزن کم رہتا ہے اور جس ٹپنی میں وہ لگے ہوتے ہیں، ان کا اتصال بھی درخت سے قوی رہتا ہے، پھر بوجہ حرارت وغیرہ ان کے اندر کچھ ڈھیلا پن اور تفرق پیدا ہوتا ہے، ادھر پھلوں کا وزن بھی زیادہ ہو جاتا ہے، اس لیے شاخیں ان کی متحمل نہیں ہو سکتیں، بالآخر اس کے چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

کہہ سکتے ہو کہ اس کا مدار وزن کے ثبوت پر ہے اور نیوٹن وزن اور ثقل کا منکر ہے، لیکن چونکہ وزن کا انکار جذب و کشش کے ماننے کے بعد ثابت کیا جاتا ہے اور ابھی تک وہ ثابت نہیں ہوا، اس لیے یہ انکار ناقابلِ سماعت ہے، پھر تم یہ بھی پوچھ سکتے ہو کہ جب تک آم کی کیریاں چھوٹی ہوتی ہیں، زمین انہیں کیوں نہیں کھینچتی، حالانکہ اس وقت طاقت کم صرف ہوگی کہ ان کا مادہ بہت تھوڑا ہوتا ہے، کشش کا اثر بہ نسبت آئندہ زمانے کے اس وقت زیادہ پڑنا چاہئے۔

اور اس کو بھی جانے دو، ہم اسی پھل کو جو درخت سے ٹپک گیا ہے، پھر دھاگے سے باندھ کر درخت میں باندھ دیتے ہیں، بتاؤ کہ زمین اسے کیوں نہیں کھینچتی اور اب وہ کیوں نہیں گرتا؟ اور اگر ہم فرض کر لیں کہ پھلوں کے ٹپکنے کی علت کشش زمین ہے، تو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہی نسبت آفتاب و زمین میں بھی ہے...؟ آخر اگر مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے، تو یہ کس طرح ثابت ہو جائے گا کہ سنگ مرمر بھی لوہے کو اپنی طرف کھینچ لے گا؟

ہم یورپ کے عام سطحوں کو مثالوں اور نظیروں کے ذریعہ سے استدلال کرتے ہوئے دیکھ کر اکثر معذور سمجھتے تھے، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ یہی نیوٹن جیسا فاضل حکیم بھی ایسا دعویٰ بلند آہنگی سے کرتا ہے، لیکن دلیل میں بجز چند مثالوں کے اس کے پاس اور کچھ نہیں دیکھا جاتا، پھلوں کو جذب و کشش کا ماتحت دیکھ کر قاعدہ کلیہ بنا لیتا ہے کہ تمام دنیا اور اس کے تمام اجزاء میں یہی قانون جاری ہے، نیوٹن میں اور اس حکیم میں کیا فرق ہے، جس نے ایک پتھر کو اپنے

ماننے گرتا ہوا دیکھ کر رائے قائم کی تھی کہ آسمان بھی پتھر سے بنا ہے۔؟ اور ہم ان سب چیزوں سے اگر قطع نظر بھی کر لیں، تو عقل و مشاہدہ کی شہادتیں صاف طور پر اسکی تکذیب کرتی ہیں۔

(۱)..... فرض کرو کہ ہم تمہارے ہاتھ کو کسی (جذبہ، مثلاً: سنگھی) وغیرہ سے کھینچتے ہیں، تو تمہیں محسوس ہوگا کہ کوئی چیز ہم کو کھینچ رہی ہے، پس اگر آفتاب زمین اور اس کے رہنے والوں پر اپنی کشش کا اثر ڈالتا، تو چاہئے تھا کہ ہمیں وہ محسوس ہوتا، حالانکہ نہیں ہوتا ہے۔

(۲)..... زمین اگر پھلوں کو کھینچتی ہے، تو پھر اس پر چلنے والے حیوانوں کو بھی بدرجہ اولیٰ جذب کرتی ہوگی اور جب کہ اس کا اثر آفتاب جیسے جرم عظیم تک پہنچتا ہے، تو مکھیوں اور چونٹیوں پر اس سے کہیں زیادہ پڑھنا چاہئے کہ یہ چیزیں بنسبت آفتاب کے قریب اور بہت قریب ہیں اور ان کا مادہ بھی بہت ہی کم ہے، حالانکہ معمولی کیڑوں تک کو گرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا، جب تک کہ وہ خود بیٹھنے کا ارادہ نہ کریں۔

(۳)..... مسئلہ جذب و کشش کے سمجھنے کے لیے ہمارے پاس مقناطیس اور لوہا موجود ہے، فرض کرو کہ ایک تولہ لوہے کو دو مقناطیسوں کے درمیان رکھتے ہیں، ایک طرف مقناطیس ایک سیر ہے اور دوسری طرف صرف ایک تولہ، ظاہر ہے کہ اس صورت میں لوہا ایک سیر والی کی طرف کھنچ جائے گا، پس اسی طرح آفتاب اور زمین کے درمیان جتنے موجودات ہیں، چاہیے کہ سب کے سب آفتاب کی طرف منجذب ہو جائیں کہ آفتاب کو زمین سے وہی نسبت ہے، جو ایک تولہ مقناطیس کو ایک سیر سے، کیونکہ یہ فلسفہ جدیدہ و قدیمہ دونوں کو مسلم ہے کہ آفتاب بہ نسبت زمین کے دس لاکھ حصہ سے زیادہ بڑا ہے، آفتاب کا قطر آٹھ لاکھ تر اسی ہزار دو سو چھیالیس میل ہے اور زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہے۔ غایت سے غایت سے خط استواء کا قطر میں ۳۵ میل کا اور اضافہ کیا جاتا ہے، حالانکہ معمولی غبار اور تنکے ہوا میں اڑتے ہیں اور آفتاب ان میں سے کسی کو نہیں کھینچتا۔

(۴)..... فلسفہ جدیدہ والے نور کو جسم مانتے ہیں، جو آفتاب سے نکل نکل کر دنیا میں پھیلتا

ہے، پس جبکہ تمام اجسام میں باہمی تجاذب ہے، تو چاہئے کہ آفتاب سے یہ اجسام نو ریہ نہ بکھیریں کہ یہ کشش کے منافی ہے، کم از کم کچھ کشاکش تو ہونی چاہئے، حالانکہ یہ بھی نہیں ہوتا کہ خود مغربی حکماء کی تصریح ہے کہ نور کی رفتار آفتاب سے زمین کی طرف اس قدر تیز ہے کہ اندازہ کرنے کے بعد اس کی سرعت توپ کے گولے کی سرعت سے دس لاکھ گنا زیادہ معلوم ہوئی۔

(۵)..... ہم پوچھتے ہیں کہ زمین ہوا کو بھی کھینچتی ہے، یا نہیں؟ اگر کھینچتی ہے، تو یہ کہنا کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں، حتیٰ کہ اگر صرف دنیا میں ہم تم رہتے، تو آپس میں چپک جاتے، یہ قاعدہ غلط ہوا اور اگر کھینچتی ہے، تو چاہئے کہ ہوا کو زمین کے خطوط کشتی تھام لیتے اور اس کے چلنے میں مانع آتے، حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔

(۶)..... فرض کرو کہ ہم مشک میں ہوا بھر کے اس کے منہ کو بند کر دیتے ہیں اور پھر پانی کے اندر لیجاتے ہیں اور زمین سے بالکل متصل کر دیتے ہیں، اب پوچھتے ہیں کہ زمین اپنا اثر جذب اس پر ڈالتی ہے، یا نہیں؟ اگر نہیں ڈالتی ہے، تو جذب کا قاعدہ عمومی غلط ہوا اور اگر ڈالتی ہے، تو ہمارے چھوڑ دینے کے بعد وہ اچھل کر کیوں اوپر نکل آتا ہے؟

(۷)..... زمین سے درخت کیونکر پیدا ہوتا ہے، اس کی علت بھی بیان کی جاتی ہے کہ بیج کے ذریعہ سے پانی اور مٹی اوپر چڑھتی ہے، حالانکہ زمین میں اگر قوت جذب کی ہے، تو اسے کیوں نہیں تھامے رہتی ہے۔ کس قوت کا اثر ہے وہ اسے چھوڑ دیتی ہے؟

(۸)..... یورپ کو بڑا ناز ہے کہ کشش و جذب کے مسئلہ سے اس نے سمندروں کے جزرومد (یعنی: جوار بھالے) کا راز دریافت کیا، حالانکہ اگر غور کیا جائے، تو جزرومد دراصل اس کی ابطال کے لیے کافی ہے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عامۃً حکماء مغرب کہتے ہیں کہ سمندر پر آفتاب اپنی قوت جذبیہ کا جب اثر ڈالتا ہے اور اسی طرح چاند بھی اس کے پانی کو اپنی طرف کھینچتا ہے، اس لیے سمندروں میں مدّ (چڑھاؤ) نمایاں ہوتا ہے، پھر جب اس پر زمین کی کشش غالب آتی ہے، تو جزر (اتار) پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ نسبت آفتاب کے قمر کا اثر سمندروں پر زیادہ پڑتا ہے، وجہ یہ یہی ہے کہ ماہتاب نسبت آفتاب کے سمندر سے

زیادہ قریب ہے، کیونکہ آفتاب ساڑھے نو کروڑ میل سے سمندر کے پانی کو کھینچتا ہے، بخلاف چاند کے کہ کل وہ تقریباً دو لاکھ اڑتیس میل سے اپنا عمل کرتا ہے۔

اب اس قاعدہ کے اعتبار سے کہ ہر جسم دوسرے جسم کو کھینچتا ہے تسلیم کرنا چاہئے کہ زمین بھی سمندر کے پانی کو کھینچتی ہے اور ظاہر ہے کہ زمین کو سمندر کے پانی سے بہت زیادہ قربت ہے، کیونکہ اس میں اور زمین کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں، دو میل، تین میل سے زیادہ گہرائی سمندروں کی آج تک ثابت نہیں ہوئی، اس کے علاوہ اس کو بھی پیش نظر رکھ لو کہ زمین اور چاند کی جسامت میں نمایاں فرق ہے کہ چاند کا قطر کل دو ہزار ایک سو ستر میل ہے اور زمین کا قطر آٹھ ہزار میل ہے۔

الغرض زمین سمندر سے قریب بھی ہے، اس کی جسامت بھی چاند سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے، پھر ایسی صورت میں چاند کی کشش کا سمندر پر غالب آنا کیا حیرت انگیز نہیں؟ کیا مثال بعینہ ایسی نہیں کہ چیونٹی اور ہاتھی ایک چیز کے کھینچنے میں زور لگاتے ہیں، لیکن چیونٹی غالب اور ہاتھی مغلوب ہو جاتا ہے؟ کیا کوئی معمولی عقل کا آدمی بھی اس کو تسلیم کر سکتا ہے....؟

پھر یہی نہیں، فرض کرو کہ چاند غالب آیا اور اس نے سمندر کو سو فٹ تک بلند کر دیا، جس کو عموماً خلیج فنڈا میں دیکھا گیا ہے، تو اس وقت پانی بنسبت پہلے کے چاند سے زیادہ قریب ہو گیا، چاہئے کہ اب اس کے غلبہ کا اظہار زیادہ ہو، حالانکہ بہت جلد زمین غالب آ جاتی ہے اور سمندر اتر جاتا ہے۔

جذب کا مقصد تھا کہ سمندر کھنچ کر بالکل کرہ قمر، یا آفتاب تک پہنچ جاتا ہے کہ جو زمین قریب غالب نہیں آسکی، اب دور ہو جانے کے بعد کیوں کر غالب آسکتی ہے؟

(۹)..... عجیب بات ہے کہ بارش بادل وغیرہ کے بیان میں جدید فلاسفہ مغرب وہی کہتے ہیں، جو یونانیوں نے کہا تھا کہ آفتاب اپنی شعاع ترزمینوں پر، یا سطح سمندر پر ڈال کر ان کو اس درجہ رقیق کر دیتا ہے کہ وہ اس ہوا سے بھی ہلکے ہو جاتے ہیں، جو زمین اور سمندر پر چھائی ہوئی ہے اور چڑھ کر طبقہ زمہریرہ تک پہنچتے ہیں اور وہیں بادل بارش اولے بن جاتے ہیں، حالانکہ کشش و جذب کی صورت میں یہ بالکل ناممکن ہے،

کیونکہ یہ کھلا ہوا سوال ہوتا ہے کہ زمین تو ان بخارات سے بہت قریب ہے، وہ ان کو کیوں نہیں داب لیتی، علاوہ اس کے آفتاب جب سمندر کے پانی کو خود اپنی کشش سے اٹھا لیتا ہے، تو بخارات کو اوپر کھینچ لینے، کرنوں سے کام لینے کی کیا ضرورت ہے، حالانکہ جدید فلاسفہ لکھتے ہیں کہ:

”بخارات کو آفتاب بذریعہ شعاع کے اپنی طرف کھینچتا ہے۔“

خیر ہمیں اس سے بحث نہیں، لیکن یہ سوال ضرور ہے کہ انخزات کو زمین کیوں نہیں دیوچے رہتی ہے، آفتاب اتنی دور سے اس پر کیوں اثر کرتا ہے....؟

(۱۰)..... زلزلہ کی تحقیق میں بھی مغربی اور مشرقی حکماء بھی کہتے ہیں کہ زمین میں انخزات گھٹ جاتے ہیں اور اوپر نکلنا چاہتے ہیں، چونکہ منفذ نہیں ہوتا، اس لیے ان میں اور زمین میں مزاحمت ہوتی ہے، اس سے زلزلہ پیدا ہوتا ہے، حالانکہ اگر زمین میں جذب کی قوت ہے، تو ان کے نکلنے اور اوپر چڑھنے کے کیا کہنے...؟

(۱۱)..... مقناطیس کی کوئی سل نیچے رکھ دو اور اوپر سے اس پر لوہا گراؤ، وہ اس پر چپک کر رہ جائے گا، اب اگر ڈھیلے اور زمین میں بھی نسبت ہے، تو چاہئے کہ ڈھیلا زمین پر آتے ہی چپک جائے، حالانکہ اچھل پڑتا ہے، جو بجائے قوت جاذبہ ثابت کرنے کے واقعہ کی مثبت ہے۔

(۱۲)..... جذب و کشش کے اصول پر نہروں کا جاری ہونا، دریاؤں کا بہنا، سیلاب کا بڑھنا محال ہے، کیونکہ زمین کا ہر جز پانی کے ہر جز کو اپنی قوت کشش سے کیونکر سرکنے دے سکتی ہے۔

(۱۳)..... کہا جاتا ہے کہ زمین سے خطوط کششی نکل کر آفتاب کو کھینچتے ہیں اور معلوم ہے کہ زمین آفتاب کو نو کروڑ میل سے کھینچتی ہے، اب ہم ایک اس ہاتھ کی چھت زمین سے دو ہاتھ اونچی کر کے دو بانسوں پر بلند کرتے ہیں، اب ظاہر ہے کہ اتنے خطوط کششی جن کو اس چھت نے روک لیا، بجائے آفتاب کے خود اس چھت کو اپنی طرف کھینچیں گے، اس وقت عقل کا مقصد ہونا چاہئے کہ یہ چھت فوراً گر جائے، کیونکہ جو چیز نو کروڑ میل تک اپنا اثر پہنچا سکتی ہے، وہ دو ہاتھ پر اپنی قوت کا مظاہرہ کس شدت کے ساتھ

کرے گی، حالانکہ ایسی چھتیس سالہا سال قائم رہتی ہیں اور زمین کی خطوط شعاعی ان کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتے۔ الا ماشاء اللہ۔

(۱۴)..... تم پڑھ آئے ہو کہ نیوٹن نے اس اشکال سے بچنے کے لیے کہ جذب و کشش کی صورت میں کو آفتاب سے ٹکرانا چاہئے، فلاخن پر قیاس کر کے زمین میں ایک ”تارک مرکز“ قوت کا پتہ چلایا، حالانکہ اس میں بھی وہی ساحت و تنگ نظری ہے، مریخ ایک پھل ہے، جو تلخ ہوتا ہے، اسی پر کوئی اگر انگور کو قیاس کرے، تو کیا یہ قیاس صحیح ہوگا؟

علاوہ اسکے قوت تارکۃ مرکز کا ثبوت زمین کی حرکت پر موقوف ہے اور حرکت زمین خود ایک نظری اور قابل غور مسئلہ ہے، اردو زبان میں اس کے ابطال و استحالہ کے دلائل کثرت سے شائع ہو چکے ہیں، جب تک اس کو ثابت نہ کر لیا جائے، کشش کا مسئلہ طے نہیں پاسکتا۔ میں انشاء اللہ آئندہ نمبر میں اس پر بھی ایک بحث کروں گا۔ ان وفقنی اللہ تعالیٰ

وہو علی کلی شیء قدیر۔

(ماہنامہ الرشید دیوبند)

البدعة و حقيقتها

ایک بیجاہ سالہ انداز و تبلیغ الحمد للہ کم از کم یہ نتیجہ تو دیکھا جاتا ہے کہ عموماً ہندوستان کے مسلمان اس آواز سے نا آشنا نہیں رہے۔ ارباب علم راسخ و معرفتہ صادقہ میں ایسے نفوس تزکیہ بکثرت پیدا ہو گئے ہیں، جو اپنی ہر حرکت و سکون دینی میں اس کا خیال کر لیتے ہیں کہ شریعت میں اس کی اصل موجود ہے، یا نہیں۔

تاہم ایک جماعت ہے، جو ابھی تک دل کو سخت کر کے چاہتی ہے کہ ان کی آوازوں کو پادرو ہونا وے، جب اس کے کسی عمل و فعل پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ بدعت ہے، تو چند مسئلہ مروجہ کے ذریعے سے فضول حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ تمہارا فلاں فعل بدعت ہے کہ قرن مشہور میں اس کی مثال نہیں ملتی، جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ اگر ہر چیز میں قرون اولیٰ کے اصل کی ضرورت ہے، تو مدارس کیوں بدعت نہیں، کتابوں کی تالیف و تصنیف کیوں بدعت نہیں؟ جمع ہو کر ایک خاص شان کے ساتھ حلقہ درس قائم کرنا کیوں بدعت نہیں، مطالع و جرائد کا اجراء کیوں بدعت نہیں کہ ان چیزوں کی بھی اصل تم قرون سابقہ میں کہاں سے لاسکتے ہو؟

اگرچہ اس کے جوابات بہت سے ہیں اور دیے جا چکے ہیں اور دونوں کے باہمی امتیازات کو اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے، ضرورت نہ تھی کہ اسے ہم اس وقت غرناطہ (اندلس) کے ائمہ فن میں ہو گزرے ہیں، ابو اسحاق ابراہیم بن محمد اللخمی الشاطبی جو غرناطہ (اندلس) کے ائمہ فن میں ہو گزرے ہیں، ان کی کتاب ”الاعتصام“ نظر سے گزری، جو حال ہی میں مصر سے چھپ کر آئی ہے، انہوں نے بدعت پر ایک بسیط تبصرہ کر ڈالا اور ان اعتراضات کی بابت تشفی بخش جوابات دیے، خیال ہوا کہ ناظرین ”الرشید“ اگر اس کے تمام مضامین سے واقف نہیں ہو سکتے، تو کم از کم چند صفحات میں اس کا خلاصہ پہنچا دینا چاہئے۔

امام موصوف اپنے عصر کے وحید فاضل و مفسر، یگانہ دہر، فقیہ و محدث، لغت، بیان، معانی، نحو میں ان کا رتبہ مجتہدین فن سے کم نہیں مانا جاتا، نہایت کثیر التالیف و التصنیف

پہن، اصول فقہ میں ان کی کتاب ”موافقات“ جس کا نام ”عنوان التعریف بأصول التحکیم“ ہے، ایک نادر تصنیف خیال کی جاتی ہے، عموماً ان کے بعد علماء نے اس کتاب کی تعریف کی اور فائدہ اٹھایا، یا اس کے علاوہ مجالس افادات ”عنوان الاتفاق فی علم الاشتقاق“ ”اصول الخو“ وغیرہ اور بھی کتابیں مشہور ہیں اور ہر ایک اپنے موضوع میں نہایت جامع اور محققانہ انداز سے لکھی گئی ہیں۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

امام موصوف کو زیادہ تر بدعات، احداث فی الدین سے سخت نفرت تھی، خیال تھا کہ اگر اسی طرح شرعی امور میں ہر ایک مسلمان کو اضافہ، یا نقص کا اختیار دیا جائے گا، تو اسلام کا اصلی چہرہ پھر کسی کو نظر بھی نہیں آسکتا اور بالکل سچ فرماتے تھے، مثلاً: فرض کرو کہ ہندوستان میں اس وقت آٹھ کروڑ مسلمان آباد ہیں، ان کو اجازت دی جائے کہ تم اپنی طرف سے عبادات و معاملات میں دخل دے سکتے ہو... اور ان میں سے ہر سال ایک ایک شخص صرف ایک مسئلہ کا اضافہ کرے۔

بادی النظر میں صرف ایک مسئلہ کے بڑھادینے سے کیا نقصان ہو سکتا ہے، لیکن مجموعہ کے اعتبار سے صرف دو سال کی قلیل مدت میں سولہ کروڑ ہو جائیں، کیا اس انبوہ کے نیچے ”دین ایسر ملتہ سحاء“ کی صورت پھر کسی کو نظر آسکتی ہے؟ پتہ بھی چل سکتا ہے خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو کن احکام کے لیے مکلف کیا تھا، رسول خدا ﷺ نے ہماری فلاح و بہبود کے لیے کن اصولوں کی تعلیم دی تھی؟ کیا اس کے بعد پھر انسان خدائی حکومت سے نکل کر چند اپنے ہی ایسے دماغوں کی زیر ریاست نہیں داخل ہوگا؟ احبار و رہبان کی وہی بیڑیاں جن کو رسول ﷺ کاٹنے آئے تھے، کیا اسی کو پہننے کے لیے ہم اپنے کو مجبور نہ پائیں گے، حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ نکبت انداز وقت مسلمانوں کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ لوگ ان پر اپنے اختراعی قوانین و احکام کو لازم کرتے رہیں اور ان سے بچانے والا کوئی نہ ہو، لیکن یہ خدا کا شکر ہے کہ جہاں بدعت کے سیلاب آئے، دن ابھرتے رہتے ہیں، وہیں ان کے رکنے کے لیے بھی کوئی ہاتھ ہر قرن میں پڑ جاتا ہے، جو اگرچہ نبی نہیں ہوتا کہ نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا، تاہم ”مجدد“ ہوتا ہے اور دین کو ان فتنوں سے محفوظ کر دیتا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ آج اسلام کی چودہویں صدی گزر رہی ہے اور درمیان میں سینکڑوں مفاسد و محدثات کا زور

رہا، مگر پھر بھی کچھ لوگ ہیں جو ہر وقت اسلام حق کے چہرے سے نقاب اٹھا سکتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ محمد ﷺ کن چیزوں کو لائے اور غیروں نے ان میں کیا اضافہ کیا؟ جو ﴿وجعلنا منهم ایماہ یمہدون بأمرنا﴾ (اور بنایا ہم نے ان میں سے امام جو ہدایت کرتا ہے ہمارے حکم سے) کے حقیقی مصداق ہیں۔ فجز اہم اللہ تعالیٰ عنی وعن المسلمین خیراً جزاء بہر حال علامہ شاطبیؒ بھی انہی لوگوں میں سے ہیں، اندلس میں جب بدعات کا چرچہ ہوا، تو اس وقت آپ نے یہ کتاب تصنیف کی۔ بدعت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

بدعت کی لغوی تحقیق

بدعت کا اصل مادہ ”بدع“ ہے۔ ایسی چیز بنانی جس کی مثال پہلے سے موجود نہ ہو، لغت والے اس کا ترجمہ کرتے ہیں، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿بَدِيعَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾
 ”بلانمونہ کے بنانے والا آسمان وزمین کا“۔

اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ اس نے آسمان وزمین کو اس طرح بنایا کہ اس کی مثالیں پہلے سے موجود نہ تھیں، یا مثلاً دوسری آیت:

﴿وَمَا كُنْتَ بِدْعًا مِنَ الرِّسَالِ﴾
 ”اور تو پیغمبروں میں نئی چیز نہیں“۔

میں بھی یہی قصد ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا دعویٰ رسالت ایسا دعویٰ نہیں ہے کہ جس کی نظیر پہلے سے موجود نہ تھی، عرب عموماً اپنے محاورات میں بولتے ہیں:

”ابتدع فلان بدعة“

”فلاں نے بدعت نکالی“

مراد یہ ہوتی ہے کہ فلاں شخص نے ایک ایسا انوکھا راستہ ایجاد کیا، جس پر پہلے کوئی نہیں گزرا، یا مثلاً:

”هذا امر بدیع“

”یہ بڑی بدیع چیز ہے“۔

ایسی خوبصورت چیز کو کہتے ہیں جس کی حسن و خوبی کی مانند اور کسی چیز کا حسن نہ ہو، گویا وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

بدعت کی شرعی تحقیق

انہیں مناسبتوں سے آخر ان کاموں کو جو بالکل انوکھے ہوتے تھے، عرب ”بدعت“ کہنے لگے، گویا وہ ایک چیز ہے کہ اس کی نظیر اس سے پہلے نہیں پائی گئی، شریعت نے لغت سے بدعت کو اسی مناسبت سے اپنی زبان میں منتقل کیا، علماء نے اس شرعی بدعت کی حقیقت یہ منقح کی: ”جس عمل پر کوئی دلیل نہیں ہے، وہ بدعت ہے“۔

یہ اطلاق لغوی استعمال کے اعتبار سے گویا خاص ہے، تاہم مناسبت ظاہر ہے کہ جن اعمال و افعال پر دلیل نہیں ہوگی، وہ یقیناً شرعی نقطہ نظر کے اعتبار سے انوکھی اور نئی ہوگی، ہم اس کی تفصیل کے لیے ذیل کی مباحث پر ناظرین کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

مقدمات

(۱) الہی قانون کو سامنے رکھ کر جب ہم اپنے افعال و اقوال پر نظر ڈالتے ہیں، تو اس کی کل تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱: بعض اقوال و افعال ایسے ہیں جن کا ہمیں حکم و امر کیا گیا ہے، جیسے: نماز، زکوٰۃ وغیرہ۔

۲: بعض ایسے ہیں جن سے منع کیا گیا اور روکا گیا ہے، جیسے: سود خوری، زنا وغیرہ۔
۳: بعض ایسے بھی ہیں جن کے متعلق اختیار و اجازت دی گئی، خواہ ہم کریں، یا نہ کریں، ہمیں ہر طرح کا اختیار حاصل ہے، مثلاً: چار پائی پر سونا، سواری پر بیٹھنا وغیرہ۔

الغرض بندوں کے افعال و اقوال، رفتار و گفتار، ان تین قسموں سے متجاوز نہیں ہو سکتے کہ شارع علیہ السلام یا دنیا والوں کو اس کا پابند بنانا چاہتے ہیں، یا اسے چھڑانا چاہتے ہیں، یا نہ پابند بنانا منظور ہے اور نہ چھڑانا مقصود ہے، بلکہ اس کے کرنے نہ کرنے میں بندہ ماذون و مجاز ہے۔

(۲) دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جن کردار و گفتار کو شارع علیہ السلام دنیا سے مٹانا چاہتے

ہیں، وہ یقیناً یا تو ان کے افعال کے مخالف ہوں گے، جس پر دنیا کو چلانے کا ارادہ کیا گیا ہے اور اگر ان کے مخالف نہیں، تو پھر جن باتوں کا ہمیں اختیار دیا گیا ہے، اس کے مخالف ہو گیا لغرض ممنوع باتوں کو ان دو قسموں کا مخالف ہونا ضروری ہے، اس کو مثال کی صورت میں یوں سمجھو! شارع علیہ السلام اس شخص کو ڈانٹتے ہیں اور جہنم کا خوف دلاتے ہیں، جو نمازیں نہیں پڑھتا، کیوں؟ اس لئے کہ ترکِ صلوٰۃ، اداءِ صلوٰۃ کے منافی ہے، یہ تو اس کی مثال تھی کہ امور ممنوعہ، احکام واجبہ کے مخالف ہوئی ہیں۔ اب اس کی مثال لو کہ امور ممنوعہ، مباح و مازون باتوں کے مخالف ہوتے ہیں اور یہ بہت زیادہ ہیں، مثلاً: عموماً کھانے پینے کی انسان کو اجازت دی گئی، اب شراب نوشی، یا سو د خوری اس کے خلاف ہے۔

(۳) تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب یہ بات محقق ہوگئی کہ امور ممنوعہ مامور یا مباح کے مخالف ہوتے ہیں، تو اب سمجھنا چاہئے کہ ان کی مخالفت کی دو صورتیں ہیں:

۱: ایک تو یہ کہ اس کی مخالفت بالکل کھلی کھلی ہو، مثلاً: ترکِ صلوٰۃ کی منافات اداءِ صلوٰۃ سے بالکل ظاہر ہے۔

۲: دوسری صورت یہ ہے کہ بادی النظر میں وہ مخالف نظر نہیں آتے، لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں مباح و مازون باتوں کے خلاف ایک الگ قانون بنایا جا رہا ہے، مثلاً: اپنی عبادتوں میں خاص خاص کیفیات کا اضافہ کرنا، جیسے: کھڑے ہو کر روزہ رکھنا، یا کسی خاص ہیئت کی تعیین کرنا، مثلاً: شعبان کے مہینے میں ۱۴ یا ۱۵ کی رات کو مسجدوں میں جمع ہو کر جماعت کے ساتھ نمازیں ادا کرنی، یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کسی خاص عبادت کے لیے کسی خاص زمانے کو اپنی طرف سے مقرر کر لینا، مثلاً: رجب کے مہینے میں معراج کے ذکر سے ثواب حاصل کرنے کا طریقہ، یا رسول ﷺ کے ولادت کے دن کو عید بنانی، مردے کے لیے تیسرے، نویں، یا چالیسویں دن کھانا تقسیم کرنا وغیرہ۔

تو چونکہ یہ باتیں عموماً امور مباح و مازونہ کے مخالف ہوتی ہیں، جو یقیناً تشریح اور تقنین کے خلاف ہے، قانون کا مقتضی یہی ہوتا ہے کہ مقتن نے جن لفظوں میں اپنا مدعا ادا کیا ہے، اس سے سرموتجاوز نہ کیا جائے، پس شرعی قانون میں اس کی کیوں مراعات نہیں کی جائے گی، اور یہی میرا مدعا ہے کہ وہ باتیں جو ظاہر تشریح کے مخالف ہیں، وہ بدعت ہے، اس کا

مرکب ”مبتدع“ ہے اور اسی بناء پر اب بدعت کی تعریف یہ ہوئی:

بدعت کی تعریف

دنیا میں ایک مخترع خود تراشیدہ راستہ ہے، جو شرعی راہوں کے مشابہ ہے اور اس پر چلنے والوں کا یہ مقصود ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی عبادت میں اس سے زیادتی ہوتی ہے۔

یہ تعریف ان لوگوں کی ہے جو دنیاوی کاروبار کو جسے ”افعال عادیہ“ کہتے ہیں، بدعت کے اندر داخل نہیں کرتے، مگر جن لوگوں نے ان کو بھی داخل کیا ہے، انہوں نے بدعت کی تعریف یہ کی:

”بدعت دین میں ایک ایسا مخترع ایجاد کردہ راستہ ہے، جو شرعی راستوں کے مشابہ ہو، اس پر چلنے سے وہی باتیں مقصود ہوں، جو شرعی راستوں پر چلنے سے ہوتی ہیں۔“

تعریف کی تنقیح و توضیح

امام شاطبی نے حسب عادت ائمہ سلف دونوں تعریفوں کے ہر ہر لفظ پر الگ الگ بحث کی، میں بجنسہ اس کا ترجمہ کر دیتا ہوں۔

سب سے پہلا قطعہ ہمارا یہ ہے کہ ”دین میں وہ خود تراشیدہ راستہ ہے۔“ میں نے دین کا لفظ اس لئے بڑھایا کہ بدعتی کا مقصود ایسے اعمال و افعال کے ایجاد کرنے سے یہی ہوتا ہے کہ اپنی اس ساخت پر داختہ ایجاد کو شرعی باتوں کے ساتھ گڈ گڈ کر دے، اس لئے گویا وہ دین میں ایک نئی سڑک ہوئی، علاوہ اس کے دنیاوی امور میں نئی نئی ایجادات چونکہ بدعت نہیں ہیں، مثلاً: صناعات و حرف، شہروں کا بسانا وغیرہ، اس لئے ہم نے یہ قید بڑھائی ہے، ورنہ مطلق رکھنے کی صورت میں ان پر یہ تعریف صادق آجاتی۔

بہر کیف اس وقت اسلام میں جتنے رابستے چلنے کے لیے مقرر ہوئے، ان کی دو صورت ہیں: ایک تو وہ ہیں جن کی ابتداء اور اصل ہے اور دوسری وہ ہیں جو جدید تعمیر ہیں اور محض بے اصل ہیں۔

تو چونکہ بدعت یہ آخری صورت تھی، اس لئے خود تراشیدہ اور مخترع کا لفظ بڑھایا گیا، یعنی: سر زمین شریعت میں وہ ایک سڑک ہے، جس کی داغ بیل شارع علیہ السلام نے

نہیں ڈالی.... اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

”تم نے اس مقام پر سمجھ لیا ہوگا کہ اکثر چیزیں جو بادی الراء میں بدعت نظر آتی ہیں، وہ بدعت نہیں، مثلاً: کہا جاتا ہے کہ نحو و صرف، مفردات، لغت، اصول دین، الغرض تمام علوم جو شریعت کے خادم ہیں، یہ سب بدعت ہیں۔“

لیکن یہ سراسر حماقت ہے، اس لئے گویہ موجودہ صورت کے ساتھ اس زمانہ میں موجود نہ تھے، تاہم داغ بیل ان کی اسی زمانہ میں پڑ چکی تھی، مثلاً: قرآن پر اعراب لگانے کا حکم منقول ہے۔

علاوہ اس کے ہمیں قرآن و سنت کے فقہ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ بغیر زبان عربی سیکھے ناممکن ہے اور عربی زبان کا سیکھنا ان علوم پر موقوف ہے، پس ہمیں نحو و صرف وغیرہ سے تعبد مقصود نہیں، بلکہ عبادت کے طریقے سیکھنے کے لیے ہم ان علوم کو پڑھتے ہیں، کیونکہ قرآن و حدیث کے ذریعے سے ہم اپنے مالک و الجلال کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی کو بنا سکتے ہیں۔

اسی طرح سے جن دلائل سے مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان کے کلیات کی تلاش و جستجو یہ اصول فقہ ہے، اس سے بھی مقصود عبادت نہیں، بلکہ مجتہد اس میں اس لئے غور کرتا ہے، تاکہ اپنے مسائل نکالنے کے لیے کسی چیز کو نصب العین بنا لے اور مقلد کے لیے مسائل کی تلاش میں آسانی ہو۔

اسی طرح قرآن و حدیث کے ان دعوؤں کو جن کا تعلق عقائد سے ہے، عقلی طور پر مدلل کرنا، ان کی وضاحت و تفسیر یہ ”علم کلام“ ہے اور ان میں کوئی باتیں نئی نہیں ہیں۔

کیا صحابہؓ کلام مجید اور حدیث سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے؟ اور جبکہ کرتے تھے، تو ہم بھی اگر ایسا کرتے ہیں، تو یہ وہ سڑک کس طرح ہو سکتی ہے، جس کی داغ بیل قرن مشہود میں نہیں پڑی تھی.....؟ کہہ سکتے ہو کہ خیر اگر یہ علوم بدعت نہیں، تو ان کی تالیف و تدوین کے بدعت ہونے میں کیا شبہ ہے؟ لیکن نہیں، تم کو باذنی تامل معلوم ہو سکتا ہے کہ تصنیف کا رواج تو آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ہو چکا تھا، علاوہ اس کے اگر ہم اس سے قطع نظر بھی کر لیں، تو یہاں ایک بات قابل غور یہ ہے کہ بعض چیزوں کے لیے کوئی خاص جزئی تو موجود نہیں ہوتی، لیکن پوری شریعت پر نظر ڈالنے کے بعد اس کی ضرورت ثابت

ہو جاتی ہے۔

بہر کیف کل دو حال ہیں، یا تو تالیف و تصنیف کی اصل شریعت میں موجود ہے، یا نہیں؟ اگر ہے، تو فہو المدعی، اور اگر نہیں ہے، تو میں یقیناً اس کو بدعت کہوں گا اور جب بدعت کہوں گا، تو اس کی ضلالت ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ:

﴿كُلُّ بَدْعَةٍ ضَلَالَةٌ﴾

”ہر بدعت گمراہی ہے۔“ (صحیح مسلم)

لیکن تم کو کیا معلوم کہ کیا ہو گیا؟ لازم آیا کہ قرآن مجید کی کتابت اور اس کو دفن میں تدوین کرنا بھی ضلالت و گمراہی ہو، حالانکہ یہ بالا جماع باطل ہے، تو اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اجماعِ علماء کی شرعی دلیل کے قائم ہو گیا ہو اور ہو سکتا ہے کہ گو کسی جزئی سے یہ ثابت ہو، لیکن جملہ شریعت نے قرآن کی کتابت و تدوین کو ضروری بنا دیا ہے اور جب ایک جزئی کے اندر مصالحِ مرسلہ کے ذریعے سے مسائل ثابت ہو سکتے ہیں اور اسی مصالحِ مرسلہ کے قانون کے اعتبار سے صرف و نحو، علم اصول، فقہ و کلام وغیرہ کو بدعت نہیں کہا چاہئے اور جن لوگوں نے اسے بدعت کہا ہے، تو یہ یا تو اطلاقِ مجازی ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے رمضان کی تراویح کو بدعت کہا، یا یہ ان کی حقا کے اقوال ہیں، جو سنت اور بدعت کے درمیان تمیز دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اس کے بعد تعریف کا لفظ ”شرعی باتوں کے مشابہ ہو“ تھا۔

شرح اس کی یہ ہے کہ صرف ان طریقوں کو شرعی باتوں سے مشابہت ہی مشابہت ہو، ورنہ واقع میں وہ شریعت کے مخالف ہو، مثلاً: روزہ میں شارع علیہ السلام نے کھڑے ہونے اور بیٹھنے دونوں کی اجازت دی ہے، اب اگر کسی نے کھڑے ہونے کا روزہ میں التزام کر لیا، تو یہ بدعت ہے کہ یہ تعیین حدود ہے اور میں بتا چکا ہوں کہ وہ ظاہر شرع کے خلاف ہے، اسی طرح کھانے پینے، اور کپڑوں میں خاص خاص قسم کو اپنے لئے تعیین کرنا اور یہ سمجھنا کہ اس سے عبادت میں مبالغہ پیدا ہوتا ہے، یقیناً بدعت ہے، یا جمع ہو کر ذکر کرنا، یا رسول ﷺ کے ولادت کے دن عید بنانی وغیرہ۔

..... لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اجماع کے ذریعے سے شریعت میں نئے مسائل آ جاتے ہیں، حالانکہ یہ غلط ہے، بلکہ اصل یہ ہے کہ کوئی مسئلہ جزو واحد وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے لیکن وہ ظنی رہتا ہے۔ اجماع کے ذریعے سے اس میں قطعیت آ جاتی ہے۔

الحاصل جس نئے فعل میں ایسے اوصاف ہوں کہ ان کا شرعی افعال کے ساتھ ملنس ہو جانا اغلب ہو، پس اسی کو بدعت کہتے ہیں اور اگر اس کو شرعی امور سے مشابہت نہیں ہوئی (مثلاً: شادیوں میں باجا گا جا، آتش بازی، گشت و شنی وغیرہ کا ہونا بدعت نہیں، بلکہ سفاہت اور تیزی و اسراف ہے، کیونکہ یہ کوئی نہیں سمجھتا ہے کہ ان باتوں سے ثواب ہوتا ہے، یا اس سے خدا کی عبادت میں مبالغہ پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے اس قید سے اس پر بھی تنبیہ مقصود ہے، جو اکثر مبتدعین کے دل میں مستور ہوتی ہے۔

تفصیل یہ ہے کہ جب بدعت کسی بدعت کو تراشتا ہے، تو اس کے تراشنے کی کل تین علتیں ہو سکتی ہیں:

۱: یا اس سے کوئی نفع حاصل کرنا مقصود ہے، جیسا کہ عموماً میلاوے اور قبروں کے مجاوروں کا حال ہے۔ اسی طرح مردوں کے کھانے پر ٹوٹے والوں کا۔

۲: یا کسی ضرر کا ازالہ منظور ہوتا ہے، الٹی سیفی وغیرہ، اور سورۃ الفاتحہ کو الٹ کر پڑھنے کی یہ تاثیر بیان کرنی کہ اس سے میرا دشمن مر جائے گا۔

۳: یا شہرت و جاہ، گویا لوگوں کو سمجھانا کہ دیکھو میں ایسے وسائل تمہیں دیتا ہوں، یہ تمہیں خدا تک جلدی پہنچائے گا اور یہ تمام باتیں بغیر شرعی ڈھال کے ناممکن ہیں، اسی لئے بدعتی اپنی خود ساختہ باتوں کے متعلق ایسی چکنی چڑی باتیں بناتا ہے، گویا کہ قانون تشریح یہی ہے، کم از کم آخری حربہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ فلاں فلاں بزرگ جس کے متعلق مسلمان حسن ظن رکھتے ہیں، ان کی اقتداء ہے، ان لوگوں کی جنسہ وہ حالت ہے، جو کفار اہل مکہ کا حال تھا، جب شرک کے متعلق پوچھا جائے، تو اسے شرعی قانون کے مشابہ کرنے کے لیے کہہ دیتے:

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى﴾

”نہیں پوجتے ہم ان بتوں کو، لیکن اس لئے کہ خدا کے قریب کر دیں۔“

قریش کے معززین نے عرفہ پر وقوف چھوڑ دیا تھا اور محض اس میں اپنی عزت پروری تھی، لیکن کہتے تھے کہ ہم حرم کو چھوڑ کر نہیں جاسکتے، حرم کی حرمت اس کے متقاضی ہے کہ ہم ہر وقت اس پر پڑے رہیں، ورنہ کم از کم حج کے دنوں میں تو ایسا ہی کرنا چاہئے، کعبہ کا طواف ننگے ہو کر کیا کرتے تھے اور وجہ یہ بیان کرتے کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کئے ہیں، ان

میں کیونکر طواف کر سکتے ہیں۔

سب سے آخری جملہ ہمارا یہ ہے: ”جس پر چلنے سے عبادت مقصود ہو“۔

بدعت کی حقیقت ان لفظوں پر تمام ہو جاتی ہے کہ مبتدع دراصل مغالطہ اسی لفظ سے دیتا ہے، قدر مشترک تمام مبتدعین کا یہ ہے کہ ”انسان خدا کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور فلاں فلاں طریقوں سے خدا زیادہ خوش ہوتا ہے اور اس کی قربت زیادہ حاصل ہوتی ہے“ حالانکہ ان احمقوں کو یہ معلوم نہیں کہ جو کچھ شارع علیہ السلام نے فرمادیا، کیا وہ کافی نہ تھے؟ کیا دین کامل نہیں ہو چکا ہے؟ اور کامیابی اس میں یوں ہو جاتی ہے کہ ایک ہی قسم کی عبادت کرتے کرتے لوگ اکتا جاتے ہیں، مبتدع ان کے سامنے نئی چیزیں پیش کرتا ہے، لوگ جدت کی وجہ سے اس کو تھام لیتے ہیں، پھر اس پر یہ مغالطہ بڑھا دیا جاتا ہے کہ ”جس طرح گناہوں میں نئی باتوں کا اضافہ ہو رہا ہے، چاہئے کہ نیکوں میں بھی اسی کے حساب سے زیادتی کی جائے“۔

ایک حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے، حضرت معاذ بن جبلؓ راوی ہیں کہ: ”حضور ﷺ نے فرمایا: قریب ہے کہ کہنے والا کہے گا کہ میں نے لوگوں کو قرآن پڑھایا، لیکن انہوں نے میری پیروی نہ کی، پس اب بہتر ہے کہ کوئی نئی بات نکالی جائے، تاکہ وہ پھر میری اتباع کریں، پس کوئی نئی بات ایجاد کرے گا، پس خبردار! کہ تم اس کے قریب نہ ہونا کہ وہ گمراہی ہے“۔

اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ایسی نئی باتیں جن سے تعبد مقصود نہیں، وہ بدعت نہیں، مثلاً ہاتھ اٹھانے کے ساتھ دھونا، آنا چھانسنے کی چھٹی بنانی وغیرہ۔

یہ شرح بدعت کی پہلی تعریف تھی، رہی دوسری تعریف، تو اس بناء پر افعال عادیہ میں بھی نئی نئی ایجادیں بدعت ہو جائیں گی، جن لوگوں نے یہ مذہب اختیار کیا ہے، ان کی تقریر یہ ہے کہ شریعت دین و دنیا دونوں کو درست کرنے کے لیے آئی ہے، پس جس نے دنیاوی امور میں ایجاد کیا، گویا وہ شریعت کو اپنا خیر خواہ نہیں سمجھتا، اگر دین میں اختراع کرتا ہے، تو گویا وہ آخرت کی فلاح کے طریقے بیان کرنے میں شریعت کو ناقص سمجھتا ہے۔

مختصر سوانح حالات و خدمات

اس بناء پر مناغل^۲ وغیرہ کا بنانا بھی بدعت ہے اور لازم آتا ہے کہ چھنے ہوئے آنے کی لذت اس کے نزدیک بغیر چھنے ہوئے سے کم ہو، جھوپنڑے کی زندگی اونچی عمارتوں سے زیادہ آرام دہ ہو، پس بدعت کے اصل معنی وہی سمجھنا چاہئے، جو میں نے پہلے بیان کئے۔ واللہ ولی التوفیق

آخر میں ہم اس پر بھی تشبیہ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جیسا کہ بعض افعال و اعمال کا کرنا بدعت ہے، اسی طرح بعض چیزوں کو چھوڑ دینا بھی بدعت ہے، اصطلاح میں اس کو ”بدعت ترکیہ“ کہتے ہیں، اس لئے جن چیزوں کو شریعت نے ہمارے لئے مباح کیا ہے، اگر اس کو کوئی ترک کرتا ہے، تو اس سے پوچھنا چاہئے کہ اس نے یہ کیوں چھوڑا؟ اگر کسی شرعی وجہ سے چھوڑا، مثلاً: کسی نے بھینس کا گوشت کھانا چھوڑ دیا، اس لئے کہ اس سے جسم میں خرابی پیدا ہوتی ہے، یا اسی طرح سے کسی اور چیز کو چھوڑ دیا کہ اس سے عقل میں فتور ہوتا ہے، تو ایسی چیزوں کا چھوڑنا بدعت نہیں، بلکہ اگر علاج کرنا مطلوب شارع ہے، تو ایسا کرنا ضروری ہے، ورنہ مباح ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں، یا احتیاطاً ایسی چیزوں کو کھاتا ہے، جن میں نقصان اور مضر کا احتمال نہیں اور جن میں ہے، اسے چھوڑتا ہے، تو کوئی مضائقہ نہیں۔

اس کی مثال ایسی ہوگی، جو متشابہات کو چھوڑ کر صرف خلال طیب پر قناعت کرتا ہے اور اگر ان اغراض میں سے کوئی غرض نہیں، تو ان چیزوں کے ترک کو تہمید اور تعبد شمار کرتا ہے، یا نہیں، اگر تہمید نہیں سمجھتا، تو پھر ایک عبث کھیل ہوگا اور ہماری تعریف کی بناء پر گویہ بدعت نہیں، بلکہ عادات میں شامل ہوگا، لیکن پھر بھی عاصی ضرور ہے کہ جس کو خدا نے حلال کیا، وہ اسے حرام اعتقاد کرتا ہے اور اگر تہمید سمجھتا ہے (جیسا کہ ہندوستان کے بعض فقراء علاوہ زرد ساریوں کے تمام کپڑے بغیر سلعے، اور چارپائی وغیرہ پر سیٹ کو تعبد و تہمید سمجھ کر چھوڑ بیٹھتے ہیں) پس یہی بدعت ہے اور یہ صریح خدا کی مخالفت ہے کہ خدا نے تو ایک چیز کو حلال قرار دیا تھا، لیکن اس کے خلاف اس نے حرام کر دیا، حالانکہ حکم ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحْرُمُوا طَيِّبَاتِ مَا حَلَّ اللَّهُ لَكُمْ

وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾

”اے ایمان والو! ان پاک چیزوں کو جن کو خدا نے تمہارے لئے حلال کیا ہے، حرام مت کرو اور خدا سے نہ بڑھو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔“

بعض صحابہ نے اردہ کیا تھا کہ مطلقاً دن کو نہ کھائیں اور بعضوں نے عورتوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھالی تھی اور بعضوں نے اپنے آپ کو ”نہسی“ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے اس سے منع کیا، پس جو شخص بغیر کسی عذر شرعی کے خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنے اوپر روکتا ہے، تو وہ سنت سے خارج ہے اور مبتدع اسی کو کہتے ہیں جو اپنے کو دیندار سمجھ کر خلاف سنت عمل کرتا ہو۔

البتہ ایک سوال آخر میں رہ جاتا ہے کہ جن باتوں کے کرنے کا حکم ہمیں دیا گیا ہے، خواہ وہ فرض ہو، یا مستحب، یا سنت، تو کیا اس کا چھوڑنا بھی سنت ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اس نے کیوں مامورات شرعیہ کو ترک کیا، اگر مخلص کلمندی اور کاہلی سے اس نے چھوڑا ہے، تو اگر فرض واجب کا چھوڑنے والا ہے، تو عاصی و گنہگار ہے، اور اگر مستحبات کا تارک ہے، تو آیا ایک دو مستحب و سنت کا تارک ہے، یا تمام مستحبات کا تارک ہے، اگر سنت کا تارک ہے، تو عاصی ہے، ورنہ نہیں اور اگر اس کے چھوڑنے کو دین و دوزخ سمجھتا ہے، جیسا کہ بعضوں کا خیال ہے کہ انسان آخر میں ایسی حد تک پہنچتا ہے کہ اس سے عبادت ساقط ہو جاتی ہے، یہ ترک البتہ بدعت ہے۔

حاصل مباحث

گذشتہ تعریف، یعنی: ”بدعت وہ طریقہ ہے جو شرعی امور کے مشابہ ہو“ بدعت کے تمام اقسام کو شامل ہے، ہم بغرض آسانی ان تمام اقسام کو ایک فہرست اخیر میں دیتے ہیں، جو بدعت کے نیچے داخل ہیں۔

۱: بدعت ترکیہ ”یعنی: وہ چیزیں جن کا ترک بدعت ہے۔“

۲: بدعت اعتقادیہ ”یعنی: اعتقاد میں کوئی نئی بات بنظر تعبد پیدا کرنی، مثلاً: سائنس اور فلسفہ کے مسائل پر یقین کرنا کہ خدا اس سے خوش ہوتا ہے، یا نجات وغیرہ کا اس پر نذر ہے،“

ورنہ یوں تو کوئی اقلیدس کے اشکال پر یقین لانے والے کو کیوں بدعتی کہنے لگا۔

۳: بدعت افعالیہ، یعنی: جو ارج و اعضاء سے بدعت کا ارتکاب۔

۴: بدعت اقوالیہ، یعنی: ایسی باتیں بنانی جن کو شریعت سے کوئی تعلق نہیں، اس کو بظن

تعبد و رضاء خدا بیان کرنا، جیسے قصہ خوانی کو وہ وعظ جس میں ملائکہ رحمت جمع ہوتے ہیں قرار

دینا وغیرہ۔

کرامات اولیاء

ان بلبلوں میں صرف اضطراب ہے، محض بے چینی ہے، جو بحر ہستی کے وسیع سطح پر انسانیت کی کج ٹوپیاں نکالے ہوئے تھر رہے ہیں۔
تم سمجھو کہ میں اسے خوب سمجھ چکا ہوں۔

آغوشِ مادر کے گرداب میں جو ایک ہلکی ہلکی نازک سی چادر اوڑھے ہوئے ننھا سا ”جباب“ روتا ہے، بلبلاتا ہے، تو دیوانے سمجھتے ہیں کہ اسے دودھ کی چھینٹوں کی تلاش ہے، حالانکہ وہ اپنی بھوک مٹانا چاہتا ہے اور یہ بھی نہیں، وہ اس اذیت سے نجات کا طالب ہے، جو ریشِ صفراء نے اس کی آنتوں کو پہنچائی ہے اور یہ بھی نہیں، وہ صرف ایک بھی چیز کو ڈھونڈتا ہے، جسے ہر شخص ڈھونڈتا ہے، مگر کوئی نہیں ڈھونڈتا۔

صبح پو پھنٹے سے پہلے جو کندھے پر ہل کی لکڑیاں رکھ کر بیلوں کے پیچھے پیچھے دہقانی اپنی کشت زاروں کی طرف روا روی کے ساتھ بہتا ہوا جا رہا ہے، سطیجوں نے خیال کیا کہ اسے ہل جوتنے کے شوق نے متحرک کیا ہے، حالانکہ اسے غلے کی ضرورت ہے اور اس کی بھی نہیں، بلکہ اپنے بال بچوں کی شکم پروری کی ضرورت ہے اور اس کی بھی نہیں، بلکہ ان کے بھوک مٹانے کی ضرورت ہے اور اس کی بھی نہیں، بلکہ بھوک کی تکلیف سے نجات پانے کی ضرورت ہے اور یہ بھی نہیں، بلکہ اسے صرف ایک ہی چیز کی ضرورت ہے، جسے ہر شخص ڈھونڈتا ہے، مگر کوئی نہیں ڈھونڈتا۔

ایک وکیل جو شہروں کی تمام امواجِ عیش و سرور سے کنارہ کش ہو کر آٹھ بجے رات سے بارہ بجے تک چراغ کی تپھیروں کے آگے اپنے کو ڈالے ہوئے ہے، آنکھوں کو عینک کی کشتیوں پر سوار کر کے قانونِ نظائر کی سمندروں میں تیرا رہا ہے۔ میں نے کئی احمقوں کو کہتے ہوئے سنا کہ انہوں نے اسے وکیل کی عادت قرار دی، حالانکہ اس کے دل سے پوچھو، مگر میں پوچھ چکا ہوں، وہ اپنے جگر پر پتھر باندھتا ہے۔ کس قدر بد عقلی ہے کہ لوگوں نے اس پر گرویدگی مطالعہ کا اتہام جوڑا، حالانکہ وہ اس کا دشمن ہے، مگر کرتا ہے کہ ایسے روپے کی تمنا

مختصر سوانح حالات و خدمات

ہے اور یہ بھی نہیں، بلکہ اپنی حیثیت اور ابرو کی بقاء کی تمنا ہے اور اس کی بھی نہیں، اسے بھی صرف ایک ہی چیز کی ضرورت ہے، جسے ہر شخص ڈھونڈتا ہے، مگر کوئی نہیں ڈھونڈتا۔

وہ صبح کی نماز کے متصل ہی وظیفہ سے پہلے اپنے مطب کی گودی پر آکر لہراتا ہوا کبھی نجس قاروروں سے آنکھوں کی شعاؤں کو ملوث کرتا، زرد زرد، سوکھے روکھے چمڑوں، چرم، استخوانوں کے گھناؤنے جسموں پر اپنی نرم خوبصورت انگلیوں کو ڈالتا ہے۔ کس نے کہا کہ اس کی طبیعت کا یہ فطری تقاضا ہے، حالانکہ وہ کتنی دفعہ اس بیزاری کا اظہار کر چکا ہے، غلط ہے جس نے ایسا سمجھا، بلکہ اسے فیس کی ضرورت ہے اور اس کی بھی نہیں، بلکہ اپنے اہل و عیال کی پرورش کی ضرورت ہے اور اس کی بھی نہیں، بلکہ اسے بھی صرف ایک ہی چیز کی ضرورت ہے، جسے ہر شخص ڈھونڈتا ہے، مگر کوئی نہیں ڈھونڈتا۔

اور قلمزماں کے ان چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے، حبابوں پر کیا موقوف، اسی سمندر کا سب سے جسیم، طویل و عریض بلبلا جس کے طرہ دستار میں سلطنت و بادشاہت کے موتی نکلے ہوئے ہیں، وہ بھی اپنی مسہریوں کے ابروانی پردوں کے محیط میں اسی لئے کروٹیں بدل بدل کر کشور حدوث میں جنبش پیدا کر رہا ہے، ایک خیال ہے جو کہا گیا کہ اسے ملک کی پر دا ہے۔

نہیں، بلکہ رعایا کی امن و آسائش کی فکر ہے اور یہ بھی نہیں، بلکہ اسے بھی صرف ایک چیز کی ضرورت ہے، جسے ہر شخص ڈھونڈتا ہے، مگر کوئی نہیں ڈھونڈتا۔

اخیر یہ بچوں کی شور و غوغا پر کیا بہتان نہیں کہ اسے شیر مادر کی جتو ہے کہ آنکھوں والوں نے اس میں سکون و اطمینان کی تلاش کا نظارہ کیا ہے، وہ فقط اپنی روح میں چین پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ طمانیت دل کے لئے تڑپ رہا ہے، مگر بیکار تڑپ رہا ہے کہ ماں صرف دودھ دے سکتی ہے، مگر ہضم اس کے اختیار میں نہیں، اس کے پھوڑے پھنسیوں کی آمد کو وہ روک نہیں سکتی۔

کیا دہقانی کاوشوں پر یہ سراسر الزام نہیں کہ وہ غلوں کے مہوسانہ دام ہیں، حالانکہ کسان فقط ان سے فراغیابی کو جذب کرنا چاہتا ہے، اور نہیں کر سکتا کہ بادلوں پر اسے اقتدار

نہیں، ہڈیوں کے دلاس کی زیر حکومت نہیں، ٹھنڈ اور پالے اس کے زیر فرمان نہیں، پھر کیا اس وکیل پر یہ ایک گستاخانہ جملہ نہیں کہ وہ شگون، دُختنانہ کے چند ذلیل سکوں کے لیے با برود پوزیشن کے لیے وقف مطالعہ و محو کتابت ہے، حالانکہ جسم پر نہیں، اس کے دل پر نظر ڈالو کہ احباب و اقران، ہم چشم معاصرین کے سنگھائے تحقیر و ملامت کے خوف سے وہ کانپ رہا ہے، آہ! کہ وہ مسکین وکیل اس کی لرزش کو تھا مننا چاہتا ہے، مگر نہیں تمام سکتا کہ موکلوں کے دل اس کی انگلیوں کے درمیان نہیں، ججوں اور مجسٹریٹوں کے قلم اس کے قبضے میں نہیں اور نہ صرف یہی، بلکہ اپنے دماغ پر بھی بھروسہ نہیں، زبان پر بھی اعتبار نہیں۔

پھر کیا اسی طرح اس غریب طبیب کے شریف پیشہ پر یہ ایک کور بختانہ سہمانہ چوٹ نہیں، نہ کہ قارورہ بیتی نبض شناسی کی علہ، حُرف عطار خانے کی فروغ دہی ہے، حالانکہ اس کی گھر میں جا کر اندازہ لگاؤ کہ کس طرح اس کے بچے اور بیوی نے اس کے دل کو تر دو دو انکار کے تیروں سے چھلنی کر دیا ہے، وہ صرف ان پر جمیعت خاطر کا مرہم لگانا چاہتا ہے، مگر نہیں لگا سکتا کہ اس کے حافظہ میں فقط دواؤں کی تاثیرات بند ہیں، پر صحت کی کجی اس کے پا س نہیں اور ہو بھی، تو وہ اپنے ہم پیشوں کو اپنے شہر میں آنے سے نہیں روک سکتا۔

اور جبکہ ایسا ہے تو کیا بادشاہوں کی فکر ہائے نیم شمی پر یہ ناقابل عفو الزام نہیں کہ اس کی تمام تڑپ و بے چینی مٹی کے چند تودوں کی نگہانی کے ساتھ وابستہ کی جاتی ہے، حالانکہ تم اس کی ممالک محروسہ کی چار دیواریوں کی روزنوں میں جھانک کر دیکھو کہ ہم عصر سلطنتوں کی خونخوار و غاصب آنکھوں نے اس کے اقلیم دل میں ہلچل ڈال رکھی ہے، وہ صرف اس خطرہ سے مطمئن ہونا چاہتا ہے، مگر نہیں ہو سکتا کہ دست بازو کی قوتوں کی وہ خالق نہیں، زمین کی روئیدگی اس کی مطیع نہیں۔ بالفرض ہوں بھی، تو قسمت کی باگ تو اس کی پنہ اقدار میں نہیں۔

حبابستان امکانی کا یہی عبرت انگیز اضطراب پاش تماشا تھا، جس کی نہ ختم ہونے والی رستخیزیوں پر ان ”سعیم لشتی“ کی قدوسی آواز نے متنبہ کی۔

پھر کچھ لوگ تھے، جنہوں نے اس کے بعد وہ سب کچھ سمجھ لیا، جس کے بعد فنا آباد کی کوئی چیز کچھ نہیں سمجھی جاتی اور یکا یک ایک غیبی آواز

﴿ففرروا الى الله انى لكم منه نذير مهين﴾

”بھاگو طرف اللہ کہ میں اس سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔“

کی آئی، جس کے بعد ان کے بستر سے بندھ گئے، اسباب لد گئے، چلنے والے بھاگے گرتے پڑتے، اٹھتے بیٹھے، گاؤں اور قصبوں کو چھوڑتے ہوئے، بڑے بڑے شہروں کو پاس کرتے ہوئے، ہانپتے کانپتے آخر وہ ایک بڑی سرائے میں جا کر اتر گئے، جس کے دروازہ کے طاق پر کندہ تھا۔

﴿الابد کر الله تطمنن القلوب﴾

”خدا کی یاد سے دل کو چین ملتا ہے۔“

انہیں سیدھے سادے، اجنبی لوگوں کا نام اولیاء اللہ ہے، جو ہنگامہ ہستی سے دور ہو کر جسمانی نہیں، بلکہ روحانی سفر کرنے میں مصروف ہیں، بے اطمینانی سے بھاگے تھے، مگر جہاں جا کر طمانیتہ ملتی ہے، وہاں پھر کچھ نہیں ملتا، انسانوں کی آبادیوں کا پھر وہاں پتہ بھی نہیں چلتا۔ اگر ملتا ہے، تو صرف خدا اور ایک خدا جس کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا، آخر وہیں کمر کھول دیتے ہیں اور جو نظر آتا ہے، اس کے مہمان بن جاتے ہیں۔

اور جبکہ انسانوں کے یہاں کوئی مہمان آتا ہے، تو باوجودیکہ ان میں غریب بھی ہیں، بخت دل بھی ہیں، سبھی کچھ ہیں، لیکن خدا نے حکم دیا کہ ان کی اکرام و تعظیم کرو، انہیں آرام پہنچاؤ، تو پھر وہ جو غریب نہیں، ملک ہے، جو بخیل نہیں، کریم ہے، جو سخت نہیں، رؤف ہے، پھر کس طرح ممکن تھا کہ اس کی سرائے میں ٹھہرنے والے مہمانوں کی تکریم نہیں کی جاتی، یقیناً کی گئی اور آئے دن ایسے مسافروں کی ہمیشہ کی جاتی ہے اور اسی کا نام ”کرامت“ ہے، گویا خدا اپنے مہمانوں کو ان چیزوں سے سنوارتا اور ان کی تکریم کرتا ہے، جسے ہم تم ”کر امت“ کہتے ہیں۔

حضرت شیخ محی الدین عربی قدس سرہ کی نزدیک کرامت کی بھی تعریف ہے اور یہی

وجہ تسمیہ بھی ہے، اس کے بعد ارقام فرماتے ہیں کہ:

ہمارے نزدیک کرامت کی دو قسمیں ہیں: ۱- حسیہ ۲- معنویہ

صوفی کے وہ تصرفات جو دوسروں کو محسوس ہوتے ہیں، یعنی اپنے اندر نہیں، بلکہ اپنی

باہر کی ہستیوں پر جو اثر ڈالتا ہے، کبھی دلوں کے خطرات بتا دیتا ہے، کبھی وہ ہوا پڑاڑتا ہے، کبھی پانی پر چلنا ہے، کبھی بڑی مسافت کو چند دنوں میں طے کر لیتا ہے، لوگوں کی نگاہوں پر پردہ ڈال کر اپنے کو غائب کر لیتا ہے، بلکہ اسی طرح وہ بھی جس کی دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے، میں ان چیزوں کو ”کراماتِ حسیہ“ قرار دیتا ہوں۔

اور صوفی کے وہ تصرفات جو خود اپنے اندر کرتا ہے، مثلاً: وہ شریعت کی فرائض و سنن سے گذر کر آداب کی رعایت و نگہداشت کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں، اس میں اچھی اخلاق، عمدہ خصائل پیدا ہو جائیں، وہ ہر ایک قسم کی بری باتوں سے پرہیز کرنے پر مجبور ہو، وہ ہر حکم شرعی کو عین اس وقت ادا کرنے کے لیے اپنے کو تیار کر سکتا ہو، جو خاص اس کا وقت ہے، نیکوں کے گزرنے میں ہمیشہ سبقت کرنے کا عادی ہو گیا ہو۔

وہ اپنے دل سے ہر کسی کے کینے کو نکال پھینک سکتا ہو، حسد، یا کسی کی جانب سے برے خیالات اولاً اس میں آتے ہی نہیں اور آئیں تو اس کے ازالہ کی قوت اس میں موجود ہو۔

الغرض سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ دل سے تمام بری صفات چن چن کر الگ ہو گئے ہوں، خدا کے حقوق، یا دوسروں کے حقوق جو اس کے ذمہ عائد ہوتے ہوں، ان کی ادا کرنے میں اسے دقت محسوس نہ ہوتی ہو، وہ اپنے دل کو ہر وقت ٹٹولتا رہے کہ اس میں خدا کی جانب سے کیا کیا آثار و دیعت کئے گئے ہیں، اخیر میں یہ کہ اس کی جو سانس نکلتی ہو، اس وقت بھی وہ اپنے مالک کے آگے ادب کے ساتھ اپنے کو حاضر سمجھے اور جب سانس اندر آئے، تو اس وقت بھی حضور کی خلعت اس کے دل پر موجود ہو۔

میں اسے کراماتِ معنویہ سمجھتا ہوں، جو عوام کے نزدیک اگرچہ کچھ نہیں ہیں، لیکن خواص سے پوچھو کہ سب کچھ یہی ہیں۔ میں اسکا منکر نہیں کہ حسی کرامات کرامات نہیں اور وہ خدا کی سرانے میں شہر نے والی مہمانوں کی تکریم کو نہیں بتاتی؟

نہیں میں اسے کرامت مانتا ہوں، لیکن حسرت ہوتی ہے، جب کہ جوگیوں، بازگیروں کو بھی ان اعمال پر قادر دیکھتا ہوں، بے شک سب کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے کہ صوفیاء وہ چیزیں سب ان کی مہمان نوازی کی صادر ہوتی ہیں اور جوگیوں وغیرہ سے اس لیے کہ نفسانی طاقتوں کی پرورش کے بعد انسان ایسے اعمال و افعال بخوبی انجام دے سکتا

مختصر سوانح حالات و خدمات

ہے، مگر پھر بھی مجھے ان کرامتوں کے متعلق ہمیشہ ایک دغدغہ لگا رہتا ہے کہ بالفرض جن تصریفات کا ظہور ہم سے ہوا، وہ خداوند تعالیٰ کے اکرام کے نتائج ہوں۔

تاہم دل کی باتوں کا بتا دینا، یا ہوا میں اڑنا وغیرہ یہ کوئی نہ سنت ہیں اور نہ فرس، نہ پھر ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ ہمارے تمام مجاہدات اور صعوبات سلوک کا اسے بدلہ قرار دیں اور محاسبہ کر کے کہیں ہمیں خالی داماں نہ بنا دیا جائے، بخلاف کرامات معنویہ کے کہ اس میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کو استدراج و شعبدہ وغیرہ سے کوئی اشتباہ نہیں، یہ ممکن ہے کہ ایک جوگی ہو افرائے بھرتا ہو اتیرتا پھرے، لیکن یہ مشکل ہے کہ وہ اپنے دل سے کینہ و بغض کو نکال کر پھینک دے۔ یہ بہت آسان ہے کہ کوئی آدمی دریا پر پیادہ پاروانہ، ہو لیکن یہ بہت مشکل ہے کہ وہ پانچوں وقت کی نماز مع طہارت جسم و جامہ اور حضور قلب روزانہ ادا کرنے پر قادر ہو۔

اور یہ بالکل ظاہر ہے، اس لیے کہ استدراج میں خداوند تعالیٰ محض شریروں کی رسی دراز کرتا ہے، انہیں ڈھیل دیتا ہے حالانکہ وہ اس کے لئے شریک کرتے ہیں، وہ قبروں پر جا کر خدا سے نہیں، بلکہ خدا کی مخلوق سے براہ راست حاجت طلب کرتے ہیں، پھر بھی وہ بسا اوقات دل کے خطرات بتا دیتے ہیں، اکثر موقعوں پر ان کی دعائیں پوری ہو جاتیں ہیں۔

اس صورت میں ان خرق عادات کو اگر استدراج نہ کہا جائے، تو اور کیا کہا جائے...؟ لیکن ایک شخص ہے جس کا دل بغض و کینہ سے پاک ہو گیا ہے، وہ نمازوں کا تمام شرائط کے ساتھ پابند ہے۔ اس میں عمدہ اخلاق پیدا ہو گئے، تو یہ چیزیں کیونکر استدراج کا آلہ بن سکتی ہیں کہ یہ خدا کے مقرر کردہ حدود ہیں اور اسی کے بتائے ہوئے راستے ہیں، پھر ناممکن ہے کہ ان راستوں پر خداوند تعالیٰ ہی کسی کو استدراج و تمہیل کے اندر مبتلا فرمائے، بخلاف کرامات حسیہ کے کہ وہ خداوند تعالیٰ کے مقرر فرمودہ راستے نہیں ہیں، پس جو شخص اس پر چل رہا ہے، وہ خطرات و مہالک سے کیونکر مامون رہ سکتا ہے۔ الغرض کرامات معنویہ ہی وہ چیزیں ہیں کہ جس پر انسان بے خوف و خطر چل سکتا ہے۔ اس کو اس راہ میں بجز ایک چیز کے، یعنی غرور تکبر کے اور کسی چیز کا ڈر نہیں، لیکن اگر علم پاس ہے، تو فوراً وہ علم تنبیہ کرے گا کہ بندہ کچھ نہیں کر سکتا، جو کچھ ہے، خدا کی جانب سے ہے اور اسی مقام سے تکبر کی

دیوار بھی گر سکتی ہے۔

بلکہ میرا خیال تو ایسا ہے کہ حتی الوسع کراماتِ حسیہ کا صدور نہیں ہونا چاہئے اور کبھی اتفاق سے سرزد ہو گئے، تو خداوند تعالیٰ کی طرف الحاج کے ساتھ رجوع کرنا چاہئے اور دعا کرنی چاہئے کہ عوام کے نزدیک اس کرامت کا کوئی ظاہری اور مادی سبب نکل آئے، تاکہ میں استدارج، یا اس خطرہ سے کہ میری عبادتوں کا یہی تو بدلہ نہیں مامون و مصون ہو جاؤں۔ اور میں تمام کراماتِ معنویہ میں سے خاص کر خداوند تعالیٰ کے اس اکرام کو جو اپنے مہمانوں کو علم کی صورت میں دیتا ہے، بہتر سمجھتا ہوں، جس کے بعد انسان پر اپنے مالک کے انعام و احسانات کی تفصیل اس کی صفاتِ کمال کی حقیقت کھل جاتی ہے، وہ آخرت کے واقعات کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے، وہ سمجھ جاتا ہے کہ میں کس لئے پیدا کیا گیا ہوں اور مجھے کس کام کے واسطے بنایا گیا ہے اور یہی علم دراصل سبب بن جاتا ہے ان تمام اصلاحات باطنیہ و ظاہریہ کے لئے، جن کو میں پہلے کراماتِ حسیہ معنویہ قرار دے چکا ہوں۔ وہ شخص جس سے کراماتِ حسیہ سرزد ہوتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے وہ نماز نہیں پڑھتا، روزے نہیں رکھتا، تمام بری باتوں میں مبتلا ہے، وہ خدا کا یقیناً مہمان نہیں کہ وہاں کے مہمانوں کی توقیر سب سے پہلے علم باللہ اور علم بالآخرت سے کی جاتی ہے اور پھر کھولا جاتا ہے کہ اس کی ہستی کی غایت کیا ہے، تو چونکہ یہ مدعی وہاں گیا ہی نہیں اور محض غلط لوگوں میں اپنے کو مسافر مشہور کر رکھا ہے، اس لیے وہ حدودِ شرعیہ پر چل ہی نہیں سکتا، ان کی رعایت ہو نہیں سکتی اور جو اس کی رعایت جس درجہ کرتا ہے یاد رکھو کہ وہ خدا سے اس قدر زیادہ قریب ہے کہ قریب کے موافق علم عطا ہوتا ہے اور علم کے موفق اعمال، اقوال و نیت کی درستگی ہوتی ہے۔

بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ جو طی الارض (یعنی: چند دن میں پوری زمین طے کر لیتا ہے) کرتا ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، بولے کہ کچھ نہیں، اس کا مرتبہ کچھ نہیں، شیطان بھی اس پر قادر ہے اور ایسا کرتا ہے، حالانکہ خدا کے یہاں اس کا کیا مرتبہ ہے؟ پھر کسی نے پوچھا اور جو ہوا میں اڑتا ہے، تو کیا وہ بھی کچھ نہیں، تو فرمایا کہ ہوا پر تو پرندے بھی اڑتے پھرتے ہیں، پھر یہ کیسی بیوقوفی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی تکریم کرتے ہیں اور جس چیز سے تکریم کی جاتی ہے، وہ ایسی چیز ہے کہ کوڑا اور چیل کی بھی

اس میں عزت نہیں، وہ بھی اسے اپنی معمولی عادت قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح جن جن چیزوں کے متعلق جو عام طور پر کرامت مشہور ہیں، لوگوں نے ان سے پوچھا، سبھی کے متعلق اسی قسم کے جواب دیتے رہے اور اخیر میں ہاتھ اٹھا کر فرماتے تھے:

”میرے معبود! ایک قوم ہے جس نے تجھ کو صرف اس لیے ڈھونڈھا کہ انہیں وہ مل جائے، جس کا وہ ذکر کر رہے ہیں، تو تو نے ان کو اسی مشغلہ میں پھنسا دیا اور اسی کے اندر وہ ڈوب گئے، غافل ہو گئے، پس اے پروردگار! اگر مجھے بھی تو کسی چیز کے ساتھ غافل بنانا چاہتا ہے، تو اپنی کسی سراور بھید، یعنی: اپنی صفات و تعلقات کے ذریعے سے غافل بنا۔“

تو دیکھو! ایسے جلیل القدر ولی مسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بھی یہی دعا ہے کہ کرامات حسیہ تو ہم سے سرزد ہی نہ ہوں اور اگر کرامات ہوں بھی، تو معنویہ جس میں ان کو طلب صرف علم کی ہے کہ وہی تمام کرامتوں پر غالب ہے اور سب اسکے ثمرات ہیں۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے اپنے دربار سے جس چیز کے مانگنے کا حکم دیا تھا، وہ بھی یہی تھا:

”وقل رب زدنی علما“.

”کہہ اے محمد! اے پروردگار! میرے علم میں زیادتی فرما۔“

حضرت ابو یزید رضی اللہ تعالیٰ نے بالکل صحیح فرمایا کہ پانی پر چلنا، ہوا میں اڑنا، انسان کے لیے کرامت نہیں، کیونکہ یہاں اکرام کرنے والا خدا ہے، جو اکرام الا کر مین ہے اور جس کی تکریم کی جاتی ہے، وہ انسان مکترم ہے، جو اپنی نوعی فضیلت کے اعتبار سے تمام عالم پر شرف رکھتا ہے، پھر جہاں ایسا مہمان ہو اور ویسا میزبان، تو ایسے موقعہ پر ہوا وغیرہ میں اڑنے کا ذکر کرنا کسی طرح مناسب نہیں، بلکہ دیکھنا یہ چاہئے کہ اس وقت جبکہ مہمانوں میں بھی سب سے اشرف ترین مہمان ہے اور میزبان بھی اکرام الا کر مین ہے، کرامت لینے کی صلاحیت کس چیز میں ہے، ظاہر ہے کہ خداوند عز و اسما کے تمام انعامات و افضال، جو، بخششوں میں سب سے بہترین چیز رحمت ہے کہ اسی رحمت کی بناء پر موجودات اپنی ہستیوں کو برقرار دیکھتے ہیں، وہ ہر ایک چیز کو محیط اور سب کو شامل ہے۔ اب ہم قرآن مجید میں دیکھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ حضرت

خضر علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرماتا ہے:

”اتینا رحمة من عندنا و علمناه من لدنا علما“

”میں نے رحمت اپنے نزدیک سے اس کو دیا اور سکھایا علم اپنے پاس سے“

صفت رحمت کے قرب کو ”عند“ کے لفظ سے تعبیر کیا، جو اقرب اور قریب دونوں کے لیے عام ہے، بخلاف ”لدا“ کے وہ محض اقرب پر بولا جاتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفت رحمت وصف علم پر متفرع ہے اور علم ہی رحمت کا معدن اور سرچشمہ ہے، پس اس موقع پر جہاں خدا میزبان اور انسان مہمان ہوتا ہے، مناسب ہے کہ وہ علم ہی کے ذریعے سے نوازا جائے کہ یہی تمام انعامات میں بہترین انعام ہے، فقط۔ (ماہنامہ القاسم دیوبند)

تعلیمات غزالی کے انقلابی اثرات

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے ”احیاء العلوم“ وغیرہ کی تصنیف سے آخرت طلبی کا جو صور پھنکا تھا اور جس بری طرح عالم اسلامی کو اس کے اندرونی اضمحلال کے خلاف جھنجھوڑا تھا، اس کے کیا اثرات ہوئے؟ مولانا گیلانیؒ نے تاریخ کی روشنی میں ان اثرات کی جستجو کی ہے اور سب سے پہلے ایوانِ خلافت و وزارت پر نگاہ ڈالی ہے کہ یہاں کے نقشے میں بھی امام کی اس چیخ و پکار کے بعد کوئی تغیر نظر آتا ہے، یا نہیں؟

مولانا فرماتے ہیں کہ دیکھو ۴۵۰ھ جو امام کا سن ولادت اور خلیفہ مقتدر باللہ العباسی کا دور خلافت ہے، اس میں شاہانہ کرد فر اور اظہار شان و ثروت کا یہ عالم تھا کہ قسطنطنیہ سے رومیوں کی جو سفارت قیدیوں کے تبادلے اور صلح کی گفتگو کے لیے بغداد آئی تھی، مقتدر باللہ سے ملنے کے لیے جب اس کے ارکان دار الخلافۃ کی طرف روانہ ہوئے تو

پہلے اس حاجب (عرض بیگی) کے محل کے سامنے پہنچے، جس کا نام ”قصر القشوری“ تھا، حاجب کے محل کی شان و شوکت دیکھ کر سرفراہ کچھ اس درجہ مبہوت ہوئے کہ اسی محل کو انہوں نے سمجھا کہ خلیفہ کا مکان ہے، ان کی غلطی فیہی کا ازالہ کیا گیا، وہ آگے بڑھے، سامنے وزیر کا قصر نظر آیا، ان کو پھر یہی خیال ہوا کہ وہ نہیں، تو ضرور یہی خلیفہ کا مستقر ہے، مگر کہا گیا کہ یہ وزیر کا گھر ہے، وہ آگے روانہ ہوئے، ان لوگوں کو

اس طریقے سے دارالخلافہ میں داخل کیا گیا کہ چاروں طرف پہلے وہ گھوم لیں، حالت یہ تھی کہ دارالخلافہ کے اطراف و جوانب اس کے مختلف ابواب اور مقامات پر ۳۸ ہزار پردے پڑے ہوئے تھے، جن میں بارہ ہزار پانچ سو پردے تو خالص مزاکش، دیبا اور حریر کے تھے، درمیان میں جو فرش فروش بچھائے گئے تھے، ان کی تعداد بائیس ہزار تھی، دارالخلافہ کے احاطہ میں (جو خود ایک مستقل دنیا کی حیثیت رکھتا تھا) مختلف مقامات میں جنگلی جانوروں کی قطاریں بکھری ہوئی تھیں، جو لوگوں سے مانوس تھے، مختلف قسم کے درندے (شیر، بھیریا، وغیرہ) بھی زنجیروں میں بندھے ہوئے اپنے اپنے نگہبانوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

سفارت والوں کو پھر اس کوٹھی میں لے جایا گیا، جس کا نام ”دارالشجرہ“ (درخت والا محل) تھا، اس کے احاطہ میں ایک طویل و عریض تالاب تھا، جس میں صاف و شفاف پانی ہر وقت پھلکتا رہتا تھا، تالاب کے وسط میں ایک چبوترے پر ایک درخت تھا، یہ مصنوعی درخت تھا، جس میں بڑی بڑی بارہ ڈالیاں اور ہر ڈالی میں بے شمار شاخیں اور ٹہنیاں تھیں، ان شاخوں پر مختلف قسم کے پرندے اور چڑیاں طلاء اور نقرہ (سونے اور چاندی) سے ڈھال ڈھال کر بنائی گئی تھیں اور یہی حال اس درخت کی شاخوں اور ٹہنیوں کا تھا، یعنی: ان میں بعض سونے سے بنائی گئی تھیں اور بعض چاندی سے۔

”دارالشجرہ“ کے بعد سفیروں کو اس محل میں لوگوں نے پہنچایا، جس کا نام ”الفردوس“ تھا، اس قصر میں فرش فروش اور ظروف و آلات کی جو کثرت تھی، ان کا شمار مشکل ہے، صرف اس کی دہلیزوں پر طلائی کڑیوں سے بنی ہوئی دس ہزار زرہیں لٹک رہی تھی، اس کے بعد آبنوسی جڑاؤ تحت پر سفراء نے مقدر باللہ کو جلوہ افروز پایا، جس پر زریں جھالروں کی کارچوبی محلی مسند پڑی ہوئی تھی، تحت کے دہنی جانب اور بائیں جانب بھی خاص سلیقہ سے مختلف جواہر کے بنے ہوئے جالے کے نو نو عدد لٹکے ہوئے تھے، جن کی جگہ گاہٹ سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں، دن کی روشنی کو بھی ان کی روشنی مات کر رہی تھی۔

انقلاب

لیکن اسی مسند خلافت پر امام غزالیؒ کی وفات کے پچیسویں سال اہل مقتضی باللہ کا لقب اختیار کر کے جو شخص آتا ہے، اس کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ اس نے آتے ہی دار الخلافۃ کا نقشہ یوں بدل دیا کہ:

”دار الخلافۃ بغداد کا اپنے سارے فرش و فرش، خیمہ و خرگاہ، پردے و سرپردے، دو اب چوپائے اور دوسرے جانوروں سے بالکلہ تخلیہ ہو گیا، صرف چار گھوڑے اور دار الخلافۃ میں پانی پہچانے کے لئے کل آٹھ شجر اصطلب میں باقی تھے۔“

”خلفیہ منتخب ہونے سے پہلے اس کا زیادہ وقت دینی مشاغل میں صرف ہوتا تھا، دینی علوم کی کتابیں لکھتا رہتا تھا، یا قرآن کی تلاوت کرتا رہتا تھا، پھر جب خلیفہ منتخب ہوا، تو زہد و عبادت و تقویٰ و طہارت کی خصوصیتوں میں اس کے کسی قسم کی کمی نہ ہوئی، عدل و انصاف کے چمن میں پھر بہار اس کے عہد میں آئی، نیکی کے ابواب پھر کھل پڑے۔“

اسی کے ساتھ ساتھ مقتضی کے زمانہ میں بغداد اور عراق پھر خلیفہ کے قبضہ اقتدار میں واپس ہوا، ورنہ مقتدر باللہ کے زمانہ سے صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ خلیفہ کا صرف نام تھا اور حکومت ان سلاطین اور ملوک کی قائم تھی، جنہوں نے جبراً خلیفہ کو اپنا تابع فرمان بنا لیا تھا۔

مولانا گیلانی فرماتے ہیں: اور بات صرف مقتضی ہی کی حد تک اگر محدود ہوتی، تو استثناء اور شذوذ کے دعوے کی گنجائش بھی پیدا ہو سکتی تھی (مگر) واقعہ یہ ہے کہ امام غزالیؒ کے بعد پے در پے پچاس ساٹھ برس کا زمانہ بغداد کی خلافت پر ایسا گزرا ہے کہ اسی خلافت کی گدی پر بیٹھنے والوں کے پہلو کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان پچھلوں میں غیر معمولی انقلابی رنگ کیسے پیدا ہو گیا تھا، مقتضی کا حال تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں، مقتضی کے بعد اسی کا بیٹا یوسف، مستجد باللہ کے نام سے تخت خلافت پر امام غزالیؒ کی وفات کے ٹھیک پچاس سال بعد متمکن ہوا۔ سیوطی نے تاریخ

الخلقاء میں لکھا ہے:

”مستجد عدل اور نرم مزاجی کی خصوصیتوں سے موصوف تھا، سارے عراق سے ناجائز محصولات کو اس نے اٹھایا دیا تھا۔“

اور ابن اثیر کا فیصلہ تو اسی مستجد کے متعلق یہ ہے کہ:

”كان احسن الخلقاء سيرة مع الرعية“

(ص: ۱۳۵، ج: ۱۱)

”عباسی خلفاء میں رعیت کے ساتھ بہترین سلوک کرنے میں مستجد بہت اچھا خلیفہ تھا۔“

مستجد کے بعد اس کا بیٹا حسن المستضی باللہ کے نام سے سر پر آئے خلافت ہوا، اس سے بڑھ کر المستضی کے متعلق شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ابن جوزی جیسے بگڑے دل آدی جو دوسروں پر جرح و تنقید کرنے میں تاریخی شہرت کے مالک ہیں، بخاری تک کے راقہ پر نکتہ چینی سے ابن جوزی نہیں چوکتے، مستضی کو انہوں نے خود دیکھا تھا اور بہت قریب سے دیکھا تھا، ان کی مجلس و عظ میں اکثر شریک بھی ہوتا تھا، بہر حال منتظم میں اپنی چشم دید گواہی ابن جوزی ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

”اظہر من العدل والکرم مالم نره فی اعمارنا“

(ص: ۲۵۰، ج: ۴)

”عدل و کرم کا اظہار المستضی نے جس پیمانے پر کیا، ہم لوگوں نے ساری زندگی میں اس کی نظیر نہیں دیکھی۔“

ابن اثیر نے (اسی کا حال لکھتے ہوئے) آخر میں مشہور عربی فقرہ (لکھا ہے)

”فعاش حمیداً و مات سعيداً رضی اللہ عنہ“

(ص: ۱۷۳، ج: ۱۱)

”پس بڑی ہر دل عزیز کی ساتھ اس نے زندگی بھی گزاری اور وفات بھی اسکی سعادت کے حالات کیساتھ ہوئی۔“

ایک عربی شعر بھی ابن اثیر نے مستضی کے ذکر کو ختم کرتے ہوئے درج کیا ہے:

كان ايامه من حسن سيرته . . . موسم الحج والاعیاد والجمع
یعنی: اپنی سیرت و کردار سے مستفی نے ایک ایسا حال پیدا کر دیا تھا کہ اس کی حکومت
کا زمانہ گویا حج، عید اور جمعہ کے دن تھے، یعنی: ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات کی
کیفیت تھی۔

حالانکہ یہی بغداد تھا، ذرا غزالیؒ سے پہلے، بلکہ خود ان کے عہد کے حالات کتابوں
میں پڑھے، عیاروں اور طراروں، لصوص، یعنی: چوروں اور بٹ ماروں کے دھاوے صبح و
شام ہوتے رہتے تھے، دینی اور آئینی زندگی سے گریز کا رجحان روز بروز عباسی خلفاء میں
بڑھتا چلا جا رہا تھا، یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا، جیسا کہ میں نے لکھا بھی ہے، اور لوگوں کو معلوم بھی
ہے کہ ممالک عباسیہ کے مختلف جہات و اقطار میں ملوک و سلاطین کے زور آور بننے میں خلفاء
کی ان ہی کمزوریوں نے امداد بہم پہنچائی تھی۔

کیا یہ انقلاب بے سبب تھا

لیکن اچانک غزالیؒ کے بعد ذمہ داری کا یہ احساس ان ہی خلفاء میں کیسے بیدار
ہو گیا اور امن و امان کا جو قصہ بغداد کی سرزمین کے لیے افسانہ بن چکا تھا، اسی بغداد کو عید کے
دنوں اور شب برات کی ان راتوں میں سانس لینے کا موقع جو ملا، تو لوگوں نے اس انقلاب
کے سبب کو کیوں نہ تلاش کیا؟

سچی بات تو یہ ہے کہ یہی ملوک و سلاطین جن کو عباسی خلفاء کی کمزوریوں نے زور حاصل
کرنے کا موقع عطا کیا تھا، خود ان کی حالت بھی غزالیؒ کے بعد اور غزالیؒ سے پہلے اتنی مختلف
ہو گئی ہے کہ اسی اختلاف کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

ان ملوک و سلاطین کی حالت پہلے سے کس درجہ مختلف ہو گئی تھی، اس کا اندازہ
کرانے کے لیے مولانا نے پچھلی تاریخ کے کچھ ورق الٹے ہیں، جن میں اسراف و
فضول خرچی اور عشرت پسندی کے وہ نمونے نظر آتے ہیں کہ شاید تخیل کی رسائی بھی
ان واقعات سے آگے ہونی مشکل ہے، اس کے مقابلہ میں مولانا کہتے ہیں کہ ذرا
غزالیؒ کے ۲۶ سال بعد دیکھو، اسی بغدادی خلافت کا ایک متوسل سلطان نور الدین

زنگی کے نام سے نظر آتا ہے، طویل و عریض زرخیز علاقے اس کے زیرِ نگین ہیں، شوکت کا یہ عالم ہے کہ حرین اور یمن تک میں اس کا نام خلیفہ کے نام کے ساتھ خطبوں میں پڑھا جاتا ہے، لیکن زندگی کا ڈھنگ یہ ہے کہ:

”شام کے شہر حمص میں تین دوکانیں تھیں (جنہیں نور الدین زنگی نے مال غنیمت کے حصے سے خریدی تھی) ان ہی تینوں دوکانوں کے کرایہ کی آمدنی ملکہ کے لیے نور الدین نے مختص کر دی تھی، سالانہ کل بیس دینار اس ذریعہ سے ملکہ کو ملتے تھے۔“ (ابن اثیر)

ملکہ نے نور الدین سے تنگی کی شکایت کرتے ہوئے اس مشاہرے میں اضافہ چاہا، جواب میں نور الدین نے کہا:

”میرے پاس اسکے سوا کچھ نہیں ہے، باقی میرے قبضہ میں حکومت کی جو آمدنی ہے، سو اس میں مسلمانوں کا میں صرف خزانچی ہوں، میں اس مال میں خیانت کر کے جہنم کی آگ میں تمہارے لئے گھس نہیں سکتا۔“

اس وسیع و عریض سلطنت کے مالک سلطان نے اپنی پوری آخری بیماری اس چھوٹی سی کوٹھری میں گزار دی، جس میں وہ عبادت کے لیے خلوت اختیار کیا کرتا تھا اور بالآخر اس میں جانِ جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

مولانا فرماتے ہیں:

”اور ایک نور الدین ہی کیا، اسی کا شاہزادہ اسماعیل جو باپ کے بعد حلب کا حکمران تھا، کل ۱۹ سال کی عمر میں اس بے چارہ کو تونج کے مرض سے وفات ہوئی، میں تو دنگ ہو کر رہ گیا، جب مورخین کی کتابوں میں یہ واقعہ پڑھا کہ عین ریعان شباب میں حکومت کی باگ، حالانکہ اس کے ہاتھ میں آئی تھی، لیکن وہی شراب جس سے ملوک و سلاطین امراء داعیان تو خیر، سچی بات تو یہ ہے کہ متوکل جیسے متعصب دیندار بادشاہوں تک کی مجلس نشاط جس کے دور سے خالی نہ ہوتی تھی، لیکن شاہزادہ اسماعیل جب تونج میں مبتلا ہوا، تو اطباء نے یہ طبی تجویز پیش کی کہ تھوڑی سی شراب استعمال کیجئے، مرض کا ازالہ ہو جائے گا، اطباء اصرار کر رہے تھے، مگر نوجوان شاہزادہ نے کہا: ”لا افعل حتی اسئل الفقهاء۔“

”میں فقہاء سے جب تک نہ پوچھ لوں گا، یہ نہ کروں گا۔“

آخر فقہاء بلائے گئے، شافعی مذہب کے علماء نے بالاتفاق جواز کا فتویٰ دیا، اس نے حنفی فقہاء کو خطاب کیا، آپ لوگ کیا فرماتے ہیں؟ لکھا ہے کہ صاحب بدائع علامہ ابو بکر کا سانی مشہور حنفی امام نے بھی کہا کہ جس حال میں آپ ہیں، شرعاً شراب کا استعمال آپ کے لیے جائز ہے، مگر اس پوچھ گچھ کے بعد جو بجائے خود اس عہد کے ایک شہزادے اور وہ بھی نوجوان شہزادے سے کچھ کم اےجو بہ خیر نہیں ہے، سننے کی بات یہ ہے کہ شافعی و حنفی علماء کے ان فتوؤں کے باوجود شہزادے نے پوچھا کہ:

”میری موت کی مقررہ مدت اگر آچکی ہے، تو شراب پینے سے کیا وہ ٹل جائے گی؟“

اس کا جواب جو ہو سکتا ہے، وہی دیا گیا، یعنی: قرآن جس چیز کو مؤجل قرار دے چکا ہے، جس میں گھڑی بھر کے لئے بھی تقدیم و تاخیر کا کسی کو اختیار نہیں دیا گیا، بھلا دوا اور علاج سے اس کو کون ٹال سکتا ہے!.....!

شہزادے نے اس جواب کو سن کر کہا کہ حوصلہ کی بلندی، ایمانی، بردوسکینت کی یہ کتنی اثر انگیز و عجیب و غریب مثال ہے، اس نے علماء کو خطاب کرتے ہوئے اپنے دل کی بات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

”ایسی چیز جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، اسے استعمال کر کے خدا کی قسم میں اللہ سے ملاقات نہیں کروں گا۔“ (شذورہ ص: ۲۵۸، ج: ۴)

مؤرخین نے لکھا ہے:

”مات ولم یشر ب رحمہ اللہ“

”شہزادہ اسماعیل مر گیا اور شراب نہیں استعمال کی، خدا کی رحمت ان پر نازل ہو۔“

سلطان صلاح الدین ایوبی پر تعلیمات غزالیہ کا اثر

سلطان نور الدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد صلیبی حروب کی قیادت جس عالمگیر شہرت

لے..... اصل یہ ہے کہ جب تک بدل مل سکتا ہے، امام ابوحنیفہ شرعی محرمات کا دوا استعمال بھی جائز نہیں سمجھتے۔ مگر ان کے سوا امام ائمہ فقہاء حتیٰ کہ خود امام صاحب کے تلامذہ بھی دوا استعمال کی اجازت دیتے ہیں۔ خواہ بدل جسم علاج ممکن ہو یا نہ ہو۔ (منہ)

رکھنے والے بادشاہ صلاح الدین ایوبی کے حصے میں آئی، مولانا فرماتے ہیں کہ ذرا اس کے حالات بھی دیکھئے کہ کس قدر حیرت انگیز ہیں۔

امام غزالی کی وفات کے ستائیس سال بعد امام صلاح الدین کی ولادت ہوئی، ان کی مجاہدانہ زندگی سے تو خیر دنیا واقف ہے، میں اس وقت یہ ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اتنی عظیم سلطنت کے تاجدار ہونے کے باوجود ذاتی حال اس سلطان کا یہ تھا کہ وفات کے بعد ان کے ذاتی خزانے کا جب جائزہ لیا گیا تو:

”ماخروج غیر دینار صوری و اربعین درہمانا صریة“

(ابن کثیر، ۱۲، ص: ۲۸)

ایک صوری اشرفی اور چالیس ناصریہ درہم کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔

ایک طرف (امام غزالی ہی کی صدی کا کچھ پیشتر کا) عضد الدولہ تھا، جو چاہتا تھا کہ روزانہ اس کے خزانے میں دس لاکھ درہم جب تک داخل نہ ہوں گے، دم نہ لے گا، دوسری طرف صلاح الدین کا یہ حال تھا کہ اپنے خزانے میں کچھ نہ چھوڑوں گا..... بقول اب اشیر فاطمیوں کے مصری خزانہ کا صلاح الدین تہا وارث ہوا تھا، مگر ان ہی کی شہادت ہے کہ:

”ففرقه جميعا“ (ج: ۱۲، ص: ۳۸)

یا ایک وہ کیفیت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر چڑھنے والے خطباء اور علماء تک بھی غیر شرعی لباس سے پرہیز نہ کرتے تھے، علماء دین کے خچروں تک کے گلوں میں طلائی طوق پڑے رہتے تھے، یا ایک حال صلاح الدین کا تھا کہ:

”لم یلبس شیئاً مما ینکرہ الشرع“

”ایسی کوئی چیز کبھی نہ پہنی، جسے شریعت نے ناجائز ٹھہرایا ہو۔“

مولانا فرماتے ہیں کہ:

آخر آپ ہی بتائیے کہ بخت و اتفاق کے نیچے آدمی کہاں کہاں تک پناہ ڈھونڈے اور

ان..... ابن اشیر نے تو صرف درہم و دینار کے متعلق لکھا ہے، مورخ ابوالفضل اجاسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ لم یختلف عقداً و اولاداً و ارا۔ سلطان نے کوئی غیر منقولہ جائیداد زمین وغیرہ کی شکل میں چھوڑی نہ کوئی زالی مکان چھوڑا۔

مسئل پیش آنے والے ان واقعات کی جو غزالی کے بعد اسلامی تاریخ میں ملتے ہیں، کیا توجیہ کرے..... یہ جو کچھ ذکر ہوا، مشرقی اسلامی دنیا کے خلفاء و سلاطین کا تھا، لیکن جب مغربی دنیائے اسلام (اندلس اور مغربی افریقہ) کے دینی انقلاب میں، جس کا امام غزالی کے بغداد سے ہزاروں میل کا فاصلہ تھا، لوگوں کا امام غزالی کا ہاتھ نظر آتا ہے (جیسا کہ ابن خلدون نے روایت بیان کی ہے کہ محمد بن تو مرت، جو مغرب میں موحدین کی دینی حکومت کا حقیقی بانی تھا، امام غزالی ہی نے اس کو ایک ملاقات میں ایک طاقتور دین سلطنت کے قیام پر آمادہ کیا تھا) اور ہم اس مغربی حکومت کا یہ رنگ دیکھتے ہیں کہ موحدین کا دوسرا بادشاہ، جس کا نام یوسف بن عبدالمومن تھا، ”صحیح بخاری“ اس کو زبانی یاد تھی، جہاد کی حدیثیں خود املا کرتا تھا، ساری زندگی یورپ کے عیسائی سلاطین سے اسلامی علاقوں کو واپس لینے میں اس کی گزری، اس کے بعد اس کا بیٹا یعقوب جانشین ہوا، جس کے متعلق الیافعی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

”شریعت کو پوری طاقت سے اس نے پکڑا تھا، معروف کا حکم دیتا تھا، منکرات کو اس نے روک دیا تھا، اس معاملہ میں بڑا دلیر تھا، کسی جھجک کے بغیر وہ ان امور کو انجام دیتا تھا۔“

مغربی افریقہ کے سوا اندلس پر بھی اس نے دوبارہ اسلامی اقتدار قائم کر دیا تھا، بے تباہ دولت کا مالک تھا، مگر بایں ہمہ بالاتفاق مورخین کا بیان ہے کہ:

”كان يلبس الصوف ويقف للمرأة والضعيف
فياخذلهم حقهم من كل ظالم عنيف“

(الیافعی، ج: ۳، ص: ۴۸۲)

”بال کے بنے ہوئے کپڑے استعمال کرتا (یعنی: کبیل پوش تھا) معمولی عورت اور کسی غریب کمزور کے لئے بھی کھڑا ہوتا اور بڑے سے بڑے ہیکڑی دکھانے والے ظالموں سے حق ولا کر رہتا تھا۔“

(جب مغربی سلاطین تک کے ان حالات میں لوگوں کو امام غزالی کی کارفرمائی نظر آتی ہے) تو آخر میرے پاس اس تاثر کو بے بنیاد ٹھہرانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، جب مشرق کے

ان خلفاء و سلاطین و ملوک کے ان حالات میں مجھے غزالی کی روح کارفرما نظر آتی ہے..... واقعہ یہ ہے کہ غزالی کے بعد کے خلفاء، ملوک و سلاطین کے ان طبقات میں غیر معمولی انقلاب کی جن موجوں کو ہم متلاطم پاتے ہیں، ان کے متعلق اس بات کا ثابت کرنا تو مشکل ہے کہ براہ راست امام کے کارندوں نے ان لوگوں کو متاثر کیا تھا، بلکہ محمد بن تومرت کے ساتھ بھی امام غزالی کے جن تعلقات کا لوگ تاریخوں میں تذکرہ جن الفاظ میں کرتے ہیں، ان سے عام تاریخی یقین کا پیدا ہونا بھی دشوار ہے اور ذکر بھی اس واقعہ کا اتنا سرسری طور پر دوسرے واقعات کے ضمن میں کر دیا گیا ہے کہ عوام ہی نہیں، خواص تک کو بھی اس کی خبر نہ پہنچ سکی، اس لئے مولانا فرماتے ہیں کہ میرا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ یہ نتائج عملاً امام کی ارادی کوششوں سے وابستہ تھے، بلکہ:

”کہنا صرف یہ ہے کہ غزالی کے دل سے ایک آواز نکلی تھی، ان کے سامنے یہ قطعاً نہ تھا کہ کس کو سنا رہے ہیں، خلفاء کو، یا سلاطین کو، امراء کو، یا وزراء کو، عوام کو، یا خواص کو، بس وہ صرف سنانا چاہتے تھے اور امید قائم کی ہوگی کہ سننے کی جس میں صلاحیت ہوگی، اپنے اپنے طرف کے مطابق اس کو سنے گا اور فائدہ اٹھائے گا اور یہی واقعہ پیش آیا بھی۔“

خلفاء و سلاطین کے بعد وزراء

آپ کے سامنے اب تک تو ان خلفاء و ملوک ہی کی مثالیں گزری ہیں، جو یکے بعد دیگرے مشرق و مغرب میں غزالی کے بعد نمایاں ہوتے رہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، غزالی کے سامنے کوئی خاص طبقہ نہ تھا، سارے مسلمانوں کے لیے ان کا خطاب عام تھا، پس اب ذرا خلافت و سلطنت کے بلند زینوں سے نیچے اتر کر بھی دیکھئے:

وزیر ابن زبیرہ

یہ اسی خلیفہ مقتضی باللہ کے وزیر ہیں، جس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ امام غزالی کی وفات کے کل ۳۰ سال بعد خلافت عباسیہ کے وزیر اعظم کے عہدے پر سرفراز ہوئے ہیں، نام تو ان کا صحیح تھا، ہمیرہ جو ان کے دادا تھے، ان ہی کی طرف منسوب ہو کر ابن ہمیرہ کے نام سے مشہور

ہوئے، بارگاہ خلافت سے جیسا کہ اس زمانہ میں عام دستور ہو گیا تھا، طویل و عریض القاب ارکان حکومت کے نام کے آگے پیچھے لگائے جاتے تھے، ابن ہبیرہ کو بھی وزیر العالم، العادل، عون الدین، جلال الاسلام، صفی الاسلام، شرف الانام، معز الدولہ، عماد الامتہ، مصطفیٰ الخلفائے، تاج الملوک و السلاطین، صدر الشرق و المغرب، سید الوزراء، کالمبا چوڑا خطاب ملا تھا، مگر جو حالات کتابوں میں ان کے ملتے ہیں، ان کو دیکھ کر یہی خیال گزرتا ہے کہ خود ابن ہبیرہ کے قلب میں نہ ان الفاظ کا کوئی وزن تھا اور نہ اس عہدے پر سرفرازی کے بعد آدمی جس جا ہی و مالی اقتدار کا مالک ہو جاتا تھا، اس اقتدار کی وقعت و قیمت بھی ان کی نگاہ میں پریشہ سے زیادہ نہ تھی۔ ابن جوزی، ابن ہبیرہ کے صرف دیکھنے والے ہی نہیں، بلکہ ان کے حلقہ درس حدیث میں بیٹھے والوں میں سے ایک ہیں، بڑی تفصیل سے عباسی خلافت کی اس عجیب و غریب شخصیت کا انہوں نے تذکرہ کیا ہے، دو واقعے سننے کے لائق ہیں:

(۱)

صحاح ستہ کی حدیثوں کی شرح میں انتہائی تدقیق و تحقیق سے ”الافصاح“ نامی ایک کتاب خود ابن ہبیرہ نے تصنیف کی تھی، اسی کا درس و وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد ایک دن دے رہے تھے، مالکی مذہب کے ایک فقیہ نے خواہ مخواہ ایک مسئلہ میں الجھنا شروع کیا، علماء کا حلقہ تھا، ہر ایک فقیہ کو سمجھاتا تھا، فن کی معتبر کتابیں لالا کر دکھلائی جا رہی تھیں، مگر فقیہ کا اصرار اپنی بات پر جاری رہا، قدرۃ ابن ہبیرہ کو اس اصرار بے جا پر غصہ آ گیا اور زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکل گیا:

”بھیمة انت، اما تسمع هؤلاء يشهدون والكتب المصنفة وانت تنازع وتفرق المجلس“.

(شذوذ، ج: ۴، ص: ۱۹۳)

”تم نرے جانور ہو، کیا سن رہے ہو یہ تمام لوگ کس بات کی شہادت دے رہے ہیں اور کتابوں سے کیا معلوم ہوتا ہے، مگر تم ہو کہ جھگڑتے ہی جا رہے ہو اور مجلس میں گڑ بڑ پیدا کر رہے ہو“۔

کہنے کو تو ابن ہبیرہ نے اس وقت ان کو جانور کہہ دیا، لیکن اس کے بعد ان کے شریف نفس میں ذمہ داری کا احساس جب بیدار ہوا، تو پھر کس حال میں وہ بتلا ہوئے، یہی سننے کی بات ہے، لکھا ہے کہ اس دن کی مجلس تو ختم ہو گئی، لیکن دوسری مجلس میں جب لوگ جمع ہوئے اور قاری نے قرأت کرنی چاہی، تو ابن ہبیرہ نے اس کو روک دیا اور مالکی فقیہ کی طرف خطاب کر کے کہنا شروع کیا کہ کل آپ کے اصرار بے جانے نے خواخواہ ایک ایسے لفظ کو میری زبان پر جاری کر دیا کہ جب تک آپ اسی لفظ سے مجھ کو مخاطب نہ کر لیں گے، درس شروع نہیں ہو سکتا، آخر آپ کو ہبیمہ (جانور) کہنے کا مجھے کیا حق تھا؟ میں اپنے اندر کوئی ترجیحی درجہ نہیں پاتا، مجلس سنانے میں آگئی، خلافت عباسیہ کا وزیر اعظم الحاج و اصرار کے ساتھ ایک معمولی مولوی کے سامنے قصور کا اعتراف کر کے یہ استدعا کر رہا ہے کہ مجھے ”ہبیمہ“ یعنی: جانور آپ جب تک نہ کہہ لیں گے، میرے دل کو چین نہ ہوگا، بیان کیا گیا ہے کہ اہل مجلس پر رقت طاری ہو گئی، لوگ رونے لگے، مالکی فقیہ بھی حد سے زیادہ شرمندہ تھا، وزیر سے کہہ رہا تھا کہ قصور تو میرا تھا، مجھے معذرت پیش کرنی چاہیے، مگر ابن ہبیرہ چلا چلا کر ”القصاص، القصاص“ (بدلہ، بدلہ) کے لفظ دھراتے چلے جاتے تھے، آخر چند لوگ آگے بڑھے اور عرض کیا کہ ہم لوگوں کی رائے ہے کہ مالکی فقیہ کو آپ مالی مشکل میں کچھ معاوضہ ادا کر دیں، مگر فقیہ کو اس سے بھی انکار تھا، بہت سمجھانے بھجانے پر بے چارہ ۱۰۰ اشرفیوں کے لینے پر آمادہ ہو گیا اور یوں بات رفع دفع ہوئی، طالب علمی کے زمانے میں ایک دن سڑک پر چلے جا رہے تھے، پھٹے حال تھے، ایک سپاہی نے پھل کا ایک ٹکڑا اٹھانے کا حکم دیا اور انکار کرنے پر ایک تھپڑ اس زور سے رسید کیا کہ ابن ہبیرہ کی دہنی آنکھ کی روشنی جاتی رہی، لیکن زندگی بھر اس کا تذکرہ کسی سے نہ کیا، اتفاقاً وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں مجرم قتل وہی شخص گرفتار ہو کر ابن ہبیرہ کے سامنے لایا گیا، انہوں نے خون بہا ادا کر کے مدعیوں کو روانہ کر دیا اور اس کو بھی پچاس اشرفیاں دے کر رخصت کیا، لوگوں نے اس غیر معمولی سلوک کی وجہ پوچھی، تب کہا کہ میری دہنی آنکھ کی روشنی جو غائب ہے، اس کا علم غالباً آپ لوگوں کو نہ ہوگا، قتل کے اسی مجرم کا یہ کروت ہے، پھر قصہ سنایا اور آخر میں بولے کہ بدی کا بدلہ نیکی سے دینا چاہیے، اس پر عمل کرنے کے لیے دل بے چین ہو گیا، اسی لئے اس کے

ساتھ میں نے یہ خصوصی برتاؤ کیا۔

قاضی فاضل

غزالیؒ کے بعد وزراء کے طبقے میں ابن ہبیرہ ان حالات میں تنہا نہیں ہیں، بلکہ کافی تعداد ایسے وزراء کی پائی جاتی ہے۔ کم از کم سلطان صلاح الدین کے وزیر، یا تدبیر قاضی فاضل سے کون ناواقف ہے، ابن عمادؒ نے ”شدوذ“ میں انکے متعلق لکھا ہے:

”كان نزهة أعفياً نظيفاً، قليل اللذات، كثير

الحسنات، دائم التهجد، ملازم القرآن، والاشتغال

بعلوم الادب“۔ (ص: ۲۳۵، ج: ۴)

”بڑے پاک باز، پارسا اور باصفا بزرگ تھے، لذتوں کا حصہ انہی زندگی میں بہت کم تھا، نیکیوں اور بھلائیوں کی ان کے ہاں کثرت تھی، تہجد کے پابند اور قرآن کے ساتھ دائمی وابستگی رکھتے تھے، نیز ادبی علوم میں مشغول رہتے تھے۔“

مالی حالت یہ تھی کہ علاوہ وزارتِ عظمیٰ کی تنخواہ کے ہندوستان اور مغرب میں وسیع پیمانہ پر ان کا تجارتی کاروبار پھیلا ہوا تھا، جاگیریں الگ تھیں، صرف ایک گاؤں ”ترنجہ“ نامی سے ابن عماد نے لکھا ہے کہ بارہ ہزار اشرفی آمدنی ہوتی تھی، مگر اس تمام آمدنی میں قاضی فاضل کا اپنا حصہ کتنا تھا؟

یہی ابن عماد لکھتے ہیں:

”كان لباسه لا يساوي دينارين“

”دواشرنی بھی ان کے لباس کی قیمت نہ ہوتی تھی“۔

سواری جب نکلتی، تو ایک غلام کے سوا کوئی ساتھ نہ ہوتا، بکثرت قبرستان جاتے، جنازوں کے ساتھ چلتے اور مریضوں کے گھر جا کر عیادت کرتے۔

(بشکریہ ”الفرقان“، لکھنؤ، تیسرا انتخاب نمبر)

حضرت حکیم الامت مجدد الملت

مولانا تھانویؒ کی اعتدال پسندی پر عمومی نظر

از حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

افراط و تفریط سے ہٹ کر زندگی کے جس مسئلہ پر اور جس شعبہ میں بھی آپ اعتدالی روش اختیار کریں گے، تو اچانک معلوم ہوگا کہ آپ تنہا رہ گئے اور آپ کے ساتھ کوئی باقی نہ رہا، وجہ اس کی ظاہر ہے کہ اکثریت عموماً نقطہ اعتدال سے ہٹ کر انحرافی زندگی بسر کر رہی ہے، ایسی صورت میں ”اعتدال“ پر قائم رہنے والوں کے ساتھ کوئی نہ ہو، ہاں ہوں، تو تھوڑے بہت آدمی ہوں، یہ تعجب کی بات نہ ہوگی، آج کتنے ہیں جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ سے عقیدت رکھتے ہیں، لیکن مولانا کی طبیعت کا جو رنگ تھا، ذیل کی چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۱) عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مولانا ضوابط و قوانین کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے، جن لوگوں کے مزاج میں سختی ہے، اپنی سختیوں میں ہمیشہ وہ مولانا کے اسی اصول سے تسلی حاصل کرتے ہیں، خیال یہ کر لیا گیا ہے کہ رورعایت کا مولانا کی فطرت میں کوئی عنصر نہ تھا، مگر یہ تو لوگوں نے سمجھا ہے، خود مولانا کا حال یہ تھا کہ آپ کی مجلس مبارک میں کبھی ادھر ادھر کی خبروں کا ذکر لوگ چھیڑ دیتے، بعض سختی پسندوں نے عرض کیا کہ حضرت کی مجلس میں اس قسم کی چیزوں کا تذکرہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا، یہ بھی کہا کہ بعضوں کو اس پر اعتراض بھی ہے کہ مشائخ و صوفیہ کی مجلسوں میں حقائق و معارف کے سوا ادھر ادھر کی حام خبروں کا ذکر واذا کارا چھا نہیں معلوم ہوتا، مولانا نے فرمایا:

..... حضرت مولانا مناظر احسن رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ ”کمالات اشرفیہ“ (جو مولانا محمد عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے جمع کردہ ملفوظات اشرفیہ ہیں) لگی، بس اس ایک کتاب ہی سے چند جواہر چن کر یہ مضمون تحریر فرمایا تھا۔ جو پہلے ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں اور پھر ماہنامہ مستقبل (کراچی) بابت اکتوبر ۱۹۵۴ء میں چھپا تھا، مناسبت کی وجہ سے فوری تحفظ اثر کے طور پر اب شریک کتاب کر دیا گیا ہے۔ (مؤلف)

”کوئی میرے پاس آ کر بات کرے اور میں منہ موڑ لوں، تو اس کو صدمہ نہ دگا۔“

پھر اپنی متعدل فطرت کے فطری مذاق کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

”زائد از کار باتوں کی برائی میرے نزدیک دل شکنی سے کم ہے۔“ (کنائات اثر فیہ ص: ۳۷۱)

یہ آخری الفاظ مولانا تھانوی کے ہو سکتے ہیں؟ میں خیال کرتا ہوں کہ ان کو قریب سے دیکھنے والے بھی تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ جائیں گے، مگر کیا کیجئے کہ یہی واقعہ ہے۔ لوگ اس کا خیال نہیں کرتے کہ خود عدل خلق اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ عمل اس باب میں کیا تھا، معمولی بڑھیا ہاتھ پکڑ کر دیر تک اپنی غیر ضروری باتوں میں مشغول رکھتی ہے اور آپ سنتے رہتے ہیں، کیا صحیح حدیثوں میں یہ نہیں آیا ہے۔ مولانا ہی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ کا بھی مذاق تھا کہ ملنے والے جب تک بیٹھے رہتے، ان سے گفتگو کرتے رہتے، مقصود یہی تھا کہ اگر ایسا نہ کیا جائے، تو بے رخی کا احساس دلوں میں پیدا ہوتا ہے، جو عموماً موجب دل شکنی بن جاتا ہے۔ مجلس نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خصوصیت صحابہ کرام بیان کرتے تھے:

”يضحك مما يضحكون ويتعجب مما يتعجبون“

”لوگ جن باتوں پر ہنستے، آپ ﷺ ان پر ہنستے، جن باتوں پر لوگ تعجب کرتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تعجب فرماتے۔“

دل شکنی کا خیال یہاں تک تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصافحہ کرنے والے کا ہاتھ خود بھی نہیں چھوڑتے تھے، جب تک کہ وہی نہ چھوڑ دیتا، کسی سے رخ نہ پھیرتے تھے، جب تک وہی نہ پھیر لیتا، خود حکیم الامت قدس سرہ اپنا ایک خواب بیان کرتے تھے کہ ملکہ و کٹوریہ جس زمانہ میں زندہ تھی، آپ نے خواب میں اس کو دیکھا، ایک ایسی گاڑی پر جس میں نہ گھوڑے ہیں اور نہ باگ نظر آتی تھی، (موٹر گاڑی کا اس وقت تک ایجاد نہیں ہوئی تھی) بہر حال خواب میں معلوم ہوا کہ مولانا سے کہہ رہی ہیں کہ اسلام ہی حق مذہب مجھے معلوم ہوتا ہے، البتہ ایک شبہ مجھے ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام مذاق لوگوں سے کیوں کرتے تھے، نبوت تو بڑی چیز ہے۔ عام مذہب میں بھی اس کو اچھا نہیں سمجھا جاتا، خواب ہی میں حضرت فرماتے ہیں، میں نے اسے کہا کہ لوگوں کو مانوس بنانا مقصود تھا، ورنہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رعب کی وجہ

سے لوگ کھل کر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دل کی باتیں نہیں کہہ سکتے تھے، بلکہ اس جواب کو سن کر مطمئن ہو گئی، دیکھا آپ نے! مولانا کی نظر کہاں پہنچی....! بیداری میں نہیں، خواب میں بھی دماغ وہیں پہنچا تھا، جہاں اس کو پہنچنا چاہئے۔

(۲) عام طور پر مولانا کے جس مذاق کو لوگوں نے مشہور کیا ہے، اس کے حساب سے آپ ہی بتائیے کہ اس سوال کا جواب، یعنی: ایک ڈاڑھی منڈانے والے کے ساتھ لڑکی کا رشتہ کروں یا نہ کروں؟ ایک صاحب نے یہ لکھتے ہوئے سوال کیا کہ ڈاڑھی والے جو ملتے ہیں، نوڈال روٹی کا ان کے یہاں اطمینان نہیں اور جہاں اس کی تھوڑی بہت امید ہے، وہاں خرابی یہ ہے کہ ڈاڑھی منڈانے والے لڑکے ملتے ہیں، مولانا کے مذاق شناسی کے مدعی خود سوچیں کہ اس کا وہ کیا جواب دیں گے۔ مگر سنئے مولانا نے کیا جواب دیا:

”میرا خیال ہے کہ اس زمانہ میں پوری دینداری داڑھی والوں میں بھی نہیں، پس ایک داڑھی منڈانے کا گناہ کر رہا ہے، دوسرا شہوت پرستی کا گناہ کر رہا ہے، تو نری داڑھی لے کر کیا کریں گے۔“

(کلمات اشرفیہ: ۲۳۹)

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے بڑے نکتہ کی طرف اس میں اشارہ فرمایا ہے، لوگوں نے خاص خاص گناہوں کو پکڑ لیا ہے، گویا گناہ گار ہونے نہ ہونے کا معیار بس صرف وہی ہیں، ان ہی گناہوں میں ایک ڈاڑھی بھی ہے، ایک شخص غیبت کرتا ہے، بد نظر ہے اور عملی طور پر بے احتیاط ہے، لیکن لمبی ڈاڑھی رکھتا ہے، اس پر لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا، ایک بے چارہ ان عیوب سے بری ہے، صرف ڈاڑھی منڈانے کا گناہ کرتا ہے، تو سمجھا جاتا ہے داڑھی والے صاحب سے داڑھی منڈانے والے کو کیا نسبت، حالانکہ جیسے داڑھی منڈانا گناہ ہے، داڑھی والوں کے گناہ اس سے کم نہیں؟ پھر ایک داڑھی پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے؟ مولانا نے صحیح فرمایا ہے کہ داڑھی منڈانے کے سوا اور باتیں لڑکے میں اچھی ہوں، تو اس کو گوارا کر لیا جائے، بلکہ اس برتاؤ سے اغلب ہے داڑھی کا مسئلہ بھی اس کی سمجھ میں آ جائے گا، ورنہ جو طریقہ لوگوں نے داڑھی کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے، میں دیکھتا ہوں کہ منڈانے والوں کی جراتوں کو اس طریقے نے اور بڑھا دیا ہے۔

(۳) مولانا چونکہ خود مولوی تھے، اس لیے مولویوں کا خیال ہوگا کہ انگریزی تعلیم

یافتوں پر ضرور مولویوں کو ترجیح دیتے ہوں گے اور اس میں شک نہیں کہ عربی خواں مولویوں کا مولانا خاص طور پر احترام فرمایا کرتے تھے، مگر ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ انگریزی دانوں میں اور جتنی باتیں بھی ہوں، لیکن: ”ان کی گفتگو میں مزہ آتا ہے، کیوں کہ یہ سمجھ میں آنے سے مان لیتے ہیں۔“

(کمالات اشرفیہ: ۲۳۹)

مولویوں کے اس طریقے کو کہ جو بات منہ سے نکل گئی، اس کی بیچ کئے چلے جاتے ہیں، سخت ناپسند فرماتے تھے، مولوی عبدالحق صاحب کافقرہ ”اڑیل ٹٹو“ اس قسم کے مولویوں کے متعلق نقل فرمایا اور کہا کہ ”جمود و اصرار بری چیز ہے“ پھر حکمت کی بات یہ فرمائی کہ: ”غلطی پر اصرار آدمی کو لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کر دیتا ہے، لوگ اس شخص کی تعریف کرتے ہیں، جو اپنی غلطی مان لیتا ہے۔“

(۴) اناگریزی خواں پچارے بھی تو بہر حال مسلمان ہی ہوتے ہیں، اسلامی گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں، غیر مذہب کے لوگوں سے ملنے جلنے کا طریقہ کیا تھا، اس قصہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے، جب آپ ”اعظم گڑھ“ تشریف لے گئے تھے، راستے میں کسی اسکول کے سامنے سے گذر ہوا، جہاں زیادہ تر ہندو نانا تھے، مولانا نے فرمایا کہ مجھے گذرتا دیکھ کر سارے ہندو اساتذہ اور طلبہ بھی تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے، اس حال کو دیکھ کر مولانا فرماتے ہیں کہ:

”میں وہاں رکا اور ان سب سے ملا، لوگوں سے میں نے مصافحے کئے۔“

پھر خصوصیت کے ساتھ ارشاد ہوا کہ:

”ایک ایک سے ملا، حتیٰ کہ ہندوؤں سے بھی اور مزاج پر سی کی۔“

(کمالات اشرفیہ: ۳۷۷)

آپ کو معلوم ہے کہ مولویوں کا عام قاعدہ ہے کہ ایسے مدرسہ کے سامنے سے جب گذرتے ہیں اور جیسے حضرت کے ساتھ مدرسہ والوں نے برتاؤ کیا تھا، اسی برتاؤ کے ساتھ پیش آتے ہیں، تو عام طور پر مولوی لوگ ان ہندوؤں کی طرف متوجہ ہونا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے ہیں، پھر حضرت نے اس تنگ دل ملا کا ذکر کیا، جس کے وعظ میں ایک غیر مذہب کا آدمی جو شاید ہندو ہی تھا، شریک ہو گیا تھا، مجلس وعظ میں ہندو کو دیکھ کر ملا

صاحب آپ سے باہر ہو گئے، مگر بنے لگے کہ:

” نکالوں اس کا فر مرد و کو“۔ (کمالات اشرفیہ: ۳۲۷)

(۵) بعض خاص نوعیت کے متعلق مشہور کر دیا گیا ہے کہ دیوبند کی طرف منسوب ہونے والے علماء کا ان مسائل میں یہ خیال ہے، حتیٰ کہ بے جانے بھی لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ دیوبندی مولوی اس کا یہ جواب دے گا، مثلاً: یہ سوال کہ ”یا رسول اللہ“ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کہنے کا مسلمانوں میں عام رواج جو پایا جاتا ہے، دیوبندی مولوی اس کو کبھی جائز نہیں کہہ سکتا، مگر سنئے دیوبندیوں کے پیشوا کا کیا خیال تھا، فرمایا کہ: ”شوقاً دالتذاذاً ما ذوئ فیہ“۔ (کمالات اشرفیہ: ۵)

یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کے قلب کا جو اشتیاقی تعلق ہے، اس تعلق کا اظہار ”یا رسول اللہ“ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اگر کوئی کرتا ہو، ”یا رسول اللہ“ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنے میں اس کو لذت ملتی ہو، تو مولانا اس صورت میں ”یا رسول اللہ“ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنے کی اجازت دیتے ہیں، البتہ استغناءً واستغاشیۃً فرمایا کہ جائز نہ ہوگا۔

ایسے سینکڑوں مسائل اور امور ہیں، جن کے متعلق لوگوں کے عام خیالات اور توقعات کے قطعاً مخالف چیزیں مولانا کے کلام میں ملتی ہیں، ضرورت ہے کہ ان چیزوں کو نمایاں کیا جائے، غلط فہمیوں کے ازالہ کے سوا خود مولانا کے عقیدت مندوں کے بہت سے غلط خیالات کی اس سلسلہ سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اصلاح ہو سکتی ہے، میرے پاس اس وقت مولانا کی کتابوں کا ذخیرہ نہیں، صرف ”کمالات اشرفیہ“ سے سرسری طور پر چند چیزوں کا ارتجالاً انتخاب کر لیا گیا ہے، افسوس ہے کہ مولانا کی زندگی کے بہت سے گوشے جب تک زندہ رہے، غایت اخفاء کی وجہ سے پوشیدہ رہے، کچھ شک نہیں کہ اس زمانے میں بھی بعض مصلحین نے اپنی قوموں سے چھوت چھات، نسلی تفریق اور اخلاقی خرابیوں کو ختم کرنے کے لیے بڑی کوششیں اور اس راہ عمل میں بڑے مجاہدے کئے ہیں، مگر اکثر ان لوگوں کے کاموں میں نمود و نمائش کا شائبہ پایا جاتا ہے، ان کی ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے، اس سے بھی گہری بات وہ ہے، جس کی طرف امام غزالیؒ نے لباس کی بحث میں اشارہ کیا ہے کہ نمائش صرف اچھے کپڑوں ہی کے پہننے میں نہیں ہے، بلکہ اس سے بھی بڑی

ریا کاری یہ ہے کہ پھٹے پرانے گودڑ پیوند در پیوند لگے ہوئے کپڑے کے ساتھ اپنے آپ کو اتنا مقید کر لیا جائے کہ جب تک وہ نہ ملے، کپڑے ہی نہیں پہنیں گے، اسی طرح یہ ضد کہ میں رہوں گا، تو فلاں کے پاس اور ٹھہروں گا، تو فلاں جگہ، مجھے اس میں بھی بجائے بڑائی کے کچھ اس قسم کی بات نظر آتی ہے، جو عموماً چھوٹے لوگوں میں پائی جاتی ہے، آخر آپ اس شخص کو کیا کہیں گے، جس نے التزام کر لیا یہ کہ کھاؤں گا، تو جو ہی کی روٹی کھاؤں گا، تو رمہ اور پلاؤ پر اصرار کرنے والوں میں اور اس جو کی روٹی میں اپنی غذا کو منحصر کرنے والوں میں کیا فرق ہے....؟

خیر! دوسروں سے مجھے کیا بحث!! میں تو مولانا کے متعلق عرض کر رہا تھا کہ خود ہی فرماتے تھے: ”کہ میرے بھائی اکبر علی نے مجھ سے ایک دن کہا کہ اب تمہارا شمار ہندوستان کے بڑے آدمیوں میں ہے، اس لیے چاہئے کہ سفر کم از کم سیکنڈ کلاس میں تو کیا کرو۔“ حضرت فرماتے ہیں کہ ان کے اس مشورہ کو سن کر میں نے عرض کیا کہ:

”کیا کروں، میری طبیعت کے خلاف ہے، میں ریل میں گنواروں اور بھنگلی

چماروں کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔“ (کمالات اشرفیہ: ۳۷۵)

اسی طرح آج عام انسانی ہمدردی کا دنیا میں کتنا چرچا ہے، لیکن مولانا نے خود اپنا قصہ جو بیان کیا ہے کہ ”بھاو پور گیا ہوا تھا، گرمی سخت تھی، جیل خانے کے قیدیوں کو پنکھا کھینچنے کے لیے بلایا گیا“ مولانا فرماتے ہیں کہ: ”پہلے یہی بات مجھے ناگوار ہوئی اور چاہا کہ ان کو واپس کر دوں، لیکن اس کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ جیل کی زندگی سے ان بچاروں کو تھوڑی دیر کے لیے اس ذریعے سے تو رہائی مل جاتی ہے، یہ سوچ کر واپس کر دینے کے خیال تو دل سے نکال دیا، انتظار کرتا رہا، جب سب لوگ چلے گئے، تو میں نے ان قیدیوں سے کہا کہ: ”پنکھا بند کر دو، پھر جی چاہے سو رہو، یا بیٹھے رہو، کیونکہ بیگار لینا جائز نہیں ہے۔“

فرمایا کہ کھانا آیا، تو ان قیدیوں کو بھی کھانا دلوا دیا، پھر تو ہر قیدی اس کی

(حیات اشرف، ڈاکٹر غلام محمد)

خواہش کرتا تھا کہ میں ہی بلایا جاؤں۔

آغوش موج کا ایک درتا بندہ یا اسلامی ہند کے

طوفانی عہد میں خدا کا ایک وفادار بندہ

کیا کروں بات نکلتی چلی آرہی ہے، قلم کو روکتا ہوں، لیکن یہ خیال کر کے کہ پھر موقع ملے نہ ملے، جو کچھ اپنے اندر ہے، دوسروں تک پہنچا دیا جائے، جذبات دبانے سے نہیں دبتے اور سلف کے حالات سننے، یا سنانے کا مقصد بھی صرف سننا، یا سنانا نہ ہونا چاہئے کہ ماضی سے مستقبل کی تعمیر میں اگر کچھ مدد مل سکتی ہے، تو پھر یہ کام کی بات ہے، ورنہ بجز ایک دلچسپ داستان کے وہ اور کیا ہے.....؟

ہاں تو عرض کر رہا تھا کہ ہندوستان ہی میں قیام کا ارادہ طے کرتے ہوئے شاہ صاحب نے یقیناً اپنی عمل کا کوئی پروگرام بنایا، اگرچہ بہ تفصیل انہوں نے اپنے دستور العمل کے ضوابط کو کسی جگہ قلم بند نہیں فرمایا، لیکن پھلوں سے بھی درختوں کی نوعیت کا پتہ چلایا گیا ہے، خود جس کا عمل اس کے منصوبے کی فہرست اگر ہمارے سامنے پیش کرتا ہو، تو ہمیں اس کے سمجھنے اور پڑھنے سے انکار نہ کرنا چاہئے۔

بہر حال میں نے جہاں تک غور کیا ہے اور شاہ صاحب کی کتابوں کی کثرت مطالعہ نے جن نتائج تک مجھے پہنچایا ہے، اس کا خلاصہ میرے الفاظ میں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے زمانہ کے مختلف فتنوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے روکنے کھڑے ہو جاتے تھے، گویا ٹھیک ”اطیب النغم“ میں شاہ صاحب کا پہلا شعر ہے:

کان نجوما او مضت فی الغیاب عیون الافانی

اورؤس العقارب

تاریکیوں میں جو ستارے چمک رہے ہیں، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناگوں کی آنکھیں یا بچھوؤں کے سر ہیں

وہ سماں میں ہندوستان میں ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا، انہوں نے اندازہ

کر لیا تھا اور وہ نہ کرتے، تو کون کر سکتا تھا کہ اب۔

بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک

بہ دیر، یا بسویر رہی سہی نام نہاد اسلامی حکومت کے خاتمہ کا وقت قریب آچکا ہے، ان کے سامنے سوال آتا ہوگا کہ آخر ان کروڑوں مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا، معاش کا کفیل تو "خیر رزاق مطلق" ہے، جب تک جو جیتتا ہے، ذوق و اہمیتیں بہر حال اس کا انتظام کسی نہ کسی شکل میں کر ہی دیا کرتا ہے اور یوں قناعت کی راہوں کی چھوڑ کر کوئی سینہ کوبی ہی پر مسر ہو، تو آج انگلستان جو نہ صرف سیاسی قوتوں کے ذریعہ سے دنیا کے آباد ترین پیداواروں کا تنہا خرمن ہے، بلکہ تجارت صنعت حرفت قمار ربا، الغرض مالی انتفاع کے ممکنہ وسائل کی کنجیاں ساری روئے زمین کی اسی کے ہاتھ میں ہیں اور کس انگلستان کا یہ حال ہے، جو اپنے طول و عرض میں بنگال کے کسی متوسط درجہ کے ضلع سے بھی زیادہ بڑا نہیں ہے، آبادی بمشکل صرف چار ساڑھے چار کروڑ تک پہنچتی ہے، لیکن بایں ہمہ ان چار کروڑوں میں تقریباً دو کروڑ لیبرس اور مزدور کے پیٹ پیٹ کے شور سے آسمان تھرا رہا ہے، آئے دن حکومت والوں پر پتھر پھینکے جاتے ہیں، کھڑکیاں توڑی جاتی ہیں اور جو کچھ ہوتا رہتا ہے، روزناموں کے تاروں میں اس کی خبریں چھپتی رہتی ہیں، بھلا جس ملک کو خود آزادی ہی حاصل نہیں ہے، بلکہ بیسیوں ممالک و اقالم کی آزادیاں بھی اسی کی آزادی میں ہضم ہو چکی ہیں، سیانہ بھی، تجارت بھی، صنعت بھی، حرفہ بھی۔۔۔ اور اس کے سوا ہر راہ سے ہر چیز ہر قوم کی اسی انگلستان کے باشندوں میں فنا ہو رہی ہے، جب اس کا یہ حال ہے، تو جن کا یہ خیال ہے کہ صرف غیروں سے آزاد ہو کر، یا نیم آزاد ہو کر ہم بتیں کروڑ انسانوں کے آزاد شکم کو قناعت کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ حرص و آرزو کی بھٹیوں کو بھڑکا کر دبانے میں کامیاب ہوں گے، ان کے پاس اس خیال کو خواب و خیال کے سوا اور کیا کب جاسکتا ہے؟ آج جو حضرات عوام کو اپنے جھنڈوں کے نیچے پیٹ بجا بجا کر بلارہے ہیں اور دنیا کو یہ بتلا اور سمجھا رہے ہیں کہ انسان کے لیے سب سے مقدم اور اہم پیٹ کا مسئلہ ہے اور اعضائے انسانی ہیں، عضو رئیس بس معدہ ہے، ان کو فکر معقول سے کام لینا چاہئے کہ جس راہ پر آدم کی اولاد کو وہ لئے جا رہے ہیں، یہ ترکتان جاری ہے، یا کعبہ پہنچائے گی۔

بہر حال میرے نزدیک شاہ صاحب کے سامنے مسلمانوں کے "شکم" کے غم سے

زیادہ زندگی کے اس ”سوال اہم“ کا غم تھا، جس کے جواب کے بغیر اس دنیا کی ہر زندگی بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہے، یعنی محمد ﷺ نے مسلمانوں کو انجام کی درستی کے لیے ”آغاز“ کا جو دستور دیا تھا، مسلمانوں کو اس پیغام سے جو تعلق ہے، ان فتنوں کی پہلی زد قدرتنا اسی تعلق پر پڑے گی، اب تک تو ہر مسلمان علاوہ موروثی مسلمان ہونے کے ”علی دین ملوکہم“ کے قانون کے تحت بھی مسلمان ہی رہنے میں فائدہ محسوس کرتا تھا، بلکہ غیروں میں بھی کتنے تھے جو اپنے نامسلمان ہونے پر اس زمانہ میں پچھتاتے تھے، لیکن جب ”ملوک“ بدل جائیں گے اور ((افسدوها وجعلو اعزة اهلها اذله و كذالك يفعلون)) (قرآن کی آیت ہے جو ملکہ سب نے کہا تھا کہ: ”سلاطین جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں، تو اس کو بگاڑ دیتے ہیں اور ملک کے عزت والوں کو خوار و ذلیل کر دیتے ہیں) مستمر قاعدہ کی بنیاد پر اس وقت اسلام سے وابستگی کا یہ ”ملوکی“ ذریعہ بھی باقی نہ رہے گا، سوال یہی تھا کہ پھر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے دامن مبارک کے ساتھ بندھے رہنے کی ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا شکل ہوگی؟

دوسری طرف وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان میں مذہب اسلام کی تعلیم و تعلم اور نشر و اشاعت کے جو ذمہ دار ہیں، ان کے دونوں طبقوں (یعنی: مذہب کے ظاہری رسوم و عام عقائد کے محافظ جنہیں عموماً ”علماء“ کہتے ہیں اور مذہب کی واقعی روح اور اس کے باطنی مقاصد کے علم بردار جنہیں ”صوفیہ“ اور ”مشائخ“ کہتے ہیں) دونوں گروہوں کا اس زمانہ تک پہنچتے پہنچتے عجب حال ہو رہا تھا، شاہ صاحبؒ کے جس ”پیغام“ کا ترجمہ پہلے درج کر چکا ہوں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے علما کی کیا حالت تھی کہ ان کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

اشتغلتکم بعلوم الیونانین وبالصرف والنحو والمعانی

تم یونانیوں کے علوم اور صرف و نحو معانی میں الجھے ہوئے ہو

اور یہ عام علماء کا حال تھا، خصوصیت کے ساتھ جنہیں علماء دین کا لقب حاصل تھا اور فلسفہ و منطق سے وہ کارہ تھے، جن کا نام فقہاء تھا، ان کی یہ کیفیت تھی کہ دین کے حقیقی سرچشموں قرآن و حدیث اور ائمہ مجتہدین اور ان کے تلامذہ کے اقوال تک سے بہت دور

آگے نکل کر ہر وہ چیز جو فقہ کے نام سے کسی کتاب میں لکھی ہوئی ہوتی، ان کے نزدیک ”وحی حکم“ اور ”نص قطعی“ کا درجہ حاصل کئے ہوئے تھی، اپنی مشہور کتاب ”انصاف“ میں فقہاء عصر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

فالفقیہ یومئذ هو الثرثار المتشدد شذیہ الذی حفظ
اقوال الفقہاء قویہا وضعیفہا من غیر تمیز و سردھا
بشقسقۃ شذیہ.

اس زمانہ میں فقیہ اس شخص کا نام ہے، جو باتونی ہو، زور زور سے ایک
جڑے کو دوسرے جڑے پر پکلتا ہو، جو فقہاء کے اقوال قوی ہوں، یا
ضعیف سب کو یاد کر کے بغیر اس امتیاز کے ان میں سے کس میں قوت
ہے، کس میں نہیں ہے، وہ انہیں اپنے جڑوں کے زور سے چلتا کرتا
رہے۔

اسی گروہ کے متعلق دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ان کی بے تمیزیوں کا یہ حال ہے کہ خود امام
ابوحنیفہؒ ان کے تلامذہ اور بعد کے علماء کے اقوال تک میں فرق نہیں کر سکتے۔

ویزعم ان جمیع ما یوجد فی ہذہ الشروح الطویلۃ
و کتب الفتاری الضخمۃ فہو قول ابی حنیفۃ
وصاحبیہ ولا یفرق بین القول المخرج بین ماہو
قوال فی الحقیقۃ ولا یحصل معنی قولہم علی
تخریج الکرخی کذا و علی تخریج الطحاوی کذا
ولا یمیز باین قولہم جواب المسئلۃ علی قول ابی
حنیفۃ کذا و علی اصل ابی حنیفۃ کذا.

(یعنی: اس زمانے کے فقیہوں کا) خیال یہ تھا کہ طویل حجتیں شرحوں
اور فتاویٰ کی کتابوں میں جو مسائل پائے جاتے ہیں، یہ سارے کے
سارے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کے ہیں، (یہ مسکین فقیہ) اس
کی تمیز نہیں رکھتا کہ جو باتیں ائمہ کے اصول کی بنیاد پر ان کی طرف منسوب

کی گئی ہیں، ان میں اور جو واقعی میں ان کے اقوال ہیں، ان میں کیا فرق ہے؟ وہ بیچارہ فقہ کی یہ اصطلاح بھی نہیں سمجھتا، جو لکھتے ہیں کہ فلاں بات کرنی کی تخریج پر مبنی ہے، یا طحاوی کی تخریج سے اس کا تعلق ہے، اسی طرح یہ قول کہ ابوحنیفہؒ کے قول پر مسئلہ کا جواب یہ ہے اور ان کی اصل پر مسئلہ کا جواب یہ ہے، ان دونوں میں ان کو کوئی تمیز نہیں ہوتی۔

اس قسم کی واقعی تنقیدوں سے ان کی کتابیں معمور ہیں، ماسوا اس کے اسی طبقہ میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو:

نهضو العلم تو صلاالى العز و درك الجاه
فاصبح الفقهاء بعد ما كانوا مطلوبين طالبين، وبعد ان
كانوا اعزّه بالاعراض عن السلاطين اذلة بالاقبال
عليهم.

طلب علم کے لیے اس لئے آمادہ ہوئے، تاکہ علم کو اپنی عزت اور جاہ کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنائیں، نتیجہ اس کے بعد ہوا کہ فقہاء جو پہلے عوام کے مطلوب تھے، اب یہی عوام کے طالب ہو گئے اور سلاطین اور بادشاہوں کے دربار سے الگ رہنے کی وجہ سے جو معزز شمار کئے جاتے ہیں، اب بادشاہوں کے آستانوں پر وہ جھک کر ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔

دین کے ان حاشیہ برداروں کو شاہ صاحب دیکھ رہے تھے اور ان کا سینہ شق ہوا جاتا تھا، ”ملوکی“ ربط کے ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کو ان کے صحیح دین پر باقی رکھنے کی ایسوں سے کیا توقع ہو سکتی تھی، پھر کچھ ہی دن پیشتر ان ہی دنیا طلب علما کے ہاتھوں اکبر کے دربار میں اسلام کا جو ہنجار ہو چکا تھا، اس کا نقشہ بھی شاہ صاحب کے پیش نظر تھا۔

دوسری طرف صوفیہ اور مشائخ کی جو کیفیت تھی، شاہ صاحب کے درد مند دل کے لیے صرف اذیت اور دکھ ہی بنی ہوئی تھی، کیونکہ علماء سے زیادہ غریب مسلمانوں پر اس زمانہ میں خصوصاً ہندوستان میں ان ہی کا اثر غالب تھا، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر مسلمان ان ہی کے ہاتھوں میں سپرد کر دیئے گئے، تو یہ ان کو کہاں لے جا کر غرق کریں گے، اپنے وصیت

نامہ میں لکھتے ہیں:

کرامات فروشان اس زماں ہمہ الاما شاء اللہ طلسمات و نیز نجات را کرامات دانستہ اند۔

کراموں کے بیچنے والے اس زمانہ میں سب کے سب (بجز اسکے جسے خدا

چاہے) اپنی طلسماتی کاروائیوں اور علم نیز سنج کے نتائج کو کرامات سمجھی بیٹھی ہے۔

پھر اس کی تفصیل کرنے کے بعد کہ آدمی طلسمی قوانین اور علوم نیز نجات کے زور سے

کس کس قسم کے ”خوراق“ دکھا سکتا ہے، آخر میں فرماتے ہیں کہ:

واعمال جوگ کہ بعضے ملاحظت جوگیہ را خاصیت تمام سمت در اشرف و کشف

اور جوگ بعض تدبیریں، کیونکہ جوگیوں کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو

دوسروں کے دل کی حالت پر فی الجملہ اطلاع، یا کشف وغیرہ سے خاص

تعلق ہے۔

جن لوگوں نے شاہ صاحب کے متعلق خیال قائم کیا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے

براہمہ اور جوگیہ کے فلسفہ ویدانیت اور فلسفہ یوگا کو اسلامی حقائق سے مخلوط کر کے ایک ”جدید

ہندی دین“ کی بنیاد ڈالی ہے، کیا ان کی نگاہوں نے یہ اور اس قسم کی بیسیوں عبارتیں نہیں

گزری ہیں؟ شاہ صاحب نے صاف کھل کر لکھ دیا ہے کہ:

”بسیارے از سادہ لوحاں دیدہ ایم کہ چوں اس اعمال از شیخے فرا گرفتہ انداں

را عین کرامات می دانند“

”میں نے بہت سے سادہ لوحوں کو دیکھا ہے کہ کسی شیخ سے جب اس قسم

کے عمل وغیرہ کو سیکھ چکے ہیں، تو انہی باتوں کو ٹھیک کرامت قرار دیتے

ہیں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ:

صلاح و فوجر، مقبول ہوں، یا مردود ہوں دریں جاہج فرق پیدا نمی کند

نیوکاری، یا بدکاری اسی طرح مقبول ہونا، یا مردود ہونا، اس معاملہ میں

اس اختلاف حال سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(یعنی ان روحانی ورزشوں سے یہ نتائج ہر ایک میں پیدا ہوتے ہیں، خواہ

شقی ہو، یا سعید)

خصوصاً جو زمانہ شاہ صاحب کا تھا، طرح طرح کے طریقے اور نئی نئی شکلوں میں تصوف پیش ہو رہا تھا، آپ ہی کے عہد میں دلی کا وہ مشہور مردود معروف بن۔۔۔ ”نمود و نمود“۔۔۔ ایک خاص بھیس میں ان ہی طلسمی نیرنجاتی جو گیتاتی طریقوں کو سیکھ کر نمودار ہوا تھا، جس نے ایک خاص زبان اور اس کے قواعد ایجاد کئے تھے اور اپنے ایک ساتھی کو محرم اسرار بنا کر۔۔۔۔۔ ”آ توزه مقدسہ“۔۔۔۔۔ نامی کتاب کے الہام کا دعویٰ کیا تھا، مدعی تھا کہ نبوت اور وصیت کے درمیان ایک اور لاہوتی عہدہ ہے، جس کی تعبیر وہ ”بیگوکت“ کے لفظ سے کرتا تھا کہ ہر اولوالعزم پیغمبر کے ساتھ ہمیشہ نوبیگوک ہوا کئے ہیں اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ بھی نوبیگوک کا پیدا ہونا ضروری ہے، پھر شیعوں کی جماعت میں تو یہ کہتا ہے کہ بیگوک اول حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے، ان کے بعد آٹھ اماموں تک، یعنی: حضرت علی رضاً تک امامت اور بیگوک کے عہدے ایک ہی ذات میں جمع رہے، ان کے بعد صرف امامت رہ گئی اور نویں آخری بیگوک کا منصب مجھے عطا ہوا ہے، مجھے ہی پر یہ عہدہ ختم بھی ہوتا ہے اور سنیوں سے کہتا کہ چار بیگوک تو خلفاء راشدین تھے، اور باقی چار بیگوک کے لیے بنی امیہ اور عباسیہ کے بعض ایسے خلفاء کا نام لیتا، جو گو نہ نیکی اور دینی حمیت میں امتیاز رکھتے تھے اور نواں بیگوک اپنے کو ٹھہراتا، اس نے عوام کو فریب دینے کے لیے اپنے مریدوں اور لڑکوں، لڑکیوں کے خاص خاص مجہول المعنی نام رکھتے تھے، مثلاً وہی محرم اسرار جو گویا اس کا خلیفہ تھا، اس کا نام ”دو جی یار“ تھا۔ نما، نمود، نمود، فغار، نمود دیدہ، اس کے لڑکوں کے اور نمناہ کلاں، نمناہ خورد لڑکیوں کے نام تھے، مریدوں کو ”فر بود“ کہتا تھا، اس نے پنجوقتہ نمازوں کے سوا ”دید“ نامی عبادت کا طریقہ جاری کیا تھا، جو طلوع و غروب و استواء شمس کے وقت ایک خاص طریقہ سے ادا کی جاتی، اس کے علاوہ اسلامی عیدوں کے چند مزید تہواروں کا اضافہ کیا تھا، یعنی: جن دنوں میں (العیاذ باللہ) ”وجی“ کی اس پر ابتداء ہوئی، بلعون مدعی تھا کہ اس پر بھی وجی دو طریقوں آتی ہے، ایک میں آفتابی قرص اس کے سامنے نمودار ہوتا ہے اور اسی پر حروف لکھے ہوئے نظر آتے ہیں اور دوسری میں آواز آتی ہے، الغرض خرافات کا ایک سیلاب تھا، جو پیر و مرید نے مل کر بہایا تھا، چونکہ بعض امراء بھی اس کے معتقد ہو گئے تھے، اس لئے عوام کا میلان بھی اس کی طرف بتدریج بڑھتا جاتا تھا، حتیٰ

کہ فرخ بادشاہ بھی اس کی استجابت دعا کی شہرت سن کر تہائی میں ملا، مکار نے یہ سن کر کہ بادشاہ ملنے آ رہا ہے، کمرہ کا دروازہ بند کر دیا، ہزار منت سماجت کے بعد جب دروازہ کھلا، تو بادشاہ کے سامنے اس مرگ چھالے کو پھینک کر جس پر خود بیٹھا ہوا تھا بولا:

پوست تحت گدائی و شاہی ہمداریم آنچمی خواہی

بادشاہ اپنے ساتھ روپیوں اور اشرافیوں کی تھیلیاں نذر کے لیے لے گیا تھا، ٹھوکر مار کر کنارہ کر دی، جب فرخ سیر نے بہت اصرار کیا، تو خود نوشتہ قرآن دے کر اس کی اجرت کل ستر روپیہ اس نے قبول کی، بادشاہ پر اس کی مصنوعی بے نیازی و استغناء کا پورا اثر ہوا، نتیجہ یہ ہو اکہ اب تک تو کچھ علماء اور عام پبلک کے خوف سے اپنے مخرقات کے علانیہ اظہار کی اسے جرات نہ ہوئی تھی، لیکن بادشاہ کی عقیدت مندی کے بعد خود کھیل کھلا، ایک خاص قسم کی لمبی ٹوپی سر پر رکھے دو جھنڈوں کے ساتھ اس کے فر بود اس کی سواری نکالتے تھے، باہم ایک دوسرے پر عبور و گلاب چھڑکتے جاتے، اور وہی مجہول المعنی اختراعی الفاظ والے منتر چیتے جاتے تھے اور اب ان کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، دلی کی ایک بڑی مخلوق اس کی معتقد اور اس کی اصطلاح میں اسکی ”فر بود“ ہو گئی تھی، فرخ سیر کے عہد تک اس کا یہی حال رہا، محمد شاہ کے زمانہ میں جب محمد امین خاں منصب وزارت سے سرفراز ہوئے، تو منجملہ اور کاموں کے اس ”نمود و انمود“ کی بھی خبر لینی چاہی، لیکن اتفاق دیکھئے جیسا کہ طباطبائی نے لکھا ہے، ٹھیک ان ہی دنوں میں جب اس کی گرفتاری کے احکام جاری ہوئے، امین خاں جو مرض قونج میں پہلے ہی سے مبتلا تھے، انتقال کر گئے، مردود ”وانمود“ کے لیے ان کی موت استدراج کا ذریعہ بن گئی، اب کیا تھا خوب لن ترانیوں کی لینے لگا، اگرچہ دو تین سال بعد خود بھی مر گیا، اور اسی کے بعد اس کے خلیفہ اول ”دوجی یار“ اور صاحبزادے بلند اقبال ”نما نمود“ میں ”نصف لی و نصف لک“ کے قصہ میں جھگڑا ہو گیا، ”دوجی یار“ نے آخرا یک دن جب اس کے اکثر ”فر بودوں“ کا مجمع تھا، کھڑے ہو کر سازش کا سارا قصہ سنایا، دونوں نے مل کر جو مسودات بناتے اور کاٹ پیٹ کر درست کرتے تھے، ان کا طومار لوگوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر:

از جانب خدای بود حاجت بحک و اصلاح ہمد گیرنداشت (سیر الماخرین، ج ۲۰، ص ۴۶: ۴۷)

اگر اللہ میاں کی طرف سے یہ کتاب ہوتی، تو اس میں کانٹ چھانٹ اور

اصلاح کی ضرورت نہ ہوتی۔

دونوں کے حروف کے پہچاننے والے کثرت سے موجود تھے، راز کھل گیا اور پچارے عوام کو اس کے فتنے سے نجات میسر آئی، اگرچہ ”نمانمود“ نے کچھ دن اپنے باپ کی بیگوکت کے بجائے دہلی کے ایک دیہات میں جا کر چلایا اور ”نمانمود“ کے بعد ”فغار“ صاحب دوسرے بیٹے نے بھی کچھ دن اس تحریک کو چند لوگوں میں باقی رکھا، یہاں تک کہ بالآخر فغار کے مرنے کے بعد چند بقیہ السلف اس کے اعزہ بنگال میں پناہ گزیں ہوئے اور مشہور اشقی القوم میر جعفر کے بیٹے میرن کی سرپرستی میں کچھ دن گزارے، خدا جانے ان منحوسوں کے نام لیوا اب بھی بنگال میں پائے جاتے ہیں، یا نہیں، تاہم ایک مدت تک خصوصاً اس زمانہ میں جس میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ دلی میں تھے، ہندوستان کے مسلمان اس خبیث فتنہ کے شکار ہو رہے تھے اور واقعہ کچھ بھی نہ تھا، عالمگیر کے عہد میں کابل کا صوبہ دارا میرخان تھا، اس کے پاس ایران سے یہی ”نمود و انمود“ جس کا اصلی نام محمد حسین تھا آیا، اور سید ہونے کا مدعی ہوا، امیرخان کی بیوی جو لادلتھی، اس نے ایک لڑکی پال رکھی تھی، اسی سے اس کا نکاح ہو گیا، امیری سے گزرنے لگی، امیرخان صاحب مر گیا، تو محمد حسین جو امیر خان کے خوشبو خانہ کا داروغہ بھی تھا، عطر و گلاب کا تحفہ لے کر دلی چلا، لاہور میں عالمگیر کی وفات اور خانہ جنگی کی خبر ملی، امراء کے ہاتھ اسی عطر و گلاب کو بیچ کر اس نے ساٹھ ستر ہزار روپیہ کھریے کئے اور اسی نے دو جی یار سے سازش کر کے مکرو فریب کا یہ طلسم کھڑا کیا تھا۔

مسلمانوں کی یہ زود اعتمادیاں، جو غلط تصوف کے رواج کا نتیجہ تھیں، حتیٰ کہ بادشاہ تک ان ہی اوہام میں مبتلا تھا، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک صاحب بصیرت روح کے لیے کس درجہ سوہان روح بنی ہوئی ہوئی اور بات کچھ اسی پر ختم نہیں ہو گئی تھی، یہ تو ایک فرقہ تھا اور بھی اس قسم کے مختلف فرقے مختلف ناموں سے تصوف و عرفان کے بلند آہنگ دعووں کے ساتھ پیدا ہو رہے تھے اور مختلف قسم کے شعبوں، کرشموں سے عوام کو اپنی طرف مائل

۱۔۔۔ میں نے اس مردود نمود و انمود کے حالات میں ذرا زیادہ اوسط سے قصد کام لیا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس زمانہ میں بھی بعض لوگ اپنے مردود اور عزیزوں کو جو عجیب و غریب خطابات تقسیم فرماتے ہیں، یا نبوت و وحیت، مہدویت وغیرہ کے مجوں سے ”بروزی“ ”مثنیٰ“ اور خدا جانے کس کس قسم کی نبوتیں تراش رہے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہندوستان ان تمام تماشوں کو پتہ تھی، نتیجہ یہ ہے۔

کر کے گمراہ کر رہے تھے، شاہ صاحب خود اپنا ذاتی تجربہ بیان فرماتے ہیں:

ما تجربہ کردہ ایم کہ ماہر درفن نجوم چون دانست کہ الحال کدام دقیقه ست از دقائق روز ازیں جاز ہن اور منتقل می شود، بطالع و ہمہ بیوت و مواضع کو اکب در خاطر حل صورت می بندد گویا صفتہ تسویۃ البیوت، مقابل خود ایستادہ است و ہم چنین ماہر درفن رل گاہے در دل خود معین می کند کہ فلاں انگشت را لھیاں قرار دادہ ام، و فلاں انگشت را فلاں شکل در ذہن صورت می بندد و ازیں شکل کدام متولد می شود، تا اینکه زانچہ پیش او حضری شود۔

میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ نجوم کے فن میں جن لوگوں کو مہارت ہوتی ہے، جب انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت دن کے دقیقوں میں سے کون دقیقہ ہے، تو مطالع اور ہر ہر بیت و مقامت کو اکب کی طرف اس کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے اور یہی حال ان لوگوں کا ہے، جو فن رل میں ماہر ہوتے ہیں، اپنے دل میں یہ خیال جماتے ہیں کہ فلاں انگلی کو میں نے لھیاں قرار دیا ہے اور فلاں انگلی فلاں شکل اور ان سب سے ذہن میں ایک صورت قائم کر کے سوچتے ہیں کہ ان میں ظاہری شکل و صورت میں بچہ کس کے مناسب ہوگا، اسی طرح زانچہ سامنے ہو جاتا ہے۔

اور یہ نجوم کا حال ہے، شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ کہانت جس کی بہت سی قسمیں ہیں، جن میں کبھی جن اور ارواح کو حاضر کیا جاتا ہے، (یعنی موجودہ زمانہ کا اس پر ولیو جزم) نیز توجہ کو کسی خاص نقطہ پر مرکوز کر کے معمول کو متاثر کرنا، جسے اب ”مسمریزم“ کہتے ہیں، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

ہمت بستن بر کارے و بشکل مہیب بر آمدن و دل بہ دل کے داشتن و طالب را مسخر کردن ہمہ از فنون نیرنخ است۔

کسی کام کے متعلق ہمت کو قوی کرنا اور ذرا ذرا نی شکل میں لوگوں کے سامنے اپنے کو نمایاں کرنا کسی کے دل پر دل رکھنا اور طالب کو مسخر کرنا، یہ ساری باتیں ”علم نیرنگ“ سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن غلط تصوف نے عوام کو باور کرایا تھا کہ یہ ساری باتیں قرب الہی کے دلائل ہیں۔



حضرت شیخ الہند کے درس میں

علامہ مناظر احسن گیلانی

چاہئے تو یہی تھا کہ صدر دارالعلوم اور رئیس الاساتذہ ہونے کی حیثیت سے جس کے ذکر جمیل کو اب حوالہ قلم کر رہا ہوں، سب سے پہلے ان ہی کا تذکرہ کرتا۔ میری مراد سے ”شیخنا و شیخ الکل“ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (طاب ثراہ و جعل الجنة مشواہ) کی ذات گرامی ہے۔

لیکن بزرگوں کے متعلق پیمائش اور فیتہ بازی کے شعل نامحود سے فطرۃ نہ میرے دماغ ہی کو کبھی کسی قسم کا تعلق رہا اور نہ دل کو ناپنا اور ناپ ناپ کر بزرگوں کی نمبر اندازی، کسی کو اول، کسی کو دوم، کسی کو سوم نمبروں کا مستحق ٹھہرانا، یہاں تو بلندی کی آخری سطح تک اس جرأت بے جا کی اپنے اندر ہمت ہی نہیں پاتا، سب اپنے بزرگ ہیں، سب ہم سے بہتر و برتر، سب بڑے اور اونچے ہیں، رہا اپنے پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ سبحانہ کے نزدیک ان کی لابیوتی مقامات و مراتب، سو ظاہر ہے کہ جب کلمۃ اللہ و روح منہ حضرت مسیح علیہ السلام تک کا یہ اعتراف قرآن میں نقل کیا گیا ہے کہ اپنے خالق کردگار کو خطاب کر کے عرض کریں:

﴿تَعْلَم مَافِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَم مَافِي نَفْسِكَ﴾ (المائدة)
 ”جو کچھ میرے جی میں ہے، اسے تو جانتا ہے اور جو کچھ تیرے جی میں ہے، وہ میں نہیں جانتا“۔

تو آپ ہی بتائیے کہ ایک ظالم و جہول میں اس فیصلے کی جرأت کیسے پیدا ہو سکتی ہے کہ حق تعالیٰ کے ہاں احترام و تہیب میں کس کا درجہ کیا ہے؟ یہ تو ”مافی نفسک“ کے علم کے جہاں تک میں سمجھتا ہوں ایک بے بنیاد ادعاء کے سوا شاید اور کچھ نہیں، بقول شخصے

جگر ان کا ہے، جو تہ کو صنم سے یاد کرتے ہیں

میاں ہم تو مسلمان ہیں خدا کہنے سے ڈرتے ہیں

کچھ بھی ہونفقیر نے اپنے بیان میں تاثیر و تاثر کی ترتیب کو چونکہ پیش نظر رکھا ہے، پہلے

بھی مختلف پیرایوں میں عرض کر چکا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند کے حلقہ تدریس میں شریک ہونے کے بعد سب سے پہلے یہ واقعہ ہے کہ اپنا دل حضرت شاہ صاحبؒ کی ہی ذات سے متاثر ہوا تھا، اس لئے قدرۃً اس سلسلے میں ان ہی ذکر کو مقدم کرنا پڑا۔

شاہ صاحبؒ کے بعد دوسری ہستی سے متاثر ہونا کیا معنی؟ واقعہ یہ ہے کہ جس سے تاثر کے بعد اور کچھ ہوا ہو، یا نہیں، لیکن جو کچھ پہلے تھا، اس تاثر جدید کے بعد قطعاً وہ باقی نہ رہا۔

داستان انقلاب

اب انقلاب کی اس داستان کو سنئے، دل پر یہ افتاد جس زمانے میں پڑی تھی اور جس حادثہ کی شکار یہ جان حزین ہوئی، اس وقت بھی یاد آتا ہے کہ مولانا حالی مرحوم کی ”مسدس“ کے مقدمہ والا مشہور شعر۔

آن دل کہ دم نمودے، از خوب رو جواناں

دیرینہ سال پیرے بردہ بیک نگاہے

زبان پر جاری تھا اور اب بھی جب خیال آجاتا ہے، تو بے ساختہ حافظ میں یہی شعر تازہ ہو جاتا ہے، شاید پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی رشتہ میں منسلک ہو جانے کے بعد خاکسار چند مہینوں تک دارالعلوم کے اساتذہ سے بے گانہ اور نا آشنا ہی رہا۔ ان استادوں میں حضرت شیخ الہندؒ بھی تھے، پڑھنے کی حد تک تو طلبہ کے ساتھ ان کے حلقہ درس میں دوسروں کی طرح فقیر بھی بیٹھ جاتا تھا، لیکن براہ راست ذاتی نیاز مندی کا موقع اب تک میسر نہیں آیا، اپنی اس محرومی کے اسباب کیا عرض کروں، خیر آبادی رجحانات کا کچھ دباؤ کہنے اور کچھ یہ خیال کہ دارالعلوم میں لال پیلے، ہرے، رنگ برنگ کے طلباء مختلف صوبہ جات، ہند کے مختلف اقالیم کے کیڑے مکوڑوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں، کوئی وجہ نہ تھی کہ اپنے آپ کو انہیں کیڑوں میں سے کوئی ناپرسان کیڑا اور گنام مکوڑا خیال نہ کرتا، کوئی امتیازی بات اپنے اندر ایسی نظر نہ آئی کہ ان بزرگوں سے ذاتی تعارف کی ہوس دل میں پیدا ہوتی۔ الغرض کچھ اس قسم کے ملے جلے اسباب و موثرات تھے، جنہوں نے کئی مہینوں تک حضرت شیخ الہندؒ سے میرے تعلقات کو درس کے عام حلقے تک ہی محدود

رکھا۔ دستور بس یہی تھا کہ کتاب یعنی ”ترندی شریف“ کا جو نسخہ مدرسہ سے عاریتاً پڑھنے کی لیے ملا تھا، بغل میں دبائے طلبہ کے ساتھ نودرہ کے شمالی سمت کی طرف بالا خانہ پر جو ایک وسیع و عریض کمرہ تھا، اسی میں حضرت شیخ الہند بھی پڑھاتے تھے اور شاہ صاحبؒ ہی، بس اسی کمرہ میں حاضر ہو کر طلباء کے حلقہ میں کسی جگہ بیٹھ جاتا، زیادہ تر پچھلی صفوں میں ہی میرے لئے جگہ نکلتی، دوسرے طلباء پہلی صفوں میں قبضہ کر لیتے، اسی لئے جہاں تک میرا خیال تھا، حضرت شیخ الہند کی نظر بھی اس فقیر پر نہ پڑی ہوگی، البتہ کبھی کبھی کوئی ضروری بات دریافت کر لیا کرتا تھا، ممکن ہے اس کی وجہ سے خطاب کا موقعہ حضرت والا کو مل جاتا ہو، لیکن اسی پچاسی طلباء کی بھیر میں اس کی توقع کہ سوال و جواب اور وہ بھی معمولی طالب علمانہ انداز کے، ذاتی تعارف کا ذریعہ بن جائیں گے، یقیناً بے بنیاد ہی ہو سکتی ہے بہر حال یوں ہی دن گزرتے رہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا درس

حضرت شیخ الہندؒ کی شان، شاہ صاحبؒ کے درس سے مختلف تھی، حضرت شیخ الہندؒ دوبرا اوڑھے ہوئے اگر سرما کا موسم ہوتا اور شاید درس جس زمانے میں شروع ہوا تھا، جاڑوں ہی کا زمانہ تھا، سر پر دوپلی ٹوپی، بدن پر کھادی کا لمبا کرتا، کھادی ہی کا پاجامہ، اسی لباس میں ہاتھ میں لٹھیا لئے ہوئے زینہ سے تشریف لاتے، درس کے کمرے میں ایک گداجو لچکدار تاروں سے خاص طور پر اسی لئے بنایا گیا تھا کہ بوا سیر کے مسوں کی وجہ سے عام قسم کے گدے پر آپ کو تکلیف ہوتی تھی، اسی گدے پر بیٹھ جاتے تھے، دوہرے کے اندر محسوس ہوتا تھا کہ ان کی انگلیاں تسبیح کے دانوں کو پھیرنے میں مصروف ہیں، طالب علم حدیث پڑھتا جاتا اور آپ سنتے جاتے، دورہ میں ترجمہ بزبان اردو کا قصہ ختم ہو جاتا تھا، اس لئے کہ ”مشکوٰۃ“ میں حدیث کا متن طلباء پہلے پڑھ چکے تھے، کہا جاتا ہے کہ دورہ میں شریک ہونے والے طلباء ترجمہ کی ضرورت سے بے نیاز ہو جاتے تھے، اسی لئے بطور ”سرڈ“ کے ایک حدیث کے بعد دوسری حدیث، دوسری کے بعد تیسری حدیث گزرتی چلی جاتی، لیکن تبھی کبھی ”ہاں چلئے“ کے سوا حضرت شیخ الہندؒ کی زبان مبارک پر بمشکل کوئی لفظ آتا، گویا تظنی

ایک خاموش درس تھا، جب کوئی ایسی حدیث آجاتی جو بظاہر مفہوم کے لحاظ سے قطعی طور پر حنفی مذہب کے خلاف ہوتی اور پڑھنے والا طالب علم خود رُک کر دریافت کرتا، یا دوسرے طلباء پوچھتے کہ حضرت یہ حدیث تو امام ابوحنیفہؒ کے قطعاً خلاف ہے، جواب میں مسکراتے ہوئے بے ساختہ حضرت شیخ الہندؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلتے ”خلاف تو ہے بھائی! میں کیا کروں؟ ہاں آگے چلئے“ طالب علم عرض کرتا کہ حضرت آخر امام صاحبؒ کی طرف سے کوئی جواب اس کا دیا گیا ہے؟ تمہاری کتابوں میں کچھ لکھا ہوگا، پڑھ لینا، یہ جواب دے کر ٹال دیا جاتا، طالب علم مصر ہوتا کہ آپ اپنا خیال ظاہر کیجئے، فرماتے طلباء کا اصرار جب حد سے تجاوز کر جاتا، تب نہایت مجمل الفاظ میں کچھ اجمالی اشارات فرمادیتے، اس وقت ان اشاروں کی اہمیت محسوس نہ ہوتی تھی، لیکن کم از کم فقیر اپنی حس تک یہ کہہ سکتا ہے کہ زندگی میں بعد کو پڑھنے پڑھانے، لکھنے لکھانے کے طویل مواقع جو ملے، بغیر مبالغہ کے عرض کر رہا ہوں کہ شیخ الہندؒ کے ان اجمالی اشاروں کا وزن روز بروز دل میں کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی چلا گیا، ایک نہیں، خلائیات کے سلسلے میں بیسیوں مسائل میں آخری تحقیقی بات وہی ثابت ہوئی، جن کی طرف حضرت شیخ الہندؒ اجمالی اشارے فرمادیا کرتے تھے، خام علم والے طلباء پر ان پختہ باتوں کا اثر ابتداء میں کم ہوتا، وہ پھر اعتراض کرتے، حضرت شیخ الہندؒ کچھ زیادہ گہرے ہو جاتے اور یوں آہستہ آہستہ طالب علموں کو فکر و تحقیق کا خاص طریقے سے وہ عادی بنا تے، لیکن باہر سے دیکھنے والا حضرت شیخ الہندؒ کے اس سیدھے سادھے طریقےء درس سے اگر متاثر نہ ہوتا، تو جورنگ تھا، ظاہر اقتضاء اس کا یہی ہو سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ کمال بے نفسی کے بغیر اس قسم کے درس کی ہمت عام مدرسوں میں شاید پیدا نہیں ہو سکتی، اس مناظرانی طریقہء تدریس نے آخر کار مجھے اس فیصلہ تک پہنچا دیا کہ پیر سال خوردہ حد سے زیادہ ثاقب ذہن کا مالک ہے۔ ان کی غیر معمولی وقاد فطرت کا اندازہ بتدریج ہوتا رہا، لیکن پھر بھی ذاتی تعارف کی صورت پیدا نہ ہو سکی، لیکن اب نجالت مانع آجاتی ہے، خیال آتا ہے کہ اتنے دنوں سے حضرت سے مستفید ہو رہا ہوں اور ملاقات کی توفیق نہ ہوئی، اب کس منہ سے سامنا کروں؟

ایک عجیب ہولناک کیفیت

انہی حالات میں تھا کہ اچانک میرے اندر ایک کیفیت شروع ہوگئی، عجیب کیفیت خصوصیت کے ساتھ زیادہ تر یہ کیفیت شیخ الہند کے حلقہء درس میں جہاں تک یاد آتا ہے، زیادہ شدت پذیر ہو جاتی۔ اس وقت تو اس کے ذکر سے بھی جی گھبراتا ہے، لیکن جب واقعات ہی لکھنے پر آمادہ ہو گیا ہوں، تو اس کا تذکرہ کیسے نہ کروں؟

ہونے یہ لگا کہ جوں ہی حدیث شروع ہوتی، اپنے ذہن میں الجھنوں کے طوفان کو پاتا، طرح طرح کے شبہات ہر حدیث میں ہوتے، یہ شبہ طالب علمانہ، یا مولویانانہ تھے، بلکہ مصیبت یہ تھی کہ ذات رسالت مآب ﷺ ہی ہے۔ (العیاذ باللہ) ان خبیث اور گندے وساوس اور خیالات کا عموماً تعلق ہوتا، بدگمانیوں کی ایک آگ تھی، جو معلوم ہوتا تھا کہ میرے باطن میں بھڑک اٹھی ہے، دو گھنٹے تک عموماً ترمذی شریف کا یہ درس مسلسل جاری رہتا اور ایک سیاہ کار، سیاہ سینہ ان دو گھنٹوں کے اندر ان ہی شکوک و شبہات کی آستشیں لہروں میں جلتا بھنتا رہتا، ہر حدیث میرے لئے بدگمانی اور سوء ظن کا چھماق گویا بنتی چلی جاتی، دماغ صرف ہرزہ اندیشیوں اور زیادہ بائوں کا کارخانہ بنا ہوا تھا، درس سے فارغ ہو کر جب اپنی فرودگاہ، حجرہ قبریہ میں آتا، تو تنہائی میں دیر تک اپنے نفس، دل و دماغ کے ان عجیب و غریب آثار کو سوچ سوچ کر کیا عرض کروں کہ کس طرح گھلتا چلا جاتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم فلسفہ کے ساتھ اخباروں اور رسالوں کے ذریعے موجودہ الحادی رجحانات سے گو نہ واقف ہونے کے مواقع مجھے ضرور ملے تھے، لیکن بحمد اللہ ایسا منحوس وقت جہاں تک یاد پڑتا ہے، کبھی نہیں گزرا تھا کہ دین کی آخری بنیاد رسالت محمدیہ علی صاحبہا الف سلام و تحیۃ کے متعلق شک و شبہ کا کوئی کاٹا دل میں کبھی کھٹکا، چبھا ہو اور یہی پاک رشتہ ایمانی حدود سے بہر حال اپنی سیاہ کاریوں اور بد اعمالیوں کے باوجود دور ہونے نہیں دیتا تھا، لیکن دل و دماغ پر اب جو دورہ پڑا تھا، محسوس ہو رہا تھا کہ دین کی مرکزی چٹان ہی سے پاؤں (العیاذ باللہ) پھسل رہا ہے، اُف! اس تاریکی اور اندھیری کا اب جب خیال آتا ہے، تو کانپ اٹھتا ہوں، گھبرا گھبرا کر کبھی تن تنہا جنگلوں اور کھیتوں کی طرف نکل جاتا، غلطاً

دیکھاں انہیں خیالات و وسوسوں میں ٹہلتا رہتا، باتیں ایسی تھیں کہ کسی سے ذکر کر کے دل کی بھڑاس بھی نہیں نکال سکتا تھا، گویا کہ ایک اندرونی آگ لگی ہوئی تھی، جس میں کر دینیں لیتا رہتا، خفقان اور دورے کی شدت روز بروز بڑھتی ہی چلی جاتی تھی، نمازوں میں سوچتا تو یہی سوچتا، دعائیں یہی کرتا کہ اے پروردگار! یہ کیا حال ہے؟ میں دین کو درست کرنے کے لیے دارالعلوم میں حاضر ہوا تھا، لیکن بچا کھچا جو سرمایہ دین و ایمان کا تھا، میرا لٹا جاتا ہے، میں تو کہیں کا نہ رہا، یاد پڑتا ہے کہ کبھی کبھی تنہائی میں چیخ بھی نکل جاتی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ پیدا کرنے والے نے مجھے شاید پیدا ہی جہنم کے لیے کیا تھا، حالت جب خد سے زیادہ زبوں ہونے لگی، تب ایک یہ خیال بھی سامنے آنے لگا کہ میں دارالعلوم کو چھوڑ کر چلا جاؤں، متعدد بار یہ فیصلہ دماغ میں آیا، لیکن فیصلہ نے فیصلہ کی صورت اختیار نہ کی۔

قدرتی دستگیری

بہر حال اسی زمانے میں ایک قدرتی دستگیری کی شکل سامنے آئی، جماعت دیوبند کے ایک امی رکن مشہور شخصیت حضرت امیر شاہ نور اللہ مرقدہ "مینڈھو" جہاں ان کا مستقل قیام تھا، وہیں سے اپنے دستور کے مطابق دارالعلوم میں اسی عرصہ میں تشریف فرما ہوئے، رات کو ایک دن مولانا مرتضیٰ حسن مرحوم کے بھتیجے "مولوی محمد حسن چاند پوری" جو اس زمانے میں ایک جوان رعنا تھے اور تازہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد بحیثیت معین المدرسین کے دارالعلوم کے تفتاتی کلاسوں کی تعلیم کی خدمت انجام دیتے تھے، ہم عمری کی وجہ سے مولوی محمد حسن سے کافی رسم و راہ پیدا ہو گئی تھی، ان کو آریوں، عیسائیوں وغیرہ کی مناظرہ بازی کا شوق تھا، جس سے تھوڑی بہت دلچسپی اس زمانے میں فقیر کو بھی تھی، نودرہ میں مناظرہ کی مشقی مجالس جمعہ کی راتوں کو عموماً ہوا کرتی تھیں، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب مرحوم صدارت اور حکم ہونے کے فرائض عموماً انجام دیتے تھے۔ مناظرہ کا ایک فریق مولانا محمد حسن کے مقابلہ میں عموماً فقیر ہی ہوا کرتا تھا۔ الغرض مختلف وجوہ سے ان کے کمرے میں میری بیٹھک رہتی تھی، یاد پڑتا ہے کہ مغرب کے بعد ایک دن ان کے حجرے میں کسی مسئلہ پر بلند آواز سے کچھ بکواس کر رہا تھا، میری آواز نے "امیر شاہ خان" کو متوجہ

مختصر سوانح حالات و خدمات

کیا اور حجرے سے باہر ٹھٹھک کر دیر تک میری باتیں سنتے رہے اور پھر چلے گئے، دوسرے دن دریافت کیا کہ یہ نئے طالب علم کون ہیں، جو رات کو باتیں کر رہے تھے؟ لوگوں نے پتہ بتلایا، اب یاد نہیں ہے کہ مجھے بلوایا، یا میرے حجرے میں خود قدم فرما ہوئے، بڑی شفقت سے ملے، پھر پوچھنے لگے تم نے کہاں کہاں پڑھا ہے؟ اور کیا کیا پڑھا ہے؟ جو واقعہ تھا، عرض کر دیا گیا۔ چند ہی دنوں میں ان کی خصوصی توجہات کا مرکز بن گیا، بڑے پتے کی باتیں ان سے معلوم ہوتی تھیں، لیکن میرے دل کی آگ کا پانی ان کے پاس بھی نہ تھا، جب ان سے اُنس اتنا زیادہ بڑھ گیا، تو جن خیالات و کیفیات میں الٹ پلٹ رہا تھا، آخر پریشان ہو کر ایک دن تنہائی میں امیر شاہ کی خدمت میں انتہائی بے کسی کے ساتھ اپنی ذہنی آوارگی کی روداد سنا ہی دی۔

پند پیر دانا

اس سرد گرم چشیدہ پیر دانا نے غور سے میرے درد کی داستان سنی، سب کچھ سن لینے کے بعد بولے کہ اپنے ان خیالات کا تذکرہ اپنے استاذ مولوی نمود حسن سے کیوں نہیں کرتے؟ میں نے آبدیدہ ہو کر عرض کیا کہ میری کورنجی نے ان کے دربار تک پہنچنے کا موقع میرے لئے باقی نہیں رکھا ہے۔ مجھے شرم آتی ہے کہ اتنے دن دیوبند میں گزر گئے اور حضرت کی خدمت میں حاضری کی توفیق میسر نہ آئی، اب سامنا کرتے ہوئے نجالت و ندامت محسوس ہوتی ہے۔ خاں صاحب نے اس پر تسلی و تشفی کے کلمات فرماتے ہوئے کہا کہ میں تم کو مولوی صاحب کی خدمت میں لے چلوں گا، ان سے ضرور ملو اور جو حال ہے، اس کو ان پر پیش کرو، وقت مقرر ہو گیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضری

شاید عصر کے بعد کسی دن امیر شاہ خاں صاحب مرحوم اپنے ساتھ لے کر حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے، بان کے ایک پلنگ پر تشریف فرما تھے، سلام کیا، مصافحہ کا شرف حاصل ہوا، تب امیر شاہ خاں نے فرمایا کہ یہ آپ کے شاگرد ہیں، دورہ کے طالب علم ہیں، آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں، ان سے یہ سن کر

حضرت نے فقیر کی طرف خطاب کر کے فرمایا: ”آپ تو حدیث کے درس میں آتے ہیں“۔ یہ پہلا فقرہ تھا جس سے معلوم ہوا کہ کم از کم حضرت والا کے لیے جیسا کہ میں سمجھے ہوئے تھا، یہ غریب قطعاً مجہول المطلق ہونے کی حیثیت تو نہیں رکھتا، اتنا بہر حال وہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے حلقہ درس کا ایک طالب علم میں بھی ہوں، پھر فرمایا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ شاید اس وقت خلوت کی درخواست میری طرف سے پیش ہوئی، جو منظور ہوگئی اور غالباً برآمدے کے بعد جو ہال حضرت کی نشست گاہ میں ہے، وہاں تشریف لے گئے اور جب کوئی نہ تھا، شاید امیر شاہ خاں صاحب بھی نہیں، تو بھرائی ہوئی آواز میں دکھ کا افسانہ شروع کر دیا گیا، جو دل پر گزرتی ہی تھی، بے کم و کاست عرض کرتا گیا، سنتے رہے، خاموشی کے ساتھ سنتے رہے، داستان جو ختم ہوئی، تو وہی بات جواب تک زیادہ لمبی اور طویل نظر آتی تھی، شیطان کی آنت سے بھی زیادہ طویل، صرف ایک فقرے سے سکر گئی اور ہمیشہ کے لیے سکر گئی، ارشاد ہوا: مولوی صاحب آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ اپنا یہ حال جب آپ کے لیے اتنا ناگوار ہے، تو یہ بے ایمانی کی نہیں، بلکہ آپ کے ایمان کی دلیل ہے۔ ایمان نہ ہوتا، تو ان حالات میں آپ اتنا پریشان ہی کیوں ہوتے؟ بعد کو یہ مضمون خود نبوت کے ارشادات میں بھی ملا، لیکن پہلی دفعہ حضرت شیخ الہند کی زبان مبارک سے اس طرح نکلے کہ دل میں معلوم ہوتا تھا کہ کچھ تھا ہی نہیں، طمانیت اور بشارت کی لہریں میرے چہرے پر کھیلنے لگیں، یہ دیکھ کر تب ارشاد ہوا کہ آپ نے کہاں کہاں اور کیا کیا پڑھا ہے؟ اپنی تعلیمی روداد سنا دی، زیادہ وقت قدیم فلسفہ اور منطق کے پڑھنے میں صرف ہوا تھا۔ یہ معلوم کر کے فرمانے لگے، جو کچھ آپ کچا پکا نکلتے چلے گئے ہیں، اب وہی کچھ باہر نکل رہا ہے، پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ شاید بے اختیار گریہ کے ساتھ عرض رسا ہوا کہ حضرت میرے لئے خواہ جو کچھ بھی ہو، اب یہ حالت ناقابل برداشت ہے، میرے لئے اس قسم کے وساوس وادہام کسی حیثیت سے بھی ہوں ناقابل تحمل ہیں، میری زندگی خطرے میں ہے۔

زندہ کرامت

اب خواہ دنیا مانے، یا نہ مانے، لیکن اپنے ذاتی تجربے کا میں کیا کروں؟ جواب میں

مختصر سوانح حالات و خدمات

فرمایا گیا مولوی صاحب! جاؤ اب کوئی شبہ اور کسی قسم کا شک تم کو نہ ہوگا۔ یہ، یا اسی کے ہم معنی الفاظ تھے، آج سے تقریباً چالیس سال پہلے اللہ کے ایک برگزیدہ بندے کی مبارک زبان سے یہ بات نکلی۔ خاکسار، اس کا دماغ، اس کا دل، اس کی زندہ شہادت ہے کہ اس طویل عرصہ میں بجز اللہ پھر کسی قرآنی آیت، یا کسی نصِ نبوی ﷺ میں کسی قسم کا کوئی شبہ اب تک تو پیدا نہیں ہوا، عموماً یہی ہوتا ہے کہ کوئی ایسی چیز سامنے آتی بھی، تو معاً اس کے حل کے مختلف پہلو دماغ میں آجاتے ہیں اور یہ نہ ہوا، تو اجمالاً ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا جواب موجود ہے، خواہ اس کی تفصیل کی قدرت اس وقت سر دست نہ پائی جاتی ہو گویا کہ کوئی کیل ٹھونک دی گئی ہو کہ وہی دل جو لہریاں اور تپاں رہتا تھا، کچھ ایسا بیٹھ گیا کہ خواہ کچھ بھی گزرے، وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ اسی لئے سیدنا حضرت شیخ الہندؒ کی ایک زندہ کرامت خود اپنے آپ کو، اپنے دل و دماغ کے، اپنے ذہنی رجحانات و میلانات کو سمجھتا ہوں۔ میں کیا تھا اور کیا ہو گیا؟ بعد کو حالات نے مجھ کو جو کچھ بھی بنا دیا ہو، لیکن اس وقت جو صورت پیش آئی تھی، کہہ سکتا تھا:

ذره بودیم آفتاب شودیم

سنگ خارا بودیم آب شدیم

ذاتی تعارف کا بند دروازہ اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ سے بھی کھل گیا اور علاوہ درس گاہ کے حضرت والا کی خانگی صحبتوں میں شرکت کی سعادت بھی اس کے بعد بجز اللہ میسر آنے لگی۔

حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد مبارک، یعنی: ”جاؤ، اب کسی قسم کا وسوسہ نہیں ہوگا“، تقریباً چالیس سال پہلے کی بات ہے، صحیح الفاظ یہی تھے، یا اس کے قریب قریب، لیکن مقصد و مفہوم یہی تھا، وہ دن تھا اور آج کا دن ہے، اس عرضہ میں کہاں کہاں جانا پڑا، کن کن محفلوں میں شریک ہونے کے مواقع پیش آتے رہے، کیا کیا نہیں سنا، کیا کیا نہیں پڑھا، اونچوں سے بھی ملا اور نیچوں سے بھی میل ملاپ رہا، بگڑے ہوؤں سے بگڑے ہوئے، سلجھے ہوؤں سے بھی ربط ضبط رہا، لیکن ان کی یہ کرامت اب تک زندہ ہے کہ وسوساں و خطرات کے سوا جس کے اندر شاید کچھ نہ تھا، کم از کم اسلامی دین کے عقائد و اعمال، قرآنی

آیات اور محمد ﷺ کی رسالت و نبوت کی حد تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل بھی وہی قرآن و حدیث پڑھتا تھا، مگر وسوسوں کی چنگاریوں کے ساتھ پڑھتا تھا اور وہی قرآن اب بھی پڑھتا ہوں، حدیثیں بھی نظر سے گزرتی رہتی ہیں، لیکن بیان کر سکے، یا نہ کر سکے، تاہم محسوس اس کو یہی ہوتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا، اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

اس اعجازی اثر کے ساتھ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ و جزاء عنا خیر الجزاء کی مجلس مبارک سے واپس ہوا۔

بدلا ہوارنگ

دوسرے دن حلقہٴ درس میں حسب دستور حاضر ہوا، حاضری کا یہ رنگ گذشتہ حاضریوں کے رنگ سے مختلف تھا، ہر نیا دن اس کے بعد جو آتا جاتا تھا، اس میں یہ بدلا ہوا رنگ پختہ سے پختہ تر ہونے لگا، اب ان کی ہر بات کانوں سے گزرتی، دل میں بیٹھی چلی جاتی تھی، درس میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں حضرت والا اپنی طرف سے بہت کم کہا کرتے تھے، طالب علم ہی جب پوچھتا اور پوچھنے میں اصرار کی حد تک اس کا استفساری لہجہ پہنچ جاتا، تب جواب دیا کرتے اور اس میں بھی مناظرہ کا عادی طلباء کو بنایا جاتا، اب سمجھ میں آتا کہ طالب علم خود ہی اپنے سوال کو حل کرے، بحث کے اس طریقے سے چاہا جاتا تھا کہ اس کا ملکہ اور سلیقہ اس میں خود پیدا ہو، خود فکر کا عادی ہو۔ خلافت میں چالیس برس گزرنے کے بعد سوال و جواب کے وہ سلسلے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک دل و دماغ میں تروتازہ ہیں، ان کی بتائی ہوئی باتیں اور ان کے سکھائے ہوئے پینترے اپنی آئندہ تعلیمی و تدریسی زندگی میں ہمیشہ دستگیری کرتے رہے، علاوہ تمام مسائل مباحث کے کبھی کبھی ایسے عیسیٰ نکلتے سننے میں آجاتے تھے کہ آج بھی ان کو سوچ کر سر دھننا ہوں۔

محبت نبوی ﷺ میں نفسانیت

بخاری شریف کا سبق ہو رہا تھا، مشہور حدیث گزری کہ: ((لایؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ وولدہ و الناس اجمعین))۔ ”کوئی شخص اس وقت تک یقیناً مؤمن نہیں ہو سکتا، جب تک میں اس کے والد اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر اس

مختصر سوانح حالات و خدمات

کے نزدیک محبوب نہ ہو جاؤں۔ (بخاری، کتاب الایمان) فقیر ہی نے عرض کیا کہ بجز اللہ عام مسلمان بھی سرکار کائنات ﷺ کے متعلق محبت کی اس دولت سے سرفراز ہیں، جس کی دلیل یہ ہے کہ ماں باپ کی توہین کو تو مسلمان ایک حد تک برداشت کر لیتا ہے، زیادہ سے زیادہ گالیوں کے جواب میں وہ بھی گالیوں پر اتر آتا ہے، لیکن رسالت مآب ﷺ کی بلکی سی سبکی بھی مسلمانوں کو اس حد تک مشتعل کر دیتی ہے کہ ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں، آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ لوگ جان پر کھیل گئے۔ اس پر حضرتؒ نے فرمایا کہ بے شک ہوتا یہی ہے، جو تم نے کہا، لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تہہ تک تمہاری نظر نہیں پہنچی، محبت کا اقتضایہ ہے کہ محبوب کی مرضی کے آگے ہر چیز قربان کی جائے، لیکن عام مسلمانوں کا جو برتاؤ آنحضرت ﷺ کی مرضی مبارک کے ساتھ ہے، وہ بھی ہمارے تمہارے سامنے ہے، پیغمبر ﷺ نے ہم سے کیا کہا تھا اور ہم کیا کر رہے ہیں، اس سے کون ناواقف ہے؟ پھر سبکی آپ کی جو مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت بن جاتی ہے، اس کی وجہ سے محبت تو نہیں ہو سکتی۔ خاکسار نے عرض کیا، تو آپ ہی فرمائیں کہ اس کی صحیح وجہ کیا ہے؟

نفسیات انسانی کے اس مبصر حاذق نے فرمایا کہ سوچو گے، تو درحقیقت آنحضرت ﷺ کی سبکی میں اپنی سبکی کا غیر شعوری احساس پوشیدہ ہوتا ہے، مسلمانوں کی خودی اور انانیت مجروح ہوتی ہے، ہم جسے اپنا پیغمبر اور رسول مانتے ہیں، تم اس کی اہانت نہیں کر سکتے، چوٹ درحقیقت اپنی اسی ”ہم“ پر پڑتی ہے، لیکن مغالطہ ہوتا ہے کہ پیغمبر ﷺ کی محبت نے ان کو انتقام پر آمادہ کیا ہے، نفس کا یہ دھوکہ ہے، اپنی جگہ ٹھنڈے دل سے جو غور کرے گا، اپنے طرز عمل کے تناقض کے اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے، بہر حال محبوب کی مرضی کی جسے پروا نہ ہو، اذ ان ہو رہی ہے اور لایعنی اور لا حاصل گیوں سے بھی جو اپنے آپ کو جدا کر کے مؤذن کی پکار پر نہیں دوڑتا، اسے انصاف سے کام لینا چاہئے کہ محبت کا دعویٰ اس کے منہ پر کس حد تک چھبتا ہے۔

امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کے درس میں

جب دارالعلوم دیوبند میں دورہ حدیث کے لیے داخلہ لیا، تو صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ ہفتہ، یا ہفتہ سے زیادہ دن گزرے کہ درس کا اعلان ہوا، معلوم ہوا کہ کل سے دورہ کے اسباق شروع ہوں گی، کتابیں جن کے اسباق شروع ہونے والے تھے، کتب خانہ سے برآمد کر لی گئی تھیں، صبح کی نماز کے بعد ہی معلوم ہوا کہ سب سے پہلے حضرت سیدنا الامام الکشمیریؒ کے یہاں صحیح مسلم کا سبق شروع ہوگا، طلباء کا ہجوم تھا، انہی کے جھیلے میں خاکسار بھی نو درہ کی چھت کے شمالی سمت پر جو ایک کمرہ تھا، اس میں حاضر ہو گیا، اتنی بڑی تعداد والی جماعت میں شریک ہو کر بیٹھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا، خیال آتا ہے کہ صحیح مسلم کا اتفاق تو وہی نسخہ مجھے کتب خانہ سے ملا تھا، جو طول و عرض میں حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں غیر معمولی طور پر ممتاز تھا، لیکن کرتا کیا، اسی طویل و عریض کتاب کو لے کر کوٹھے پر چڑھ گیا، درس کے کمرے میں لکڑی کی چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھی ہوئی تھیں، طالب علموں نے انہیں تپائیوں پر قبضہ کر لیا، ایک تپائی میرے حصہ میں بھی آئی۔

خیال تھا کہ جیسے عام طور پر ہمارے مدارس کا دستور ہے، طلباء کتاب کی عبارت پڑھیں گے، اور حضرت شاہ صاحب پھر اس عبارت کا مطلب بتائیں گی، لیکن پہلی مرتبہ درس کے ایک نئے طریقے کے تجربہ کا موقع میرے لئے یہ تھا کہ بسم اللہ بھی کتاب کی شروع نہیں ہوئی تھی کہ علم کا ایک بحر بیکراں (بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) میرے دل و دماغ کے ساحلوں سے نکرانے لگا، ایسے اساتذہ (غفر اللہ لہم) سے پڑھنے کا موقع ملا تھا، جو کتاب کو شروع کراتے ہوئے غیر ضروری طور پر اس قسم کی عام باتوں کا تذکرہ عموماً کیا کرتے ہیں کہ مصنف نے خدا کی حمد سے کتاب کیوں شروع کی، اور اسی عام سوال کو اٹھا کر اس کا جو مقررہ جواب کتابوں میں لکھا ہے، لفظوں کے الٹ پھیر سے دہرانے کے عادی تھے، صلوة کی شرح، مختلف امور کی طرف اس لفظ کا انتساب، اس کے معانی میں کن تبدیلیوں کو پیدا کرتا ہے، الغرض مسلمان مصنفوں کی کتابوں کے دیباچے کے عمومی اجراء کے

متعلق سوال و جواب، رد و قدح کا موروثی سرمایہ، حواشی و شروع میں جو منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے، اسی کو غریب طالب علموں پر پیش کر کے اپنی علمی وسعت کو ظاہر کرتے تھی، لیکن الامام لکشمیری نے قبل اس کے کہ کتاب کا کوئی لفظ بھی شروع ہوا ہو، ایک خاص قسم کی دلکش ترنم آمیز آواز میں تقریر شروع کی، کس کس موضوع سے اس تقریر کا تعلق تھا، تقریباً چالیس سال کے بعد اس کا دہرانا آسان نہیں ہے، لیکن بعض انقلابی تاثرات کا نشان حافظہ پر جہاں تک خیال کرتا ہوں، اب بھی باقی ہی۔

شاہ صاحب کے درس کے انقلابی تاثرات

جاننے والے جانتے ہیں کہ صحیح مسلم کی خصوصیت یہ ہے کہ بطور مقدمہ کے شروع کتاب میں امام مسلم نے حدیث کے بعض بنیادی کلیات اور اساسی اصول و نظریات کی طرف سیدھے سادھے الفاظ میں ایسے بلخ و عمیق اشارے کئے ہیں، جن کے صحیح وزن کو گونف سے ناواقف آدمی محسوس نہیں کر سکتا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ امام مسلم کے بعد یوں تو اصول حدیث میں بڑی چھوٹی بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن باوجود اس کے امام مسلم کے مقدمہ میں اب بھی پانیوالے اس علم کے ایسے اہم نکات اور حقائق کو پاتے ہیں، یا پا سکتے ہیں، جو شاید دوسری کتابوں میں نہیں مل سکتی، حق تعالیٰ کے افضال بے پایاں میں ایک بڑا فضل اس شورہ بخت سیاہ کار کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ حدیث ہی نہیں، بلکہ اصول حدیث کے ان چند اوراق کے پڑھنے ہی کا نہیں، بلکہ ان اوراق پر ایک امام کے عالمانہ خطبات کے سننے کا شرف اس بے بضاعت کے لئے آسان کیا گیا، پہلے ہی سبق میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں میں حاصل ہونے والے معلومات کا ایک میرے سامنے آگئی، اس وقت تک میرا تاثر یہ تھا کہ قرآن کے سوا، بجز گنتی جنی روایتوں کے صاحب شریعت کی طرف قطعی یقین اور کامل اطمینان کے ساتھ کہ امر کا انتساب کیا جا سکتا، گویا دین کا اکثر حصہ صرف ظنی، اور یقین کی قوت سے محروم ہے، یہ پہلا دن تھا، جب میرے کانوں نے اسناد والے تو اتر کے سوا، تو اتر طبقہ، تو اتر عمل، تو اتر مشتمل کی نئی قسموں کو سنا، سمجھایا گیا کہ چند روایتوں کے متعلق جس تو اتر کا دعویٰ عام کتابوں میں کیا جاتا ہے، یہ دعویٰ صرف اسناد والے تو اتر کی حد تک محدود ہے، ورنہ دین کا بڑا اہم حصہ

تو اثر طبقہ، تو اثر عمل اور تو اثر قدر مشترک کی راہ سے منتقل ہو کر مسلمانوں کی پچھلی نسلوں میں اگلی نسلوں سے پہنچا ہے، اور تو اثر کی ان تمام قسموں میں یقین آفرینی کی وہی نفسیاتی اور منطقی قوت ہے، جو قوت اسناد والے تو اثر میں پائی جاتی ہے۔^۱

پہلا دن تھا جس میں قرآن کے بعد دین کا سارا بنیادی نظام میرے لئے لے قطعاً و یقیناً ہو گیا اور جیسے جیسے تمیز و شعور میں سن کے لحاظ سے اضافہ ہوا، بجائے گھٹنے کے میرا یہ تاثر گہرا ہے ہوتا چلا گیا، خاکسار نے اپنی مختلف کتابوں اور مقالات میں امام کشمیری کی عطا کی ہوئی اس روشنی سے استفادہ کیا، مسلمانوں کے دینی اختلافات کی نوعیتوں میں تمیز کا سلیقہ اسی انورنی تحقیق سے پیدا ہوا۔

نئی تعبیرات، نئے الفاظ

حضرت شاہ صاحب یوں تو فطرۃ ادیب تھے، اسی لئے اردو زبان جوان کی مادری زبان نہ تھی، چاہتے تو اس زبان کے بہترین ادیب و خطیب کی شکل میں اپنے آپ کو نمایاں فرما سکتے تھے، لیکن مسلسل عربی کتابوں کے مطالعہ اور ادب عربی کی دوامی مزاولت کا اثر تھا کہ زبان مبارک پر عربی زبان کے الفاظ ہی زیادہ تر پڑھ گئے تھے، بلکہ طریقہ بیان بھی آپ کا عربی طرز بیان سے زیادہ متاثر تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ گو تعلیمی و تدریسی زبان آپ کی اردو تھی، لیکن عربی زبان کے ایسے الفاظ جو اردو میں عموماً مستعمل نہیں ہیں، اضطراباً آپ کی زبان مبارک سے مسلسل نکلتے رہتے تھے، تو اثر کے مذکورہ بالا اقسام چہار گانہ کو بیان کرتے

۱..... واقعہ یہ ہے کہ سند کی کثرت اور راویوں کے تعدد کی ضرورت عموماً انہی باتوں میں ہوتی ہے، جو روایات کی راہ سے منتقل ہوتی ہوں، لیکن (ایسی بات کہ شاہجہاں بادشاہ ہندوستان کا حکمران تھا، سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا، اس قسم کے واقعات کے متعلق یہ تلاش کرنا کہ روایت کرنے والے ان کے کون ہیں، جنون کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح اس قسم کی باتیں کہ مسلمانوں پر، مثلاً پانچ وقتوں کی نمازیں فرض ہیں، عرب میں الکعبہ نامی عمارت کا حج فرض ہے، سال میں رمضان کا مہینہ جب آئے، تو روزہ مسلمانوں کو رکھنا پڑتا ہے، یہ ایسی باتیں ہیں، جنہیں مسلمان ہی نہیں، جو مسلمان نہیں ہیں، ان کے نزدیک بھی اسلام کے یہ یقینی عناصر ہیں، یہی تو اثر عمل کی مثالیں ہیں، اسی طرح حاتم کی سخاوت، رستم کی شجاعت کے جو قصے مشہور ہیں، ان قصوں کا یقینی ہونا ضروری نہیں، لیکن ان قصوں کے قدر مشترک کے ہونے میں کون شبہہ کر سکتا ہے۔ حضرت الاستاد العثماني مولانا شبیر احمد صاحب نے بھی صحیح مسلم میں تو اثر کی ان قسموں کا ذکر کر کے اعتراف کیا ہے کہ پہلی دفعہ مولانا اور شاہ سے بات سننے میں آئی۔

ہوئے شاہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی زبان مبارک سے پہلی دفعہ میں نے طبقہ بعد طبقہ کے عام الفاظ کے ساتھ جیلا بعد جیل کے الفاظ سنے تھے، اس کی غرابت کا احساس اب بھی میرے حافظہ میں زندہ ہے، شاید اسی موقع پر ”الکافہ عن الکافہ“ یا ”الکواف عن الکواف“ ابن حزم کی مخصوص اصطلاح بھی سننے میں آئی۔

اسی قسم کے غیر مشہور، یا اردو زبان میں جو الفاظ عربی کے مردوح نہ تھے، ان کے استعمال کرنے کی غرض ممکن ہے کہ یہ بھی ہو کہ عام مسلمانوں کو نہ سہے، لیکن عربی مدارس کے طلباء کا ان الفاظ سے مانوس ہونا، ان کی شان کے مناسب تھا اور شاہ صاحب شاید اس طریقہ سے طلباء کو ان عالمانہ اصطلاحات و تعبیرات سے مانوس بنانا بھی چاہتے تھے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دفعہ شاہ صاحب نے ان غریب اصطلاحات کے استعمال کی توجیہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ بعض چیزیں دنیا میں ایسی ہیں، جن کا ذکر کنائے اور اشارے ہی میں کرنا، عام انسانی تہذیب کا اقتضاء ہے، پھر یہ نکتہ بھی ان ہی سے سننے میں آیا اور بالکل صحیح بات تھی کہ تراشنے والے ان چیزوں کی تعبیر کے لیے اچھے اچھے الفاظ تراش لیتے ہیں ”پائین خانہ“ مکان کے پچھلے حصے کو کہتے ہیں، پھر اس سے بیت الخلاء مراد لینے لگے، لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ پانچخانہ کی شکل اختیار کر کے خود گندہ ہو گیا، فرماتے تھے کہ معانی کی گندگی رفتہ رفتہ الفاظ تک منتقل ہو کر پہنچ جاتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ تھوڑے تھوڑے دن بعد اس قسم کے الفاظ پر نظر ثانی کی جائے، اپنے اسی خیال کے مطابق عورتوں کے ایام کی تعبیر وہ ہمیشہ ”ایام طمث“ استعمال کرنے کے عادی تھے، کیونکہ ”حیض“ کا لفظ حالانکہ خود کنائی تعبیر ہے، لیکن کثرت استعمال نے اس کو بھی اس قابل نہیں رکھا کہ مہذب مجلسوں میں اس کے استعمال کو آئندہ جاری رکھا جائے۔

بہر حال پہلے دن کے درس میں علاوہ معانی کے نئے نئے عربی الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ میرے دماغ میں شاہ صاحب کے درس کے اندر جمع ہو گیا۔

زبان عربی میں ضبط تقریر

ان کے بیان کی خصوصیت کا ایک غیر شعوری اثر مجھ میں یہ پیدا ہو رہا تھا کہ عربی زبان میں اب تک کسی مطلب کے ادا کرنے کی ہمت مجھے نہ ہوئی تھی، لیکن سبق پڑھ کر جب قیام

گاہ پر آیا اور شاہ صاحب کے عطا کئے ہوئے گونا گوں معلومات کا جائزہ لینے لگا، تو یہ محسوس ہوا کہ اپنے کمزور حافظہ سے امید نہیں کہ ان بتائی ہوئی باتوں کو وہ یاد رکھے، اس لئے فیصلہ کیا کہ کل سے کاغذ پینسل ساتھ لیتا جاؤں گا اور ان کی تقریر کو قلم بند کروں گا اور آج جو کچھ سن کر آیا ہوں قبل اس کے کہ وہ مرے حافظہ سے نکل جائے، اسے لکھ لینا چاہئے۔ شاہ صاحب کی تقریر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اس کا اسلوب ہی ایسا تھا کہ بجائے اردو کے ان کے معلومات کا مجھے محسوس ہوا کہ عربی میں قلم بند کرنا شاید زیادہ آسان ہے، یہی سوچ کر جو کچھ آج سن کر آیا تھا، پینسل سے ان کو عربی عبارت میں نوٹ کرنے لگا اور پہلی دفعہ مجھے یہ اندازہ ہوا کہ غلط سلط سہی، لیکن ٹوٹی پھوٹی عربی میں مطالب کے قلم بند کرنے کا رواج نیا رواج نہ تھا، حضرت مولانا گنگوہی کی تقریر بعض لوگوں کے پاس مکتوبہ شکل میں پائی جاتی تھی، اسی طرح حضرت شیخ الہند کی بھی ترمذی والی تقریر متعدد بزرگوں کی مرتب کی ہوئی طلباء میں پھیلی ہوئی تھی، لیکن میں جہاں تک جانتا ہوں، حضرت الامام لکھنوی کی تقریروں کے قلمبند کرنے کا ارادہ شاید فقیر سے پہلے کسی صاحب نے نہ کیا تھا، یوں ہی عربی زبان میں حدیث کی تقریروں کی تعبیر کی روایت مجھ تک نہیں پہنچی تھی، خدا کا شکر ہے کہ اس فقیر کے بعد اس سے کہیں زیادہ لائق و فائق، قابل و فاضل، مستعد اور جفاکش محنتی طلبہ حضرت شاہ صاحب کے ارد گرد جمع ہو گئے، جنہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ قرار دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، معارف انوریہ کے اس بحر بیکراں کو قید تحریر میں لانے کی کوشش کی جائے۔ مولانا بدر عالم میرٹھی، اور مولانا محمد یوسف البنوری (متعنا اللہ بطلوہ بقائہما) کے سوا پنجاب کے ایک بزرگ مولانا محمد چراغ جامع تقریر ترمذی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے سوا سنن ابی داؤد اور ابن ماجہ کے متعلق بھی حضرت شاہ صاحب کے درسی افادات کے جمع کرنے کی توفیق خاکسار کے بعد مختلف افراد کو بخشی گئی، جہاں تک میں جانتا ہوں ان صاحبوں نے بھی بجائے اردو کے عربی زبان ہی کو تعبیر کے لیے اختیار فرمایا، جیسا کہ میں نے عرض کیا حضرت شاہ صاحب کے طرز بیان اور طریقہ تدریس کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ اردو سے زیادہ عربی زبان ہی میں ان کی تقریروں کا قلم بند کرنا آسان معلوم ہوتا تھا، ویسے نہیں ہے، یا ازیں قبیل اردو کے عام افعال کے سوا الفاظ کا بڑا ذخیرہ ان کی تقریروں میں

عربی کا ہی ہوتا تھا، کم از کم فقیر کا احساس تو یہی ہے اور اسی چیز نے خود مجھ میں یہ جسارت پیدا کی کہ پہلے عربی عبارت کے لکھنے کی مشق و عادت کا موقع حالانکہ اپنی تعلیمی زندگی میں نہ ملا تھا، لیکن الامام لکھنوی کے صفِ نعال میں شریک ہو جانے کا اثر تھا کہ روزانہ تین تین چار چار ورق، بلکہ کبھی اس سے بھی زیادہ برجستہ قلم عربی میں ان کی تقریروں کو لکھ لیا کرتا تھا۔

نوشتہ درس کی گمشدگی

اس کا افسوس ہے کہ ظلم کرنے والوں نے مجھ پر ظلم کیا اور زندگی کے اس مسودہ کو جو جان سے زیادہ عزیز تھا، کسی صاحب نے اس سے مجھے محروم کر دیا، جب اس کا خیال آتا ہے، تو بے ساختہ حضرت مجددؒ کے مکتوبات شریفہ کا مشہور شعر

آنچه از من گم شدہ گراز سلیمان گم شدلے
ہم سلیمان ہم پری ہم ابرمن بگر یستے
(جو کچھ مجھ سے گم ہوا ہے، اگر وہ سلیمان سے گم ہوا ہوتا، تو سلیمان بھی، پری بھی اور دیوبھی سب رو پڑتے) یاد آتا ہے۔

میرے پاس زمانے تک کئی سو صفحات کی یہ تقریر موجود تھی، جلد بند ہوائی گئی تھی، حضر سفر میں ساتھ رہتی تھی، اچانک ایک دن تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ کسی نے اڑالی (فقیر کے رفقائے درس میں سے دو صاحب، ایک تو بخارا کے ملا عبدالحکیم اور دوسرے در بھنگہ کے مولانا عبد الرحیم دونوں البزنا میری مرتبہ تقریر کو روزانہ نقل کر لیا کرتے تھے اور ان دونوں کے پاس بھی مجلد شکل میں یہ تقریر موجود تھی، بخاری صاحب بیچارے کے متعلق تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں ہیں، اس دنیا میں ہیں بھی، یا عالم آخرت کی طرف منتقل ہو گئے، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جب بخارا جاؤں گا، تو یہی تقریر تیری یاد کو تازہ رکھے گی، بڑے نیک شریف بزرگ تھے۔ ”گذر پلاؤ“، ”بھی نبی نوش“، ”کر خاص فقیر“ کے لئے پکاتے تھے، بڑا لذیذ پلاؤ ہوتا تھا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ مولانا عبد الرحیم صاحب کے پاس بھی وہ تقریر محفوظ ہے، یا نہیں، شاید ستار العیوب کا لفظ خفی بھی اس تقریر کے گم ہونے میں کار فرما ہو، کیوں کہ لکھنے کی حد تک فقیر نے نگاہ نہ رو لیا تھا، لیکن معنوی اور لفظی غلطیوں کے انبار کے سوا جہاں تک میرا اندازہ ہے، شاید وہ نوشتہ اور کچھ نہ تھا اور نہ اس کے سرا کچھ اور ہو سکتا تھا، کون کہہ سکتا ہے کہ اپنی

رسوائی اس کے باقی رہ جانے کی صورت میں کیسی اور کہاں تک پہنچتی۔

سچ تو یہ ہے کہ فقیر کے بعد ترمذی اور بخاری شریف کی المائی شرح ”فیض الباری“ مرتبہ مولانا بدر عالم میرٹھی اور اس کے ساتھ مجلس علمی ڈابھیل حضرت شاہ صاحب کے دوسرے افادات کو شائع کر کے محفوظ نہ کر دیتی، تو خدا ہی جانتا ہے کہ اپنی اس ٹوٹی پھوٹی، شکستہ اور پراگندہ تقریر کے گم ہو جانے کا اثر مجھ پر کیا مرتب ہوتا، لیکن حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مشہور قرآنی قانون:

فاما الزبد فيذهب جفاء و اما ما ينفع الناس فيمكث

في الارض (الرعد)

لیکن جھاگ، سوسو کہ کر ختم ہو گیا اور لوگوں کو جس سے نفع پہنچتا ہے، وہ ٹھہر

گیا زمین میں۔

کی عملی تفسیر اس باب میں میرے سامنے آگئی، جو چیز مٹنے اور گم ہونے کی مستحق تھی، وہ گم ہوگئی، لیکن واقعی منافع للناس کی جن چیزوں میں ضمانت تھی، قدرت کی طرف سے اس کے باقی رکھنے کا ایک استوار و محکم نظم کر دیا گیا، جس وقت خاکسار نے اپنی المائی ہوئی تقریر کو قلم بند کرنا شروع کیا تھا، اس زمانے میں اس کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، حق تعالیٰ نے اپنے بعض خاص مخلص بندوں کے دل میں معارف انوریہ کی صحیح قدر و قیمت کا

..... یہ فقیر کے کرم فرما میزبان کریم مولانا محمد موسیٰ الجوبانسری الافریقہ ثم الباکستانی ہیں۔ شاید اپنے نام کا اظہار ان پر اب بھی گراں گزرے، لیکن ”والله مخوج ما كنتم تكتمون“ کے لاہوتی قانون کو وہ کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں، حدیث بھی تو ہے: (لو ان رجلاً عمل عملاً في صحرة صماء لآباب فيها ولا كوة، خوج عمله السی الناس كائناتاً ما كان) (رواہ احمد والحاکم وصحیح) پھر یہ تو عمل مخفایا و مجلسہا کا عمل ہے، راز نہاں بن کر کیسے رہ سکتا ہے...؟ حقیقت تو یہ ہے کہ الامام الکشمیری کا حلقہ تلامذہ اگرچہ کافی وسیع و عریض ہے، لیکن ستاد ہدایا و دلا بلکہ شفا و صوره یا زیادریا ان سے قریب مولانا محمد بن عیسیٰ کو میں نے پایا، فنایت کی یہ کیفیت دوسروں میں کم از کم مجھے تو نہ ملی، ”نعم المال الصالح للعبد الصالح“ کی شرح بھی جو بانسریگ کے التاج الامین ہی کے قالب میں میرے سامنے پہلی دفعہ پیش ہوئی، ان کی ذرہ نواز یوں کو میں بھلا نہیں سکتا۔ مہمانی کا شرف چند دنوں کے لئے اس فقیر کو جب حاصل ہوا تھا، تو انہیں کو نہیں، ان کے گھر کے ارکان، بلکہ نوکروں اور ملازموں میں بھی اکرام ضیف کے بہترین سلیقہ کا تجربہ ہوا تھا۔ فیض الباری، بخاری کی شرح کشمیری اور اس کے طفیل میں امام ذیلیعی کی تخریج ہدایہ دونوں کتابیں فقیر تک مولانا نے موصوف کے بدلہ دنوال کے توسط سے پہنچیں۔ فجزاه اللہ عنہما خیر الجزاء۔

احساس پیدا کیا، بخاری کی المائی شرح فیض الباری کے مسودے کو لے کر ایک صاحب مصر بھیجے گئے اور مصر میں قیام کر کے اس عزیز الوجود گرامی منزلت کتاب کو بہترین کاغذ پر روشن اور مجلی ٹائپ کے حروف میں طبع کرا کے واپس آئے، شاہ صاحبؒ کے وہی افاداتِ قیمہ جن کے متعلق اندیشہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے احاطہ ہی میں خدا نخواستہ گم ہو کر ختم ہو جائیں گے، چاہنے والے نے جب چاہا، تو اسلامی دنیا کے مشارق الارض و مغاربہا کے آخری حدود تک ان کو پہنچا دیا اور کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کی آئندہ کتنی نسلیں سرزمین ہند کے ان علمی انکشافات سے مستفید اور تمتع پذیر ہوتی رہیں گی۔ قابل رشک ہیں وہ لوگ جنہیں اس علمی مہم کی مختلف منزلوں میں حصہ لینے کی توفیق بخشی گئی، تاہم میرا یہ مظنہ اگر صحیح ہے کہ اپنی ساری کوتاہ نصیبوں کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کی درسی تقریروں کی قلمبندی کے سلسلے میں تقدم اور سبقت کی نعمت سے ابتداء وہی دیوانہ سرفراز ہوا تھا، جس کا جنون اس علمی امانت کے بار کا تحمل نہ ہو سکا، تو ارادی نہ سہی، اضطراری سعادت سے چاہیے تو یہی کہ اسے بھی محروم نہ ٹھہرایا جائے، جب ورتا غیض ایکہ (بکائن کی شاخ پر کو کو کرنیوالی فاختہ) کے فضل تقدم کا اعتراف کرتے ہوئے عرب کے شاعر نے کہا تھا اور چڑیا تک کے متعلق انسانوں نے اقرار کیا:

ولکن بکت قبلی فہیج لی البکاء بکاہا فقلت الفضل للمتقدم

”لیکن فاختہ مجھ سے پہلے روپڑی، اس کے رونے سے مجھ پر گریہ طاری ہوا، اس لئے میں نے مان لیا کہ برتری اسی کو حاصل ہوئی جس نے سبقت کی۔“

شاید کہنے والا کہہ سکتا ہے:

میں جو رویا تو روپڑی دنیا

شور سے اپنے شور ہے برپا

بہر حال بقول شخص:

عشق سے ہوں گئے جن کے دل آباد

قیس مرحوم کو کریں گے یاد!

اور میں ممنون ہوں کہ بخاری کی الملابی شرح فیض الباری کے مقدمہ میں صحیح مسلم کی گمشدہ میری الملابی تقریر کا ذکر کر دیا گیا ہے، جزا ہم اللہ عنی خیر الجزاء۔

(آپ بیتی سے ماخوذ مضمون)

استاد محترم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمۃ

دارالعلوم کے اساتذہ میں سے تیسرے استاذ جن سے خاکسار کو غیر معمولی استفادہ کے موقع میسر آئے، وہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کی ذاتِ بابرکت ہے، دارالعلوم ہی میں نہیں، بلکہ زندگی میں جن بزرگوں کے تلمذ کا شرف فقیر کو مختلف ادوارِ حیات میں حاصل ہوتا رہا ہے، ان میں جہاں تک سوچتا ہوں، شاید سب سے زیادہ میرے نو عمر استاذ مولانا عثمانی قدس سرہ تھے۔ جس زمانے میں ان کے حلقہٴ درس میں شریک ہوا، مولانا کی عمر غالباً اس وقت تیس، پینتیس سال کے درمیان تھی، بمشکل مجھ سے آٹھ دس سال عمر میں وہ بڑے ہوں گے، لیکن یہ خدا کی دین تھی کہ اس عمر میں وہ دارالعلوم کے صفِ اول کے اساتذہ میں شریک ہو چکے تھے اور دورہٴ حدیث کی اہم ترین کتاب ”سنن ابی داؤد“ کا درس انہیں سے متعلق تھا۔

یوں تو مولانا عثمانی کے نام سے دارالعلوم میں حاضر ہونے سے پہلے بھی کچھ نہ کچھ آشنا ہو چکا تھا، ٹونک میں بعض طلباء دارالعلوم سے ہو کر پہنچتے تھے، ان کے علم و فضل کا ذکر غیر معمولی امتیاز کے ساتھ کرتے تھے، اس خصوصیت کے ساتھ کہ دینی علوم کے علاوہ عقلیات میں، انہیں طالب علموں سے معلوم ہوا تھا کہ مولانا غیر معمولی شہرت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ بھی جانتا تھا کہ باوجود نو عمری کے مدرسہٴ فتح پوری میں صدر مدرس کے عہدے کے لیے بھی ان کا انتخاب ہوا تھا اور دلی جیسی مرکزی آبادی میں چند ہی دنوں میں مولانا کی تقریر و تحریر کا دائرہ وسیع ہونا چلا گیا۔

میری نظر سے ”القاسم“ کے بعض شمارے بھی گزرے تھے، جن میں مولانا عثمانی کے بعض مقالات شائع ہوئے تھے، تحریر میں ان کا رنگ عام مولویوں سے نیا تھا، شاید ایک حد تک یہ کہنا صحیح ہے کہ دیوبندی حلقے کے علماء میں مولانا شبیر احمد عثمانی پہلے بزرگ تھے، جن کی

انشاء و تحریر میں عصری تقاضوں کی رعایت پائی جاتی تھی۔

سنن ابی داؤد کا پہلا درس

بہر حال دارالعلوم میں داخل ہونے سے پہلے میری معلومات مولانا کے متعلق بس انہی حدود تک محدود تھیں، دفتر سے جو اطلاع دورہ کے اسباق کے متعلق شائع ہوئی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ ”سنن ابوداؤد“ پڑھنے کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانی کے درس میں حاضر ہونا پڑے گا، وقت ظہر کے بعد کا تھا، طالب علموں کے ساتھ خاکسار بھی اس حلقہ میں جا کر بیٹھ گیا، نورہ کے جنوبی حصے میں دیکھا کہ ایک نوجوان طالب علموں کے درمیان بیٹھا ہوا ہے، یہ یاد نہیں کہ کوئی حدیث شروع ہوئی تھی، یا نہیں کہ ایک طویل تمہیدی خطبہ مولانا نے شروع کیا، ان کے بولنے کا طرز حد سے زیادہ سنجیدہ، خطاب کا طریقہ غیر معمولی طور پر دل آویز تھا، چند ہی لمحات کے بعد محسوس ہوا کہ کچھ نئی باتیں کان میں پڑ رہی ہیں۔

قاسمی نظریات و معارف

اس وقت تک سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی کسی کتاب، یا تحریر کے پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا، حضرت مولانا عثمانی نے جیسا کہ بعد میں پتہ چلا کہ اپنی خداداد ذکاوت و ذہانت کی مدد سے قاسمی نظریات و معارف کو گویا دینی تفہیم کا ایک مستقل نظام ہی بنا لیا تھا، حضرت نانوتوی کے خصوصی افکار کو عصری تعبیروں میں پیش کرنے کی غیر معمولی مہارت ان کو حاصل تھی، نئی باتیں درحقیقت وہی تھیں، جن کے متعلق مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ حضرت مولانا عثمانی سے پہلے میں نے کسی سے نہ سنی تھیں اور نہ کسی کتاب، یا مضمون میں اس کا سراغ ملا تھا، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے درس کا یہ حصہ میرے لئے حد سے زیادہ دلچسپ اور لذیذ ثابت ہوا، مولانا جس طریقے سے ان چیزوں کو ادا کرتے تھے، ان میں بڑی حلاوت اور شیرینی تھی، جہاں تک خیال آتا ہے حلقہ درس میں طالب علموں کی تعداد اسی، پچاسی، سے متجاوز تھی، ان ہی کے مجمعے میں گھسا ہوا گوشہ میں بیٹھ کر مولانا کی باتیں سنا کرتا تھا، یہ باتیں ایسی دلنشین ہوتی تھیں اور کچھ ایسے منطقی تسلسل کے ساتھ مولانا ان کو بیان کرتے تھے کہ ان کو نوٹ کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی تھی، وہ

فرماتے جاتے تھے اور حافظہ میں خود بہ خود ان کی جگہ بنتی جاتی تھی، شاید ایک ہفتہ، یا اس سے کچھ زیادہ مدت گزری ہوگی، یوں ہی طلباء کے ساتھ مولانا کے حلقہٴ درس میں آکر بیٹھا کرتا تھا، ذاتی طور پر مولانا سے تعارف (کوئی صورت پیش نہ آئی تھی)۔

ذاتی تعارف

میرا خیال یہی تھا کہ طلبہ کے اتنے بڑے مجمع میں وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے کہ مجھ جیسے ایک کس پیرس طالب علم پر امتیازی نظر مولانا کی پڑے گی، اب میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی تقریر کی سماعت میں غیر معمولی انہماک نے ان کو متنبہ کیا، یا ممکن ہے درس میں ایک دو بات استفادہٴ خاکسار نے جو دریافت کی تھیں، اس کا نتیجہ تھا، بہر حال اسباب سے آج تک ناواقف ہوں، لیکن اسی عرصہ میں ایک واقعہ عجیب پیش آیا۔

ہمارے دوست مولوی احسان اللہ تاجور مرحوم، جو بعد میں اردو زبان کے ممتاز شعراء میں شمار کئے گئے، شمس العلماء کے خطاب سے بھی حکومت نے سرفراز کیا تھا، یہ بھی اسی زمانے میں دارالعلوم میں تھے، ان کا دورہ ختم ہو چکا تھا، گویا فارغ التحصیل ہو چکے تھے اور آئندہ مستقبل کا پروگرام بنا رہے تھے، شعر و شاعری کا ذوق طالب علمی ہی سے رکھتے تھے، طالب علموں میں ان کے اشعار کا اچھا خاصا چرچا اسی زمانے میں پھیلا ہوا تھا، ادبی ذوق کے اشتراک کی وجہ سے مجھ میں اور ان میں مراسم ابتداء ہی سے قائم ہو گئے تھے۔

بہر حال یہی بیچارے تاجور مرحوم ایک دن میرے پاس آئے اور بولے کہ آج میں مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، انہوں نے فرمایا کہ دورہ کے طالب علموں میں مناظر احسن نامی جو طالب علم ہیں، ان تک میرا پیغام پہنچا دو کہ میں ان سے ذاتی طور پر ملنا چاہتا ہوں، تاجور مرحوم سے میں یہ سنتا جاتا تھا اور حیران تھا کہ اس سے زیادہ کہ طالب علموں کے رجسٹر حاضری میں اس فقیر کا بھی نام تھا اور حاضری کے وقت دوسروں کے ساتھ میرا بھی نام پکارا جاتا تھا، کسی قسم کا کوئی تعارف مولانا سے میرا نہیں ہے، پھر انہوں نے اپنی خصوصیت کے ساتھ کیوں اس خاکسار کو یاد فرمایا؟ غالباً مغرب کا وقت تھا، رات ہو چکی تھی، میں صبح کا منتظر رہا۔

دردولت پر حاضری

دوسرے روز تا جو مرحوم سے مولانا کے دردولت کا پتہ دریافت کر کے غالباً کسی ملنے والے طالب علم کی رہنمائی میں خدمت والا میں حاضر ہوا، مولانا کو دیکھا کہ متبسم ہیں، سلام کر کے بیٹھ گیا، خود ہی فرمایا کہ زورہ کے سبق میں تم بھی آتے ہو، اگرچہ زیادہ دن نہیں گزرے ہیں۔ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کسی سے آدمی کو محبت ہو، تو اس کو مطلع کر دے، میں نے اسی لئے آپ کو طلب کیا تھا، تاکہ رسول ﷺ کی اس حدیث کے مطابق آپ کو مطلع کر دوں، اپنے دل میں آپ کی محبت پاتا ہوں۔

اپنی بیچ میرزی، کس پرسی، جہل و نادانی کو دیکھتے ہوئے مولانا غفر اللہ کی زبان مبارک سے یہ باتیں سنتا جاتا تھا اور بے ساختہ آنکھوں سے آنسو نکلتے آتے تھے، کچھ اتنا مبہوت تھا کہ جواب میں شاید کچھ عرض نہ کر سکا، شاید عدم حاضری کی تفسیر کی معافی چاہی گئی، کچھ دیر بیٹھ کر واپس مدرسہ چلا آیا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی کی زندگی میں انقلاب

اب مولانا سے براہ راست ذاتی واقفیت پیدا ہو چکی تھی، درس ان کا جاری تھا، درس کیا تھا ان کے خطبات تھے، جن کا سلسلہ تقریباً ایک مہینہ کے قریب جاری رہا، اصل کتاب کی چند ہی حدیثیں پڑھی ہوں گی کہ اچانک حضرت کی زندگی میں ایک نیا انقلاب شروع ہوا۔

ہوا یہ کہ مولانا کا یہ درس جاری تھا، خاکسار بھی کبھی دردولت پر حاضر ہو جاتا تھا، میرے ساتھ بہار ہی کے ایک اور طالب علم مولانا نور الہدیٰ در بھنگہ ضلع کے رہنے والے تھے، انہوں نے کانپور کے مدرسہ الہیات میں بھی کچھ تعلیم حاصل کی تھی، جہاں تقریر و تحریر کی مشق کا ان کو بھی موقع ملا تھا اور اردو ادب کا اچھا مذاق رکھتے تھے، عمر بھی کافی تھی، دارالعلوم میں حدیث کی تکمیل کے لیے آئے تھے، وطنی اور مذاقی وحدت کی وجہ سے ہم دونوں میں خصوصی تعلقات قائم ہو گئے تھے، مولانا عثمانی کی خدمت میں ہم دونوں عموماً ساتھ ہی حاضر ہوا کرتے تھے، اب پورے طور پر یہ یاد نہیں رہا کہ ہم دونوں کو بلا کر مولانا نے کیا فرمایا، یا یہ واقعہ بعد کا ہے۔ بہر حال مولانا کے درس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ سلسلہ اس کا سچ سچ میں

زیادہ تر ناسازی طبع کی وجہ سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا، مہینہ میں ایک دو دن کا ناغہ اس زمانے میں ایک عام سی بات تھی۔ اسی عرصہ میں یہ صورت پیش آئی کہ ناغہ کا سلسلہ کچھ دراز ہو گیا، مولانا کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی، عیادت کے لیے ہم دونوں جو پہنچے، تو گو کہ کچھ کچھ جسمانی شکایت کے آثار بھی پائے جاتے تھے، لیکن ہم دونوں کو دیکھ کر اٹھ بیٹھے اور عجیب و غریب تقریر کی، جس کی پہلے سے قطعاً توقع نہ تھی۔

بجانبہ تو الفاظ کا نقل کرنا تو ناممکن ہے، لیکن خلاصہ یہی تھا کہ تعلیم کے موجودہ طریقے پر شدید تنقید کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ یہ کیا طریقہ ہے؟ پست و بلند، کس و ناکس ہر قسم کے طالب علموں کو درس کے حلقے میں شرکت کی اجازت دے دی جاتی ہے، عمومیت اور اکثریت آج کل کے طلباء کی ایسی ہے، جو صحیح معنوں میں دس فیصد بھی اپنے اساتذہ کی تقریروں سے مستفید ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے، بہت دنوں سے اس صورت حال پر غور کر رہا ہوں، اب تو میرے تحمل اور برداشت سے باہر ہو چکی ہے اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس بھیڑیا دھسان والے حلقہٴ درس سے اپنے تعلق کو منقطع کر لوں اور چند خاص طالب علموں کو پڑھانے کے لیے انتخاب کروں، کچھ ایسے لب و لہجہ میں مولانا تقریر کر رہے تھے، جس سے صاف یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مولانا مدرسہ سے ملازمت کے رشتے کو منقطع کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں، میں حیران تھا کہ یہ کیا فرما رہے ہیں؟ جو کچھ کہتے رہے، چپ چاپ سنتا رہا، آخر میں جب ہم دونوں اٹھنے لگے، تو فرمایا کہ میں نے پورے حلقہٴ درس میں سے صرف دو طالب علموں کا انتخاب کیا ہے، ایک یہی فقیر اور دوسرے مولوی نور الہدیٰ، ہم دونوں کو حکم دیا گیا کہ کل سے کتاب لے کر تم دونوں میرے گھر آ جایا کرنا، میرے لئے ان سینکڑوں طلبہ میں صرف یہی دو طالب علم کافی ہیں۔

اسی سلسلہ میں حضرت نانوتوی کے اس تعلیمی نظریہ کا بھی مولانا نے ذکر کیا تھا کہ علم کی اشاعت کی دو مستقل شکلیں ہیں، ایک کہنا، دوسری کیفا، کہنا یہ کہ اہل علم کو زیادہ سے زیادہ سے تعداد میں پھیلانے کی صورت یہی جو مدرسوں میں اختیار کی جاتی ہے، لیکن علم کی کیفیت میں اگر ترقی مقصود ہو، تو بجائے جماعتی تعلیم کے چند خاص طالب علموں کو پڑھانا چاہئے اور شخصی طور پر ان کی تربیت و پرداخت میں کوشش کی جائے۔ فرماتے کہ حضرت نانوتوی نے

مختصر سوانح حالات و خدمات

اسی اصول کے تحت خود مدرسہ میں کبھی نہیں پڑھایا، بلکہ اپنے لئے چند طلباء کو انتخاب کر لیا تھا، انہیں کو آپ نے اپنا طالب علم بنا رکھا تھا، جن میں حضرت شیخ الہند، مولانا احمد حسن امر وہی اور مولانا فخر الحسن گنگوہی، وغیرہم حضرات تھے۔

مشکلات میں غیبی امداد

الغرض تدریسی زندگی میں ایک نیا انقلابی دور تھا، جسکا آغاز بد قسمتی سے اسی زمانے میں ہوا، جب یہ فقیر دورہ میں شریک ہوا اور حضرت والا کے زیر تعلیم تھا، بد قسمتی سے اس لئے کہہ رہا ہوں کیونکہ آگے یہ قصہ بڑھا اور بہت زیادہ بڑھا، مولانا نے باضابطہ مدرسہ میں استعفیٰ داخل کر دیا، ان کے بڑے بھائی مولانا حبیب الرحمن صاحب کی طرف سے جو نایاب مہتمم تھے، بہت کچھ فہمائش کی کوششیں کی گئیں، خود بھی کہیں اور دوسروں سے بھی کروائیں، لیکن جو فیصلہ مولانا کر چکے تھے، اسی پر ڈٹے اور جمے رہے۔

ہم لوگوں کے لیے مشکل یہ تھی کہ مولانا کے حکم کی تعمیل سے گریز بھی مشکل تھا، ان کے ارشاد کے مطابق کتاب لے کر گھر پر حاضر ہوتے رہے، لیکن چند اسباق سے زیادہ انفرادی درس کا یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا، مدرسہ کی طرف سے ابوداؤد کا درس حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین کے سپرد کر دیا گیا تھا، ہم بھی اسی درس میں جا کر شریک ہو گئے اور یوں ہماری کتاب ختم ہوئی، ورنہ ابوداؤد میں یہاں تک خطرہ پیش آ گیا تھا کہ ہمارا دورہ نامکمل ہی رہ جاتا۔

مولانا کے معاش کا واحد ذریعہ ہی جامعہ کی تنخواہ تھی، اس سے دست بردار ہونے کے بعد اب کیا بتایا جائے کہ کیا صورت پیش آئی، مولانا صاحب اولاد تو نہ تھے، لیکن بہر حال گھر میں ان کی بیوی صاحبہ تھیں، خانہ داری کا نظم ان کے لیے سخت دشوار ہو گیا، لیکن باایں ہمہ مولانا یہی طے کئے ہوئے تھے کہ مدرسہ کی جس ملازمت کو چھوڑ چکا ہوں، اس کو دوبارہ اختیار نہیں کروں گا اور جب تک دارالعلوم میں فقیر کا قیام رہا، مدرسہ کی ملازمت کے تعلق سے وہ آزاد ہی رہے، یہ زمانہ مولانا پر بڑی آزمائش کا تھا، تاہم کسی نہ کسی طرح وقت گزرتا ہی رہا، ضرورتیں پوری ہوتی ہی رہیں، ان سوانح عمری میں چاہئے تو یہی تھا کہ زندگی کی اس خاص منزل کے حالات جاننے والوں سے دریافت کر کے درج کئے جاتے۔

آپ کی زوجہ محترمہ سیدہ منیرہ سے مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اور مولانا عماد الدین صاحب انصاری، جن سے اس زمانے میں مولانا کے گہرے دوستانہ تعلقات قائم تھے، وہی بتا سکتے ہیں کہ کن کن شکلوں میں غیبی امداد آپ کے سامنے آئی۔

فتح المہم کی ابتداء

اسی زمانے میں مولانا کے قلب مبارک میں صحیح مسلم شریف کی شرح کا خیال پیدا ہوا، ابتدائی کام شروع بھی کر دیا تھا، تھوڑی بہت خدمت فقیر کو بھی اس سلسلے میں دینی پڑی تھی۔ قصہ مختصر، جو کچھ ہو، مولانا عثمانی سے اس میں شک نہیں کہ کتابی تلمذ کی نوعیت اگرچہ سنن ابی داؤد کے چند اوراق ہی تک محدود رہی، لیکن حکمت قاسمی سے صرف روشناس ہی ہونے کا موقع ہی مولانا کے ذریعے نہیں ملا، بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ باضابطہ علم کے اس خاص شعبے کی تعلیم مولانا ہی سے اس فقیر کو میسر آئی، اس باب میں میرے بلا شرکت غیرے واحد معلم اور استاذ ہیں (نور اللہ ضریحہ، وجعل الجنة مثواه) دارالعلوم کے احاطہ سے باہر حیدرآباد وغیرہ میں مولانا سے تعلق قائم رہے، لیکن مضمون چونکہ دارالعلوم کی حد تک محدود ہے، اس لئے خارج از دارالعلوم کی سرگزشتوں کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے۔

دارالعلوم کا ہر تنکا پیام اصلاح تھا

واقعہ یہ ہے کہ مستفید ہونے کی حد تک اس کج راوی کج فہم کے لیے دارالعلوم کا تنکا تنکا اصلاح در ترمیم کا پیغام بنا ہوا تھا، اللہ اللہ دارالعلوم کی مقدس و پاک کی لمبی لمبی صفوں کی وہ نمازیں، جن میں خدا ہی جانتا ہے کہ اللہ کے کیسے کیسے راست باز، مخلص، وفادار بندے شریک تھے، زمین پر وہ پہچانے نہ جاتے ہوں، پھٹے پرانے کپڑے، بال الجھے ہوئے، ان سے باتیں کیجئے، تو وہ فقرے بھی بیچارے صحیح طور پر ادا کرنے کی قدرت نہ رکھتے تھے، لیکن میرے تجربات و مشاہدات مجھ پر ثابت کرتے چلے تھے کہ اللہ کے پیغمبر رسول ﷺ شاید انہی جیسوں کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ (رب اشعث اغبر مدفوع بالابواب لواقسم علی، لا برہ) او کما قال، چہروں پر گرد پڑی ہوئی، بال بکھرے

مختصر سوانح حالات و خدمات

ہوئے، انہیں دروازوں پر دھکے دیئے جانے والوں میں ایسے نفوس بھی ہیں کہ خدا کی قسم کھا کر کوئی بات کہہ دیں، تو حق تعالیٰ ان کی قسم پوری فرماتا ہے، گلیوں اور بازاروں میں جب نکلنے تو ان پر انگلیاں نہیں اٹھتی تھیں، لیکن ان کا حال ہی ایسا تھا کہ زمین والے نہ سہی، مگر۔

حوریاں رقص کنناں نعرہ مستانہ زدند

کا منظر آسمانوں پر اگر قائم ہو جاتا ہو، تو اس پر متعجب نہ ہونا چاہئے، اپنے درس کے ان رفقاء کا اب بھی جب خیال آجاتا ہے، تو آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈباجاتی ہیں، کچھ نہیں معلوم کہ وہ لوگ کہاں گئے اور کہاں رہے؟ لیکن آج بھی مل جائیں، تو جی چاہتا ہے کہ دیر تک ان کے قدموں کو چومتا رہوں، ان کے پاک قدموں کی خاک کو سر پر ملوں، آنکھوں میں اس کا سرمہ لگاؤں، الغرض دارالعلوم کا سارا ماحول میرا معلم و استاذ بنا ہوا تھا۔

مولیٰ حجام

اور تو اور اس زمانے میں ایک بوڑھا نائی تھا، جو اپنے کندا سترے سے غریب طلباء کے نازک بالوں پر ظلم توڑا کرتا تھا، اس کا اصل نام کیا تھا، اس کا تو علم نہ ہو سکا، لیکن عام طور پر ”مولیٰ“ بروزن چولی کے عرفی نام سے پکارا جاتا تھا، یہ مولیٰ حجام، حجامت اور اصلاح سازی کے کام سے زیادہ مدرسہ کے طلباء کی باسی بچی کھچی روٹیوں کی حجامت سے تعلق رکھتا تھا، صبح ہوئی اور میاں مولیٰ ہر کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر پکار رہے ہیں: ”میاں رات کی کچھ دھری پڑی رہ گئیں ہوں، تو وہ روٹیاں دے دینا“۔ دینے والے دیا کرتے تھے، خدا جانے یہ واقعہ تھا بھی، یا نہیں، لیکن مشہور یہی تھا کہ میاں مولیٰ دارالعلوم جیسے دینی ادارے سے تعلق رکھنے کے باوجود نماز سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، عمر ستر سے بظاہر متجاوز رہی ہوگی، قدرۃ طلباء نے یہ مشغلہ بنا لیا تھا کہ جہاں بچی کھچی رات کی باسی روٹیوں کے لیے میاں مولیٰ نے کسی حجرے میں منہ ڈال کر اپنی سفید طویل و عریض سفید ڈاڑھی ہلانی شروع کی کہ ہر طرف سے آواز بلند ہوتی، مولیٰ تم نماز نہیں پڑھتے؟ اس سوال کا جواب جب تک مولیٰ غریب سے حاصل نہ کر لیا جاتا، وہ لوگ اس بیچارے کو روٹی نہ دیتے، لیکن اس اعتراض کا بھلا مولیٰ حجام آیا جواب دے سکتا تھا۔ پھر بھی رہا تھا مولویوں، جی نہیں، جواب میں اس نے

یہ ترکیب نکالی تھی کہ پوچھا جا رہا ہے اس سے نماز کیوں نہیں پڑھتا، تو جواب میں کہتا کہ آمویا میں ابھی بور کہاں آئے ہیں، طالب علم کہتے کہ بھی تم نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ تو وہ جواب میں کہتا کہ برسات کے آنے میں کچھ وقفہ ہے، بازاروں میں سنگھاڑے آگئے ہاں پائیاں پکنے لگیں۔ الغرض سوال سے جن باتوں کا کسی قسم کا کوئی تعلق نہ ہوتا، مسلسل یکے بعد دیگرے ان ہی جوابوں کو پیش کرتا چلا جاتا اور اتنی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتا کہ لب پر مجال کیا کہ ہلکی سی مسکراہٹ بھی آجائے، لوگ اس کے بے جوڑ جوابوں سے تنگ آنے کے بعد روٹی کے خشک ٹکڑے جو کہیں پڑے دھرے ہوتے، اس کے حوالے کر دیتے۔

جملہء مولیہ

ہم لوگوں کے حلقے میں مولیٰ حجام کے اس خاص طریقہء جواب کی بنیاد پر ایک خاص علمی اصطلاح ہی مروج ہو گئی تھی، بحث و مباحثہ میں جہاں کسی کی طرف سے کوئی ایسا جواب پیش ہوا، جس کا سوال سے زیادہ تعلق نہ ہوتا، تو کہہ دیا جاتا کہ آپ ”جملہ مولیہ“ استعمال کر رہے ہیں، گویا اصطلاح ہی مقرر ہو گئی تھی کہ وہ جواب جس کا سوال سے چنداں تعلق نظر نہ آئے، جملوں اور فقروں کی دنیا میں وہ ”جملہ مولیہ“ یا ”فقرہ مولیہ“ بن جاتا، نو وارد طلباء اس جملہ مولیہ کا مطلب پوچھتے کہ یہ کیا بلا ہے، جملوں کے اقسام میں اس خاص قسم، یعنی: جملہ مولیہ کا ذکر تو کس نے آج تک نہیں کیا، تب کہا جاتا کہ ٹھہر جائیے، مولیٰ حجام آپ کو اس کا جواب دیں گا، وہ آتا حسب دستور نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ کے جواب میں آسمان وزمین کی سنانے لگتا اور مولیٰ حجام کے آنے تک انتظار کی زحمت جو برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہوتے، تو ان کو سمجھا دیا جاتا کہ چاول سفید ہوتے ہیں، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ دنیا گول ہے، جیسے دلیل اور دعویٰ کی اس ترتیب میں کوئی ربط نہیں، اسی طرح ہر غیر مربوط کلام اور فقرے کا نام ”جملہ مولیہ“ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جملہ مولیہ کی اصطلاح کی بدولت بعض اوقات طویل طویل تقریروں کی زحمت سے ہم لوگ بچ جایا کرتے تھے کہ یہ تو جملہ مولیہ ہوا، ایسی باتوں کی جگہ یہ کہنا کافی

ہو جاتا تھا، اصطلاح کے جاننے والے فوراً متنبہ ہو جاتے اور کلام میں ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔

ظاہر ہے کہ دارالعلوم کے اس تعلیمی ادارے میں پہنچ کر مولیٰ حجام تک کا وجود جب معلمی کا فرض انجام دیتا تھا اور کیسی معلمی؟ کہ آج بھی جملہ مولیہ یا فقرہ مولیہ کی جگہ چاہتا ہوں کوئی ایسی اصطلاح ہاتھ آجائے، جس سے وہی کام لیا جاسکتا ہو جو جملہ مولیہ سے دارالعلوم کے احاطے میں لیا جاتا تھا، کم از کم میری سمجھ میں تو ایسی اصطلاح اب تک نہیں آئی ہے، اپنے مخاطب کو جس آسانی کے ساتھ اپنا مطلب جملہ مولیہ کہہ کر سمجھا لیا جاتا تھا، شاید اتنی سہولت کے ساتھ اس منشا کو کسی دوسرے لفظ سے ہم آج بھی سمجھانے پر قادر نہیں ہیں، گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ ہماری تعلیمی زندگی میں دارالعلوم کے حجام مولیٰ میاں کا بھی ساتھ تھا، فقیر بعد میں جب کبھی دارالعلوم حاضر ہوتا، تو مولیٰ میاں کو ضرور تلاش کرتا، لیکن بیچارے کا وقت ہم لوگوں کے بعد جلد پورا ہو گیا۔ اللہم اغفر له وارحمہ.

(دارالعلوم میں بیٹے ہوئے دن)

مضمون حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی

مدرس دارالعلوم دیوبند

عشق و محبت کی بحث میں تم نے مجنون و لیلیٰ کے تذکرے پرھے، قیس و فرہادیٰ داستانیں سنیں اور یہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ رات کے وقت جب شمع روشن ہوتی ہے، تو ہزاروں پروانے اپنی چھوٹی چھوٹی ہستیتوں کو کس اشتیاق اور بے تابی کے ساتھ شمع کی لو پر نثار کرتے اور تن من کو جلا ڈالتے ہیں، لیکن تم کو غالباً کبھی ایسے پروانوں کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ہوگا، جنہوں نے شمع کی آگ میں اپنے کو اس لئے جلا ہو کہ وہ جلنے سے بچ جائیں اور اس لئے فنا کیا ہو کہ وہ پھر کبھی فنا نہ ہوں، چمن میں خاموش پھولوں کے ارد گرد سینکڑوں دفعہ بلبلوں کے چہچہے سنے ہوں گے، پر ایسا ایک واقعہ بھی نہ سنا ہوگا کہ شاہد گل تو خود چہچہا رہا اور شور مچانے والی بلبلیں ساکت و صامت رہ کر اس کے ایک ایک لفظ کو چن رہی ہوں۔

پس آؤ کہ تم کو حجاز کی سرزمین میں کے نور سے روشن کی ہوئی وہ شمع محمد دکھلائیں، جس پر لاکھوں پروانوں نے اپنی ہستیتوں کو محض اس لئے جلا ڈالا کہ وہ خدا کی سب سے بڑی دہکتی ہوئی آگ کی لپٹ سے محفوظ ہو جائیں اور اپنی چند روزہ حیات کو اس کے قدموں پر اس لئے قربان کر دیا کہ ان کو دائمی زندگی حاصل ہو۔

عرب کے خشک ریگستانوں اور بے آب و گیاہ پہاڑوں میں (خدا کی قدرت دیکھو کہ) ایک غنچے میں چمک پیدا ہوئی اور ایک ایسا پھول کھلا، جس کی مست کر دینے والی مہک کے سامنے مشک و گلاب کی بھی حقیقت نہ رہ گئی اور جب بلبلوں کے دماغوں میں اس کی مدہوش کر دینے والی خوشبو پہنچی، تو انہوں نے جمع ہو کر خوب شور مچانا شروع کیا، اس پر چمنستان نبوت کا وہ گل سرسبد گویا ہوا اور اپنے نغمہ طرب انفرادی سے سب کی زبانیں خاموش کر دیں، پھوکیا تھا بلبلیں اس کا سخن داؤدی سننے کے لئے گردنیں جھکا جھکا کر اور پرسیٹ سٹیٹ کر بیٹھ گئیں اور جو لفظ بھی اس کی زبان سے نکلا، اس کو اٹھالیا اور جو کلمہ بھی سنا، اس کو

فورا دل کی تختی پر لکھ لیا۔

میرے اس بیان کو تم محض شاعریت مت سمجھو، بلکہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پڑھو اور آپ کے ساتھ ان کے شغف اور تعلق کا اندازہ لگاؤ، تو تم کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ وہ آپ کے اصحاب بھی تھے اور شاگرد بھی، عاشق جاں نثار بھی تھے اور دردم نا خریدہ غلام بھی، مؤدب بھی تھے اور شاگرد بھی اور بے تکلف جی، آپ کو اپنا محبوب بھی سمجھتے تھے اور بادشاہ بھی، نبی بھی مانتے تھے، پدر بزرگوار بھی، پھر ایسی حالت میں یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ وہ آپ کے آثار اور روایت میں سے کسی ایک کو بھی ضائع کر دیتے، یا ان کے نشرو اشاعت میں ادنیٰ بے اعتنائی کو کام میں لاتے، صرف ابو ہریرہ، عبد اللہ بن عمرو بن العاص، عبادلہ ثلثہ اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی روایات کا تتبع ہی ہم کو یہ بتلانے کے لیے کافی ہے کہ آپ ﷺ نے شاید تیس برس کے عرصے میں کوئی سانس نہیں لی اور ایک قدم نہیں اٹھایا اور کبھی لبوں کو حرکت نہیں دی، مگر آپ کے اصحاب نے اس کو پورے اہتمام کے ساتھ قلم بند کر لیا اور یا کاغذ کے اوراق سے بھی زیادہ پائیدار یا دداشت میں محفوظ رکھا اور یہ اس لیے کہ انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں آپ ہی کی ذات بابرکت کو اسوۂ حسنہ ٹھہرایا تھا اور دین و دنیا کے ہر ایک کام میں وہ آپ ہی کے اقوال و احوال کو (جن پر ان ہوا و وحی یوحی) کی مہر ہو چکی تھی) دلیل راہ مان چکے تھے۔

بعدہ انہوں نے تمام دنیا کو اسی ایک مقصد (علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی) کی طرف دعوت دی، جس کے لبیک کہنے کے لیے مشارق و مغارب سے لوگ امنڈ پڑے اور کسی صحابی سے ایک حدیث سن لینے کو انہوں نے کل دنیا اور مافیہا سے زیادہ قیمتی سمجھا اور پھر ان لوگوں کی راہ طلب میں نہ سمندر کی موجیں حائل ہو سکیں اور نہ پہاڑوں کی بھاری بھاری چٹانیں، جنگل و بیابان قطع کرتے ہوئے اور پہاڑوں کو پھلانگتے ہوئے وہاں پہنچے، جہاں کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار مبارک سے آنکھیں روشن کرنے والے موجود تھے۔ مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑھنے پڑھانے والوں سے بھر گیا اور کل دشت و جبل نعرۂ حدیث سے گونج اٹھے، اسی طرح یہ سلسلہ خلفا عن سلف چلا اور بیسیوں علوم خاص فن حدیث کے لیے مدون ہو گئے، یہاں تک کہ شریاک پر دواز

کرنے والوں، عجمیوں کی ایک جماعت نے روایات اور الفاظ حدیث کا ایک چھانا اور تاپا ہوا صحیح و صاف ذخیرہ جس میں وضّاء عین اور کذّائین کے بطالت انگیز مکائد کی ذرہ برابر بھی آمیزش نہ تھی، ہمارے ہاتھوں میں قیامت تک کے لیے چھوڑ دیا اور ایک دوسرے گروہ نے (جو ((لعلمہ الذین یستنبطونہ منہم)) میں شامل تھا) ان احادیث کے اسرار و معارف اور اصول و فروع منضبط کر کے سینکڑوں علوم اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے یہ بخوبی ثابت کر دکھایا کہ نہ تو دنیا کا کوئی فلسفہ ان تعلیمات کا مقابلہ کر سکتا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو دی ہیں اور نہ مصریوں کا ابلہ فریب تمدن اور نہ حکمت یونان کی عظام مریم (گلی سڑیا ہڈیاں)

فریب رائے عزیزاں چراخورم کہ مرا

حدیث سید کونین بر زبان باقیست

اس زمانے کے ملوک و سلاطین کی توجہ اور حوصلہ افزائی بھی داد دینے کے قابل ہے کہ انہوں نے علمائے حدیث کے آگے زانوئے تلمذتہ کیا، خود محدث بنے، اوروں کو اس طرف رغبت دلائی، حتیٰ کہ دمشق اور قاہرہ وغیرہ میں خاص دارالحدیث کے نام سے عمارتیں بنوا کر آئندہ نسلوں کے لیے نیک مثالیں قائم کیں، گویا اس طرح وہ امانت جو قلم نے بطون اور اوراق میں جمع کی تھی، بدراس کے کمروں کے سپرد کی گئی۔

تاریخ کی ضخیم جلدیں اس چھوٹے سے اشتہار میں نہیں سما سکتیں، جن سے تم کو یہ معلوم ہوتا کہ اب سے چند صدی پہلے کس طرح مسلمانوں کی غفلت اور کم ہمتی، یا سہل انگاری سے بالخصوص ہندوستان میں علم حدیث (اور صحیح معنوں میں علم حدیث) قریباً ناپید رہا اور پھر کس طرح دہلی کے ایک حکیم امت نے مدینہ منورہ سے ایک نہر کاٹ کر نئی روانی اور حیرت انگیز آب و تاب کے ساتھ ہندوستان کی بنجر زمین میں جاری کی اور پھر کس صورت سے اس کے حقیقی وارثوں نے اس کو خشک ہونے سے بچایا۔

میرے نزدیک آپ کو تاریخ کے سارے دفتر کو الٹ پلٹ کرنے کی ضرورت نہیں، دیوبند میں آ جاؤ اور قاسمی، رشیدی، بلکہ ولی اللہی دارالعلوم کو دیکھ لو، وہ خود فن حدیث و فقہ کی ایک مجسم تاریخ ہے، کیونکہ اسی نے آج اس کساد بازاری کے زمانے میں اس متابع گراںمایہ

مختصر سوانح حالات و خدمات

کو رواج دیا، جس کو مسلمان اپنی بد قسمتی سے کھو بیٹھے تھے، یہاں پہنچ کر کس طرح آج بھی اعناق، مطایا کو قطع کر کے طالبین حدیث کے جوق در جوق مختلف اقطار و اکناف سے چلے آ رہے ہیں اور کس طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہم وطن آج دیوبند کے دارالعلوم سے ان کے قدیم ترکہ کو بخارہ پہنچانے میں سرگرم ہیں اور کس طرح اس نہر کے چند قطرے مدینہ طیبہ پہنچ کر اپنے اصلی سرچشمہ میں جا ملے ہیں۔

مشاقان حدیث اور عاشقانِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ہجوم کو دیکھ کر منتظمین دارالعلوم بھی تنگ مکانی سے گھبرا اٹھے اور تقریباً چھ سال ہوئے کہ انہوں نے تاسیس دارالحدیث کے متعلق آواز بلند کی، مسلمانوں کے ہر طبقے نے اس کو سنا اور ایسے قبول عام کے ساتھ سنا کہ جس کی نظیر کم از کم میری نگاہ سے تاریخ میں نہیں گزری۔ میں نے کسی دارالحدیث، بلکہ کسی درسگاہ کی نسبت نہیں پڑھا کہ اس میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، ائمہ مجتہدین اور مشائخ عظام رضی اللہ عنہم کی طرف سے ہزاروں آدمیوں نے چندے بھیجے ہوں اور ایسی مبشرات بیان کی ہوں، جو دارالحدیث دیوبند کی نسبت بیان کی گئیں، زیادہ تفصیل کا یہ موقع نہیں، لیکن میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جو دارالحدیث عہد ماضی میں بنائے گئے، ان کے بانی سلاطین اور فرمانروا تھے اور اس کے محرک و ساعی عموماً فقراء اور متوسط الحال لوگوں کی ایک جماعت ہے۔

بہر حال چھ سال ہوئے یہ غلغلہ اٹھا اور ایک نہایت معقول رقم جس کی تفصیل کسی دوسری اشاعت میں معلوم ہو سکے گی، چند یوم میں بغیر کسی معتد بہ مادی کشش کے اس مد میں پہنچ گئی، اس کے بعد یکا یک وہ پھر خاموشی سے بدل گیا، جس کی بہت سی وجوہ عوام نے طبعاً اختراع کر لیں، لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ ایک سرکاری گندے نالے کے حائل ہونے کی وجہ سے بڑے عرصے تک یہ مقدس کام رکا رہا۔

پہم مساعی کے بعد خداوند تعالیٰ نے گورنمنٹ عالیہ کو اس طرف متوجہ کیا اور موجودہ ہزار نواب لفتیٹ گورنر بہادر کی قابل شکر یہ عنایات خاصہ سے دارالعلوم کے ارباب حل و عقد اس مشکل پر غالب آئے، یہاں تک کہ پاکی نے ناپاکی کو دور کر دیا اور آفتاب قدس کی شمعوں کو نجاست کے چھینٹے گندہ نہ بنا سکے اور ((اما لزبد فی ذہب جفاء و اما ما ینفع

الناس فيمكث في الارض)) کی مثل پوری صادق ہوئی۔ والحمد للہ علی ذالک اب جماعتِ اسلام اور اخوانِ صدق و صفا کی اطلاع کے لئے یہ اعلان شائع کیا جاتا ہے کہ بجز اللہ دار الحدیث کی عالیشان بنیادیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، بھری گئیں اور عمارت کا نقشہ زمین پر قائم ہو گیا اور نہایت سرعت کے ساتھ کام جاری ہے، لیکن یہ سرعت جب ہی قائم رہ سکتی ہے، جب کہ ہماری قوم زائد از زائد توجہ سے کام لے، کیونکہ یہ لاکھ سو لاکھ روپیہ کا تخمینہ اولاً خدا کے فضل و رحمت اور ثانیاً مسلمانوں کی اعلیٰ درجہ کی توجہ سے انجام پاسکتا ہے، مسلمانانِ ہندوستان کی ہمت و سعی نے کام کر دکھایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے اولیاء و علماء کی یہ رفیع المنزلت یادگار سرزمین ہند پر قائم ہو گئی، تو انشاء اللہ العزیز یہ ایک ایسی یادگار ہوگی، جو دنیا میں تابدیر مسلمانوں کی عظمت و وقعت کو زندہ رکھے گی اور آخرت میں ذخائرِ حسنات ان کے ساتھ ہوں گے۔

خداوند رب العزت کے فضل و کرم سے جس کی مہربانی، ہمیشہ اپنے تمام بندوں پر مبذول رہتی ہے، یقین ہے کہ اگر ہم سب اس کے سامنے گردن جھکا کر اور خالص اس کے افضال پر بھروسہ کر کے اور اپنی غفلت شعاریوں کو چھوڑ کر کوشش کریں گے، تو وہ ضرور اپنی رحمت کی بارش ہم پر کرے گا، جس سے امیدوں کی تمام کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی اور کوئی مشکل ایسی نہ رہے گی، جو آسانی سے نہ بدل جائے گی۔

فضل اللہ کا کس حال میں شامل نہ رہا
ایک دم بھی وہ کبھی لطف سے غافل نہ رہا
حال اپنا ہی کسی کام کے قابل نہیں رہا
ورنہ یہ سخت غلط ہے کہ وہ مائل نہ رہا
اے کہ خواہی بجہاں اشرف و ممتاز آئی
می نشاند کہ زیندار بہ پرواز آئی

پس اے خدائے قدیر

مبہود عقدہ دشوار ہیں آساں کرد
سر بسر درد کی تصویریں درماں کردے

خوگر گریہ اندوہ کو خنداں مردے
تجھ میں قدرت ہے کہ کانے کو گلستاں کردے
شد فراموش جہاں قصہ پارینہ ما
باز نقد بروج آرز گنجینہ ما
(القاسم ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ، صفحہ ۵ سے ۹ تک)

رقمزدہ

شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

مدرس دارالعلوم دیوبند

مورخہ ۲۴ محرم الحرام ۱۳۳۵ھ

دارالحدیث سے متعلق علامہ کا یہ مضمون، حدیث کی عظمت، دارالحدیث کی تاریخی شوکت اور زبان کی طلاق کا پتہ دیتا ہے، آپ کے اس مضمون کا خاطر خواہ اثر ہوا، القاسم کے اوراق سے اس کے رد عمل اور تعاون کا پتہ چلتا ہے، اس کے بعد علامہ نے اس سلسلے میں اور کوئی قدم اٹھایا، یا نہیں، نظر سے نہیں گزرا، البتہ تعمیر کا سلسلہ جاری رہا، حتیٰ کہ پورے طور پر اس کی تکمیل ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۱ء میں ہوئی، جس کا طول ازسٹھ فٹ اور عرض پینتیس فٹ ہے اور جس کا نقشہ سید عاشق حسین صاحب ریاست انجینئر بہاولپور نے بنایا، مجھے تو اس سلسلے میں یہ کہنا تھا کہ القاسم کے اوراق میں دارالعلوم کی علمی اور عملی خدمات میں علامہ عثمانی کے حالات جا بجا ملتے ہیں اور اسی سلسلے کی ایک کڑی دارالحدیث کے لئے علمی اقدام مضمون کی صورت میں اور عملی قدم خورجہ پہنچنے اور اس کے مالی امداد کے لیے اٹھایا۔

(ماخوذ حیات عثمانی)

میری محسن کتابیں اور ابتدائی حالات

مولانا مناظر احسن گیلانی

صدر شعبہ اسلامیات، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن

مولانا مناظر احسن گیلانی بہار کی مردخیز سرزمین سے تعلق رکھتے تھے، ۹ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو اپنے ننھیال استھانواں میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن گیلان میں اپنے چچا حکیم سید ابوالنصر مرحوم سے پائی، ۱۲۳۲ھ میں مشہور معقولی عالم مولانا برکات احمد صاحب مرحوم کے ہاں ٹونک گئے اور سات سال تک معقولات کی چھوٹی بڑی کتابیں ان سے پڑھیں۔

پھر علوم اسلامیہ کے مرکز ”دارالعلوم دیوبند“ میں داخلہ لیا۔ ۱۳۳۲ھ میں دورہ حدیث میں شریک ہو کر دارالعلوم سے کتب حدیث کی سند حاصل کی، دارالعلوم میں آپ نے جن نابغہ روزگار شخصیات سے استفادہ کیا، ان میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، علامہ انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم) ہیں۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دارالعلوم سے نکلنے والے علمی رسائل ”القاسم“ اور ”الرشید“ میں مدیر کی حیثیت سے کچھ عرصہ کام کیا، ان رسالوں میں علمی و تحقیقی مضامین لکھ کر آپ نے علمی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ”سوانح ابو ذر غفاری“ اور ”کائنات روحانی“ دونوں کتابیں اسی دور کی یادگار ہیں۔

دارالعلوم کے مہتمم مولانا حافظ محمد احمد کی سفارش پر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں شعبہ اسلامیات میں آپ کا تقرر ہوا اور جلد ہی آپ اس شعبہ کے صدر بنا دیئے گئے۔ تقریباً پچیس برس تک حیدرآباد میں علمی خدمات سرانجام دیں، اس دوران ہزاروں تشنگانِ علوم کو آپ نے سیراب کیا۔ ”النبی الخاتم“ ”الدین القیم“ ”تدوین حدیث“ ”ہزار سال پہلے“ ”نظام تعلیم و تربیت“ اسی زمانے کے آپ کے علمی شاہکار ہیں۔ اس کے علاوہ

مختصر سوانح حالات و خدمات

سینکڑوں مقالات و مضامین آپ کی قلم سے نکلے اور ملک کے بلند پایہ رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ آپ کی سب سے آخری تصنیف ”سوانح قاسمی“ ہے، جو مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، بانی دارالعلوم دیوبند کے حالات و کمالات پر مکمل و مفصل تالیف ہے، آپ کی تصنیفات میں خطیبوں کا جوش و برجستگی، عشاق کی مستی و وارفتگی، عقل و جذب کی لطیف آمیزش، معمولی اور مشہور واقعات سے لطیف نکتے اور عجیب نتیجے نکالتے چلے جانا اور اس سرعت و کثرت اور ایللیہ انداز میں کہ پڑھنے والا مصنف سے شکایت کرنے لگتا ہے کہ:

دامانِ نگہ و گل حسن تو بسیار

یہ صرف علم و انشاء پر دازی کی کرشمہ سازیاں نہیں، بلکہ ان کے اندر سوزِ دروں اور خونِ جگر بھی شامل ہے اور واقع یہی ہے کہ:

رنگ ہو، یا خشت و سنگ چنگ ہو، یا حرف و صوت

معجزہ فن کی ہے، خونِ جگر سے نمود

حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمی تحریر فرماتے ہیں کہ:

”حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم مشاہیر فضلاء دارالعلوم میں سے تھے، صاحب طرز مصنف، ذہین و ذکا و اور طباعی میں منفرد تھے۔ تحصیل علوم سے فراغت کے بعد دارالعلوم کے رسالہ ”القاسم“ کے ایڈیٹر منتخب کئے گئے اور عرصہ دراز تک قلمی خدمات سے ہندوستان کے علمی حلقوں کو مستفید کرتے رہے۔ اس کے بعد حافظ محمد احمد قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کی سفارش پر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس دوران بہت سی مفید اور علمی تصانیف آپ کے قلم سے نکلیں، جن میں ”کائناتِ روحانی“ ”سوانح ابو ذر غفاری“ ”النبی الخاتم“ ”اسلامی معاشیات“ ”امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی“ وغیرہ آپ کی مخصوص و مشہور تصانیف ہیں، آخر زندگی میں احقر کی فرمائش پر ”سوانح قاسمی“ تین جلدوں میں مرتب کی، جو آپ کی تصانیف میں ایک شاہکار تصنیف ہے، اس کے بارے میں جب احقر نے ان سے فرمائش کی، تو بہت خوشی اور امانگ سے اسے قبول کرتے ہوئے کہا کہ: ”میری علمی زندگی کی ابتداء ”القاسم“ ہی سے ہوئی تھی اور انتہاء بھی شاید ”القاسم“ یعنی: حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی پر ہوگی“ چنانچہ یہی ہوا کہ سوانح قاسمی چوتھی جلد آپ نے شروع

کی، پانچ صفحے لکھنے پائے تھے کہ عمر فانی نے جواب دے دیا اور ”القاسم“ پر انتہاء ہو گئی۔

(تاریخ دار العلوم، یوبند)

آپ کے شیخ و مربی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ سے

کہ:

”مناظر احسن کے سارے مناظر احسن ہیں۔“

آپ کے علمی و روحانی مقام بلند کا اندازہ ہوتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے اور اسلامی آئین کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیا اور مسودہ آئین کی تیاری کے بعد واپس وطن تشریف لے گئے، ایک عرصہ تک بیمار رہے، طویل علالت کے بعد اپنے وطن ”گیلان“ ہی میں ۲۵ شوال ۱۳۷۵ھ بمطابق ۵ جون ۱۹۵۶ء کو وفات ہوئی۔

مرگِ مجنون پہ عقلِ گم ہے میر
کیا دیوانے نے موت پائی ہے

ابتدائی تعلیم

خاکسار کا خاندان چند پشتوں سے مولویوں کا خاندان ہے، میرے جد امجد مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم صوبہ بہار کے مشہور معقولی مدرس تھے، والد مرحوم تو نہیں، لیکن میرے عم مغفور مولانا حکیم حافظ سید ابوالنصر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ درس نظامیہ کے عالم تھے، درس و تدریس کا مشغلہ تو ان کا کم تھا، لیکن مطالعہ میں مسلسل منہمک رہتے تھے، اس زمانہ کے عام مولویوں کے اعتبار سے ان کا مطالعہ کا دائرہ کار وسیع تھا، عربی، فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کی علمی کتابوں کا پڑھ لینا اپنی کسر نشان نہیں سمجھتے تھے، اس لیے مولانا شبلی، سرسید، حالی، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ جیسے لوگوں کی کتابوں تک کا مطالعہ بہ شوق کرتے تھے، اگرچہ ان لوگوں کے مستغربانہ میلانات سے متفق نہیں تھے، میں نے ان ہی کے آغوش تربیت میں آنکھیں کھولیں، چونکہ خود ”لا ولد“ تھے، اس لیے بجائے بیٹے کے مجھے مانتے اور چاہتے تھے، تین ہی سال کی عمر میں جب الفاظ کے تلفظ پر زبان گوئے قادر ہو چکی تھی، سینکڑوں فارسی کے الفاظ

مجھے یاد کرادیے تھے، یہ واقعہ ہے کہ ایک زمانہ تک کتے کو ”سگ“ کے سوا میں نہیں جانتا تھا کہ کچھ اور بھی کہتے ہیں۔ بعض دفعہ گھر کی عورتوں کو میری اس فارسی دانی سے کافی مشقت میں مبتلا ہونا پڑا، اسی زمانہ میں دادا مرحوم کے ایک پنجابی شاگرد ملا عبداللہ مرحوم میرے گاؤں میں توطن پذیر ہو گئے تھے اور مختلف موثرات کے تحت دہلی جا کر مولانا نذیر حسین مرحوم کے حلقہ میں پہنچ کر حنفی مسلک کو چھوڑ کر عمل بالحدیث، یا غیر مقلدیت کا مسلک اختیار کر لیا تھا، چچا مرحوم سخت غالی حنفی تھے، ملا عبداللہ سے، حالانکہ انہوں نے کچھ پڑھا بھی تھا، لیکن مقلدیت و غیر مقلدیت کی بحث میں اُلجھ کر دونوں میں مختلف کلی اور جزئی مسائل کے متعلق رات دن مباحث کا بازار گرم رہتا تھا، خصوصاً طلاق ثلاثہ مجلس واحد مغلظہ ہے، یا رجعی، اس نزاع میں تو رسالہ بازیوں تک کی نوبت آئی، طرفین سے متعدد درسا لے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے شائع ہوتے رہتے تھے، میں نے جب ہوش سنبھالا اور چچا مرحوم ہی سے مکتبی تعلیم کا آغاز ہوا، تو میرا علمی ماحول یہی تھا، ابن حجر، ابن قیم، ابن تیمیہ، شوکانی، ان باتوں کی بار بار تکرار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ان ہی لوگوں میں پیدا ہوئے ہیں اور جب ان لوگوں کی یہ حالت تھی، تو پھر بخاری، مسلم، امام ابوحنیفہ، ابو یوسف، ابو ہریرہ، ابن عمر کے متعلق اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کیا حال ہوگا...؟! اس مکتبی دور میں مجھ پر سب سے زیادہ کس کتاب کا اثر پڑا، وہ عجیب ہے، فطرتا میں سخت بدشوق بچوں میں شمار ہوتا تھا، چچا مرحوم نے مار مار کر میری کھال تک بعض دفعہ ادھیڑ دی، لیکن پڑھنے کی چوری سے کبھی باز نہ آتا تھا، اتفاقاً ایک اردو کی کتاب جس کے ابتدائی صفحات غائب تھے، کہیں گھر میں مل گئی، یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ تھا، اب بھی نہیں معلوم کہ اس کا نام کیا تھا، لیکن اس کا اثر اب تک زندہ ہے، قصہ کی کتاب تھی، پورا قصہ تو اب یاد نہیں رہا، اتنا یاد رہ گیا ہے کہ ایک پادری اپنے باغ میں رہتا تھا، بچوں کو کچھ پڑھاتا بھی تھا اور بخاری وغیرہ، جیسی بعض صنعتیں بھی سکھاتا تھا،

..... اپنی فضیلت موضوع استخوانوں میں تھا، عورتیں کسی تفریب میں باہر گئی ہوتی تھیں، اکیلا میں ہی گھر میں تھا، یا اور کوئی کھلائی بھی ہو، بہر حال میں نے باورچی خانہ میں کتے کو جاتے دیکھا، عورتیں جب آگئیں، تو میں نے اپنی تائی صاحبہ کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا: ”سگ آیا تھا، بھات کھا گیا“۔ وہ بچاری حیران کہ ساگ بھات کو کھا گیا، کیا مطلب ہے؟ والدہ مرحومہ میری اصطلاحوں سے واقف تھیں، جب وہ آئیں، تب مسئلہ حل ہوا۔ ۱۲

طلبہ کو اپنے باغ کے میوے رس بھری وغیرہ کھلاتا تھا، بچوں میں ہری اور ٹامی دو خاص کیریکٹر کے لڑکے تھے، ان میں ہری سعادت کا اور ٹومی شقاوت کا نمونہ تھا، ہری کے جو حالات اس کتاب میں درج تھے، ان سے غیر شعوری طور پر میرادل متاثر ہوا اور اس کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا، ایسا محسوس ہوا کہ کاش! یہی زندگی مجھے بھی میسر آتی اور اب مجھ پر کچھ پڑھنے کا شوق نگدگی لینے لگا، لیکن پچامرحوم کی بدگمانیوں کا شکار تھا، پٹائی کا سلسلہ مسلسل جاری تھا اور اب اس کے بعد میرے لئے یہ مار دھاڑ بجائے نفع کے باعث نقصان بنتی چلی جا رہی ہے، اسی عرصہ میں چند دوستوں نے مجھے ”داستان امیر حمزہ“ دکھائی، اس کی دلچسپیوں نے مجھے ہوش ربا کے طلسم میں گرفتار کر دیا، مجھ پر تو جو گزرنی تھی، گزر گئی، لیکن عمر اس وقت غالباً دس گیارہ سال کی ہوگی، جب اس مرض میں گرفتار ہوا، گاؤں کے ایک رئیس بابو ظہور محسن مرحوم کو بھی قصہ کہانیوں کی کتابوں سے حد اعراق تک دلچسپی تھی، میری بد قسمتی تھی کہ انہوں نے ”نول کشور پر لیس“ کے ان سارے خرافات کو جن کا ”داستان امیر حمزہ“ سے تعلق ہے، منگوا لیا تھا۔ ”کوچک باختر بالا باختر“ ”ہفت پیکر“ ”نور افشاں“ ”ایرج نامہ“ اور خدا جانے کیا کیا...؟ اب تو سب کے نام بھی یاد نہیں، ہر ایک کتاب تک میری رسائی باسانی ہو رہی تھی، متعلقہ مکتبی اسباق سب بالائے طاق ہو گئے، صرف ان ہی داستانوں میں غرق ہو گیا، چچا صاحب کو میرے اس انہماک کا احساس ہوا، کچھ نگرانی کرنے لگے، یہ واقعہ ہے کہ بیت الخلاء میں کتاب کو چھپا کر رکھ آتا اور پھر قضاء ضرورت کے حیلہ سے اسی بدبو کدہ میں بیٹھا ان کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا، رات بھر میں نے مدتوں یوں گزاری کہ صبح ہوگئی اور میں ہوں، میری یہ داستان ہے! خیر، یہ تو چنداں مضربات نہ تھی، اس سے زیادہ اس کتاب نے ہم پر حملہ کیا اور طبیعت ان واقعات کی نقل اپنی زندگی میں اتارنے کی کوشش کرنے لگی، جن سے کتاب مملو ہے، کیا کیا لکھو کہ پھر اس راہ میں مجھ پر کیا گزری، حد یہ ہے کہ عیاری جو اس کتاب کا مخصوص حصہ ہے اور مکرو فریب، دھوکہ چالاکی بھی اس کا خلاصہ ہے، میں نے مدتوں بطور فضائل کے خود اس کی مشق کی اور اپنے ہجو لیوں میں جو غریب اس کتاب سے ناواقف تھے، ان کا امام بن کر مختلف طریقوں سے ان عیاریوں کی عملی مشق میں مصروف ہو گیا، وہ تو خدا کا فضل ہوا کہ پرواز بہ مقدار عمر تھی، گاؤں کے باغ اور کھیت میری اور میرے

شاگردوں کی عیاریوں کی جولانگاہ تھے، غریب دکھوالوں کو طرحت طرحت سے ستایا کرتا اور ان کی چیزوں کو برباد کر کے خوش ہوتا کہ عیاری خوب ہ میاب وہی۔ ابھی شباب اور شبابیات سے بیگانہ تھا، اگرچہ بتدریج ان کے آثار چپکے چپکے ابھر رہے تھے اور شاید میری بربادی یقینی تھی، اگر ٹھیک عقوان شباب ہی میں قدرت مجھے اپنے دیہاتی ساتھیوں سے الگ نہ کر لیتی۔ پہلے انگریزی تعلیم کا چچا کو خیال تھا، بھاگل پور اسکول میں نام لکھانے کے لیے بھیجا بھی گیا، انگریزی کی ابتدائی ایک دو کتابیں دیہات ہی میں ختم ہو چکی تھیں، لیکن کسی لطیفہ غیبی نے میری رفاقت کی، ایسے قدرتی موانع پیش آئے کہ یکا یک میری تعلیم کا پروگرام بدل گیا اور اچانک اس طلسمی قید سے نکل کر قدرت نے مجھے بہارے سینکڑوں میل دور راجپوتانہ کے ریگستانوں میں پہنچا دیا، یعنی: ریاست ٹونک کے مشہور منطقی و معقول عالم حضرت مولانا برکات احمد بہادری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رشتہ داری کے تعلق سے چچا مرحوم نے پہنچا دیا، پھر میں کہہ سکتا کہ کن نامعلوم اسباب کے تحت ماحول کے اس انقلاب نے میرے دل و دماغ کو بدل دیا، ہوش ربا کی داستان کا قصہ ختم ہو گیا، جو جادو اس کتاب نے مجھے پر چلایا تھا، اس کے اثر سے خود بخود شفا یاب ہو گیا، اب میرا شمار مولانا مرحوم کے شوقین محنتی ذہین طلبہ میں ہونے لگا، حالانکہ چچا مرحوم کے زد و کوب نے مجھے یہ یقین دلادیا تھا کہ میں سخت کوڑھ مغز واقع ہوا ہوں، ورنہ صبح و شام اتنی مار کیوں کھاتا، اس سلسلہ میں ”داستان امیر حمزہ“ کے عیبوں کے ساتھ اس کے ایک ہنر کا بھی ذکر نہ کرنا، ناشکری بھی اور شاید گو نہ حق پوشی بھی ہوگی، داستان کے اس طویل سلسلہ کا اگر تجزیہ کیا جائے، تو کل تین اجزاء پر ساری کتابیں مشتمل نظر آئیں گی:

۱۔ ایک تو وہی عمر و عیار اور ان کے تلامذہ کے عیارانہ کرتب۔

۲۔ امیر حمزہ اور ان کے احفاد و اولاد در اولاد، بلکہ عیاروں کے حسن و عشق کے

افسانے۔

۳۔ فرضی کفار کے مقابلہ میں فرضی مسلمانوں کا فاتحانہ استیلاء۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ پہلے جز کے ساحرانہ نتائج کا تو میں شکار ہی ہو گیا، خود بھی ہوا اور کتنوں کو اس فزاک کا نچھیر بنایا، خود تو خیر کم سنی کی وجہ سے صرف باغوں اور کھیتوں تک

مرد در رہا، لیکن میرے ایک بھولی میاں معین الدین عرف مناگیلان، ہی میں میرے بعد کچھ دن رہے اور اب تقریباً بیس پچیس سال سے مفقود الخیر ہیں، بعضوں سے معلوم ہوا کہ ڈھا کہ کے علاقہ میں پہنچ کر ان پر جذب طاری ہو گیا اور اب ان کا شمار اس علاقہ کے مستجاب الدعوات فقراء میں ہے، ان بیچارے کو ٹونک سے واپسی کے بعد پایا کہ گاؤں کی مرغیوں اور بکریوں پر اپنی عیاریوں کی مشق کر رہے ہیں، ”داستان امیر حمزہ“ کے شروع میں عمر و عیاری کی طرف مرغی پکڑنے کی جو عیاری منسوب کی گئی ہے، یہ اسی کی تجلی تھی جو اس بیچارے کے عمل میں آ کر جلوہ گر ہوئی تھی، رہا دوسرا جز، تو اس وقت ان واقعات سے متاثر ہونے کی پوری صلاحیت ہی نہیں پیدا ہوئی تھی، البتہ تیسرے جز کا اگر بظاہر عملی طور پر مجھ پر کچھ اثر تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ غیر شعوری طور پر میری طبیعت نے اس کا اثر کچھ ضرور جذب کیا تھا اور کفر کے مقابلوں میں اسلام کے اعتلاء و سر بلندی کے جذبہ سے میرا دماغ اگر کبھی خالی نہ رہا، تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس میں اس داستان کے اس جز کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہے۔ اگرچہ اسی زمانہ میں چچا مرحوم کے اصرار سے واقدی کی فتوح الشام و مصر وغیرہ کا بھی میں نے مطالعہ کیا تھا اور گو آغاز جبراً ہوا تھا، لیکن آخر میں چچا مرحوم کی مرضی کے مطابق کسی چیز کو شوق سے کچھ دن میں پڑھا، تو واقدی کی یہی کتابیں تھیں اور اس جذبہ میں ان کتابوں کی تائید بھی ضرور شریک ہے۔ یہ بات کہ اردو ادب کے اس طویل سلسلہ کے مطالعہ نے میری ادبی قابلیت پر کچھ اثر ڈالا، یا نہیں؟ میرے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے کہ اس زمانہ میں لکھنے پڑھنے کا مجھ میں کسی قسم کا کوئی سلیقہ پیدا نہیں ہوا تھا اور تھوڑا بہت اگر تھا، تو وہ چچا مرحوم کی جبری تعلیم کا اثر تھا۔

اس ہوش ربائی داستان سرائی میں طوالت سے میں نے قصداً کام لیا ہے، کیونکہ اپنے ان ہی ذاتی تجربات کی بنیاد پر میں ان مسموم ادبی کتابوں اور رسالوں کو نوخیز بچوں اور نوجوانوں کے لیے ”سم قاتل“ قرار دیتا ہوں، جو حشراتی کیڑوں کی طرح آج آسمان و زمین سے ہر ہر گھر میں برس رہے ہیں، بچوں سے آگے بڑھ کر بچیوں تک کی تباہی و بربادی میں بے پناہ طوفانوں کا کام کرتے ہیں۔ نسلیں برباد ہو رہی ہیں اور گھرانے اجڑ رہے ہیں، مگر اس شکل میں کہ ان کاغذی سانچوں اور پھوڑوں سے ماں باپ نجوشی اپنے بچوں کو ڈسا

رہے ہیں، حکومت مدد کر رہی ہے، قوم کے لیڈر ایجوکیشن اور خدا جانے کن کن مشنوں سے زہر کے یہ پیالے قوم کے نونہالوں کو بلیغ تقریروں اور فصیح اسپچوں کے ذریعے پلا رہے ہیں۔ فاننا لله وانا الیہ راجعون کہ تباہی کے اس طوفان کے انسداد کے سارے وسائل ختم ہو چکے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہونے والا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔

ماقدر الله فسوف یکون، و اذا اراد الله بقوم سوءاً فلا

مرد له وما له من وال

بہر حال یہ میری جاہلیت کا دورہ تھا، جو ٹونک پہنچنے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا، اب واقعی علوم و فنون کا شوق مجھ پر مساط تھا، شوق کی یہ حد تھی کہ باوجود مطبوع ہونے کے میں نے شدت ذوق میں منطق کی بعض کتابیں خود اپنے قلم سے لکھ لکھ کر پڑھیں اور ان ہی دنوں میں ایسا غوجی قلمی پر اپنے استاد کی تقریروں کو اردو میں بطور حاشیہ کے لکھتا جاتا تھا، جو اب تک میرے کتب خانہ میں بطور یادگار کے محفوظ ہے، مولانا برکات احمد پر مولانا عبدالحق خیر آبادی کے رشید شاگردوں میں ہونے کی وجہ سے خیر آبادی اسکول کے اثرات غالب تھے، منطق و فلسفہ ان ہی دنوں علوم کا ان کے حلقہٴ درس میں غلبہ تھا، مجھ پر بھی ان ہی کا تسلط قدرتی طور پر ہونا چاہئے تھا، سو ہوا، لیکن اسی کے ساتھ یہ چچا مرحوم کی ترکیب تھی کہ خطوط میں بعض خاص علمی و ادبی رسائل و اخبار کے مطالعہ کی تاکید فرماتے رہتے اور گو برکاتی ماحول اس مذاق سے قطعاً نا آشنا، بلکہ مخالف تھا، لیکن اس عرصہ میں میرا یہ مشعلہ برابر جاری رہا۔

(الرشید دیوبند)

کرشن کے ساتھ آریوں کی عداوت پر ایک نظر

جولائی ۱۷ء کے خطیب میں بذیل انتقادات کتاب ”کرشن ہتی“ پر ایک بسیط مضمون درج ہے، میں نے چونکہ اس کتاب کو خود نہیں دیکھا ہے، اس لیے بالفعل اس کے متعلق ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے، اسی طرح ناقد کے خیالات کی بھی نہ تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب کہ یہ سب باتیں کتاب کے معائنہ پر موقوف ہیں، بلکہ اس وقت سردست میں اس طلسم کدہ حیرت کو توڑنا چاہتا ہوں، جس میں گرفتار ہو کر ایک موقع پر مضمون نگار کے قلم سے ذیل کے الفاظ نکل پڑے ہیں:

”آریہ سماجی تحریک خدا معلوم کیوں ان کو (کرشن) مذہبی پیشوا تسلیم نہیں کرتی اور مقدس گیتا کو انکی تصنیف نہیں مانتی، ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کس تاریخی دلائل کی بناء پر اس مشہور و مسلم واقعہ سے انکار کرتے ہیں۔“

خوش اعتقاد مضمون نگار نے امید باندھی ہے کہ لالہ لاجپت رائے کی کتابوں میں ممکن ہے کہ اس ترژدہ، انتشار کی تسلی موجود ہو، لیکن لالہ لاجپت رائے کے گلے سے جس میں دیا نندی مالا پڑا ہوا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ وہ ایسی آواز سننے کے کیوں منتظر ہیں، آپ یقین کیجئے کہ دنیا کا کوئی آریہ اس حرف کو کبھی زبان پر نہیں لاسکتا، جس نے اسے بھاگوت، گیتا کی اہانت اور اس کے مقرر ”کرشن“ کی تذلیل پر مجبور کیا۔ ہاں!

خواہی کہ روشت شود احوال سر عشق

از شمع پرس قصہ زیاد صبا پرس

گرچہ یہ ایک فسانہ طویل ہے اور مجھے اس کی تفصیل میں کم از کم ”بودہ مت“ اور اصل ”برہمی مذہب“ اس کے بعد براہمہ و تبعین بودہ کی باہمی جنگ آزمایوں کا اور اخیر میں ان تمام تدبیروں کی تمام داستان دہرائی پڑے گی، جس کا نتیجہ آج ”ساتن دہرم“ کی صورت میں آپ کے سامنے ہے، لیکن مختصر آتا تو آپ سن ہی لیں۔

ہندو لٹریچر کے مطالعہ اور تفتیش کے بعد نہ صرف مجھ پر، بلکہ ہر ایک تشنہ تحقیق پر یہ راز واضح ہوتا ہے کہ توحید اور خالص توحید پر اس کی بناء تھی، نہ اس میں مادہ کا ذکر تھا اور نہ دیوتاؤں کا، نہ بھوتوں کا پوجا تھا اور نہ درختوں کے آگے سجود، کچھ بھی نہیں تھا، اگر اس وقت میں درپے تفصیل ہوتا، تو اس کی شہادتیں، دید اور اس کے علاوہ اور اپنشدوں، شاستروں، پروانوں سے آپ کے سامنے ان گنجان جنگلوں سے نکال کر پیش کرتا، جس میں بمشکل اس کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے بعد یکا یک جدت پسند زمانے نے اس میں بھی نئے نئے شاخسانے پیدا کئے اور اس میں ہندوؤں کی تخصیص نہیں، شیطان کا عمل، ہر ایک ملت و مشرب میں تین طور پر موجود ہے، عیسائیت، یہودیت کو جانے دیجئے، خود آپ کا اسلام آج شرک والحاد کے پیشوں میں اس طرح مستور ہے کہ بغیر توفیق خداوندی کے، اصل توحید کو ذہین سے ذہین آدمی نہیں پاسکتا، تیرہ سو برس کے اندر مختلف دماغوں میں گھس کر ابلیس نے جتنے روڑے توحید مطلوب کے راستوں میں بچھادیئے ہیں، تقریباً ناممکن ہو گیا ہے کہ بغیر اعانت الہی کے ہم اسے اٹھا سکتے ہیں۔

خدا کی تائید تھی کہ قرآن مجید میں تحریف لفظی نہ ہو سکی، ورنہ معنوی تحریض کر کر کے مشرکین اسلام نے قرآن کی کس آیت سے روحوں کے آگے انسانوں کو نہیں جھکوا یا؟ نہ صرف روحوں، بلکہ بانس کے چھلکوں اور مٹی کے ڈھیروں کے سامنے موجود اعظم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو مدعاؤں اور التجاؤں کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھرانے کا عادی نہیں بنایا؟

جہاں تک اور صرف ہندوستان میں پشاور سے لے کر برہما کے ہر شہر اور ہر گاؤں میں ان ابلیسی اعمال کے مظاہروں کو ملاحظہ فرمادہ کر اسلام اور حقیقی اسلام کے لئے ماتم کیجئے اور ان جبہ و دستار پر تعجب کیجئے کہ جس کے بیچ و دامن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ معلم التوحید سید الدنیا والدین حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی الفت موجزن ہے۔ وما یومن اکثرہم الا وہم مشرکون

خیر یہ تو اپنی خانی باتیں ہیں، اس کے لیے ہم کب تک روئیں گے اور صرف رونے سے یہ ہوتا ہے؟ کہ ہمارا تو زیادہ سے زیادہ گنہگار دو گنہگار تک محدود ہوگا اور عربی نے تو

گر یہ صد سال کا انجام کو بھی ناکافی بتایا ہے۔ فہل من مدّ کر۔
 بہر کیف بحث اس میں تھی کہ اس کے بعد ہندوؤں میں رشیوں اور مینوں کا زور ہوا،
 ہندوستان کی شرک پرور ہوا اور کچھ عزت و جاہ نے، کچھ فلسفہ نے اور اخیر میں اسی نے جس
 نے ان باتوں کا بیڑہ آسمانوں پر اٹھایا تھا، یکا یک مورت اور تصاویر کو مختلف مصالح سمجھا کر
 یہاں کا معبود بنایا، ایک زمانہ اس پر گذرا، حتیٰ کہ (مگدھ) بہار کا مشہور صلح، جس کو غلطی سے
 لوگ دہریہ اور منکر خدا کہتے ہیں بودھا اٹھا، کس جذبہ سے متاثر ہو کر اٹھا، ہمیں معلوم نہیں،
 لیکن اپنی محدود معلومات کی بناء پر (جو مجھے بودھ مت کے متعلق ہیں) کہہ سکتا ہوں کہ اس
 نے پھر توحید کی تعلیم دینی شروع کی۔

”اشوکی“ سلطنت نے اس کا مذہب اختیار کیا اور بت فروش برہمنوں کے ٹیے
 قیامت آئی، خدا کا غضب بھڑکا اور وہ برباد کئے گئے، اس پر بھی ایک زمانہ گذرا اور پھر
 شیطان کی قوت کو نشوونما شروع ہوئی، ادھر بودھی علماء نے بھی کلمات بودھ کو تختہ مشق بنانا
 شروع کیا، جس کا نتیجہ سب کو معلوم ہے اور اب تک آنکھوں کے سامنے ہے کہ وہی گنیش اور
 مہادیو مع اجزائیہ ہندوستان کے گھر گھر میں گڑے ہوئے تھے، ہر طاق اور ہر آنگن میں تسلی
 کے پیڑ کے نیچے مربع اور یا نصف کروی شکل کے اجسام، انسانی عقول و جذبات پر حاکم تھے
 اور اب تک ہیں، اس کے بعد اسلام آیا، صوفیاء اور علماء نے ابتداء ابتداء میں کوششیں کیں
 اور کامیاب ہوئے، کیونکہ اس وقت یہاں صرف کفر ہی کفر تھا، لیکن یکا یک اسلامی سلطنت
 کو وسعت ہوتی رہی اور مختلف جہات و امصار کے مسلمان ہندوستان میں سیلاب کی طرح
 بہہ کر آنے لگے، یہ وہ مسلمان تھے، جو روحوں کی پرستش، اور بانسوں کے چھلکوں کی تعظیم اور
 مٹی کے ڈھیر کے آگے پیکر اعتقاد بن کر کھڑے ہونے کے عادی ہو چکے تھے۔

جس گاؤں، جس قصبہ میں آئے، اپنے باپ دادا کی اگر وہ بزرگ ہوئے، ورنہ یونہی
 فرضی قبروں کے آگے عبادت و التجا دعا کرنے لگے، جسے آنحضرت نے مخ العبادۃ (مغز
 عبادت) فرمایا تھا، ان کے آگے نذر گذرانی، پھول چڑھائے، چادریں ڈالیں۔

مبلغین دم بخود تھے کہ اب ہندوؤں کو کیا سمجھایا جائے، جبکہ مسلمانوں کا یہ حال ہو۔
 ہم اگر کسی ہندو سے کہتے ہیں کہ اپنے مٹی کے بت کے آگے نہ جھکو، تو اس اعتراض کا کیا

جواب ہوگا کہ آپ کی قوم تعزیر کی لکڑیوں کے آگے کیوں جھکتی ہے، پکی قبروں پر سر، آنکھ، ناک، منہ کیوں رگڑتے ہیں؟ بصد خا کساری ان سے اپنے مدعا کو کیوں طلب کرتی ہے؟ آخر عبادت کی حقیقت اور کیا ہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ اشاعت و تبلیغ کا کام بند ہو گیا اور موحدین خود اپنی جماعت کی اصلاح میں مشغول ہوئے، لیکن سیلاب نہ تھا اور چند دنوں کے بعد دنیا پرستی نے خود ان کی اولادوں کو ان تمام اشراک و بدع کا حامی بنا دیا و رضو ابالحیوة الدنیا واطمئنوا بها، حالانکہ و ما امر و الا لیعبدو اللہ مخلصین له الدین حتی کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کفار عرب جو ڈوبتے جہازوں پر موحد بن جاتے تھے، ان سے بھی ان کا حال ابتر ہوا اور سمندروں، طوفانوں، بلاؤں میں بھی مبتلا ہو کر ان کا دین خالص نہیں ہوتا، ”یا غوث، یا خواجہ“ کہنے سے ان کا ڈھیٹ دل وہاں بھی نہیں کانپتا۔

﴿ان ہی الا اسماء سمیتموها انتم و اباؤکم ما انزل

اللہ بها من سلطان﴾

”نہیں ہیں یہ، لیکن چند فرضی نام جسے تم نے اور تمہارے باپوں نے رکھ لئے ہیں، خدا نے کوئی دلیل ان پر نہیں نازل فرمائی۔“

یہ ایک نہایت طوفان بد تمیزی کا زمانہ تھا، قرآن کے پڑھنے والے، یا اس کے مقاصد پر مطلع ہونے والے بعض لوگ بے چین بھی ہوئے اور ہندوستان کے پچیس چھیس کروڑ نفوس کو دیکھ کر انہیں رحم بھی آیا، لیکن کچھ نہ کرتے، مسلمانوں کی عملی نظائر مواعظ، خطب کے اثرات کو کھو چکے تھے، ہاں! پچھلے دنوں چند لوگوں نے اپنی عملی تدبیر پر بھروسہ کر کے اسوۂ انبیاء کے خلاف چھپ کر توحید کی اشاعت کرنی چاہئے، جن میں سے خاص طور پر کبیر داس، بابا ناک تلسی داس، بطن غالب قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں سے بھی اپنے کوا لگ بتایا، تاکہ ان عملی بت پرستی سے ان پر اعتراض نہ ہو اور صلح کل کا مشرب رکھ کر زور دار نظموں میں چاہا تھا کہ لوگ موحد ہوں، لیکن یہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ نہ تھا کہ ان کو صرف تبلیغ کا حکم ہے اور ہدایت و رشد کے معاملہ خدا کے ذمہ سونپ دینے کا امر ہے، مگر انہوں نے اپنی پالیسی پر اعتماد کیا، جس کا نتیجہ ہے کہ فوائد کے جگہ سینکڑوں نقصانات پیدا ہوئے، چونکہ یہ خدا کا بنایا ہوا راستہ نہ تھا، شیطان بول کھول کر انہیں پھینکا اور نیشہ جگری کے ساتھ آدم کی

راہیں ماریں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

﴿فان عليك البلاغ وعلينا الحساب﴾

”تجھ پر (اے محمد) صرف پہنچادینا فرض ہے، حساب میرے ذمہ ہے۔“

﴿فذکر انما انت مذکر لست علیہم بمسیطر الا من

تولی وکفر فیعذب اللہ عذاب الا کبر﴾

”پس نصیحت کر (سمجھا) تو ان پر داروغہ نہیں، لیکن جس نے پیٹھ پھیری اور

کفر کیا، اسے خدا بڑے عذاب دیگا۔“

پس کامیابی اسی میں تھی اور جو اس کے خلاف ہوئے، ان کے حالات غیر مخفی ہیں۔

یہ دور بھی ختم ہوا، انگریزوں کی سلطنت آئی، اس وقت مولانا امام الہمام الراشد الموحّد حضرت محمد اسمعیل الدہلوی الشہید رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں توحید کا دریا اٹھا اور چڑھا، دہلی سے کلکتہ تک اس نے شور برپا کر دیا، طوفان اٹھایا، ہندو اور مسلمانوں میں بالچل مچ گئی، لیکن آہ! کہ اس نیک نیت، وارث الانبیاء والرسل صلوات اللہ علیہم وسلمہ، کو ایک اسلامی معاملے میں خدا کی راہ میں قربان ہونا پڑا، اس نے اپنے وجود کو اپنے پیارے مالک واحد، فرد، صمد کے قدموں پر بھینٹ چڑھا دیا اور ایک حد تک وہ آواز جو نہایت بلند آہنگی اور انتہائی اولوالعزمی کے ساتھ اٹھائی گئی تھی، دھیمی پڑ گئی، ان کے متبعین جزئیات میں جھگڑنے لگے اور اس ”الطاعات“ یعنی: توحید کی تبلیغ و اشاعت کی جانب سے دل غافل ہو گئے، الا ماشاء اللہ کہ ان کی زبانیں اس وقت بھی نہ تھکی تھیں اور ان کے قلم اس وقت بھی جاری تھے، یہی ہنگامہ تھا، جس نے سوامی دینا مندرستی کے دل میں تحقیق مذہب کی بنیاد ڈالی، اور گھر سے بے گھر ہو کر نکلے، لیکن نسلی روایات نے ان کو قرآن پڑھانے والوں کے پاس آنے نہ دیا، ہندوؤں میں بھٹکتے رہے اور راستہ نہ پایا، حتیٰ کہ اخیر میں گھبرا کر کوہ ہمالیہ کی برفستانوں کی طرف چلے، ارادہ تھا کہ سوگ سیڑھی (زنیہ بہشت، جو ہندو روایات میں مشہور ہے) پر اپنی جان دے دوں اور دے دیتے، تو بہتر تھا کہ ایک نیا فتنہ تو نہ اٹھتا، لیکن اس نے جو یہاں انسانوں کے بہکانے کے لیے مختلف ترکیبوں سے کام کر رہا ہے، ان کو سمجھا کر اوتار اور اپنے اعمال کا ایک آلہ بنا لیا، وہ متہرا

گئے، یہاں ایک قدیم ہندو مذہب کے عالم سورداس ونڈی بھی رہتے تھے، ان کی شاگردی قبول کی، ونڈی جی صاحب کو بنارس کے مشرک برہمنوں سے کسی ذاتی معاملہ میں کشیدگی پیدا ہوگئی تھی، سوامی دیانند جی کو چونکہ متاخرین کے کلام سے سخت نفرت تھی، انہوں نے ونڈی جی سے متقدمین کی کتابوں کے پڑھنے کی درخواست کی، ہمارا خیال ہے کہ ونڈی جی نے ان کو ہندوستان کے مشہور تہمتی فیلسوف و منطقی، گوتم رشی کی مشہور کتاب ”نیائی شاستر“ پڑھائی، یا نہ پڑھایا ہو کہ کیا ہے، تو پھر اس کے اصول پر جو کتابیں موجود ہیں، ان کی تعلیم دی۔

ونڈی جی کی اس میں دانشمندی یہ تھی کہ سوامی دانند کے خیالات توحید کی طرف مائل تھے، بتوں، مورتوں کے پوجا کی کوئی دلیل ان کو نہیں ملتی تھی، ویدوں میں بھی اس کے متعلق مختلف احکام جن میں زیادہ تر ان کی اہانت کی طرف مشعر ہیں، مملو تھے،

چونکہ گوتم نے اپنے شاستر میں مادہ، روح، خدا کو انادی ثابت کیا ہے اور اس پر دلائل قائم کئے ہیں، جو سطحی دماغوں میں آسانی کے ساتھ جم جاتی ہیں، اس لیے دیانند توحید جو اسلامی موجوں کا نتیجہ تھی، ڈھ گئی اور موحد کی جگہ اب مثلث ہو گئے، ونڈی نے برہمنوں کی مخالفت کی بھی تعلیم دی تھی، آخر اٹھے اور گوتم کے خیالات کے اشاعت میں مشغول ہوئے بتوں کو توڑ دیا، دیوتاؤں کے پوجا سے ہندوں کو روکا، لیکن خود شرک کے اعلیٰ فرد کے ساتھ موصوف ہو کر اور یہ خاتم تھا پچارے اس دیانند کا، جس کو سیدھا راستہ نہ مل سکا، حالانکہ قرآن اسے بخوبی بتا سکتا تھا۔

بھاگوت گیتا، جسے کرشن کے ملفوظات کہنے چاہیں، یا کرشن کا وہ لیکچر سمجھنا چاہئے، جو اس نے کورک شوتر کے میدان میں جہاد پر ارجن کو ابھارنے کے لیے کی تھی، گو اس پوری تقریر کا راوی ”دہر تراشتر“ (جو کورون کا ابوالا جداد تھا) کا ایک معمولی غلام بجنے نامی ہے اور اس کے جامع ہندوستان کے مشہور فلسفی و پدانت کے موجد ”دیاس جی“ ہیں۔ جس سے روایت کا پہلو بہت کمزور ہو جاتا ہے اور اغلب ہے کہ اس میں بہت کچھ تحریفات و تغیر ہوئے ہیں، جیسا کہ بنگال کے مشہور مصنف بابوا کے کماروت صاحب، اور بمبئی کے فاضل پنڈت کانشی ناتھ ترسک تیلنگ کا بھی خیال ہے، لیکن پھر بھی کچھ باتیں رہ گئی ہیں۔ حسن میں سچائی

اور صداقت کی جھلک پائی جاتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کرشن ضرور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے بہرہ ور تھا، یا خود اسے کوئی آسمانی نسبت ہو۔

بھاگوت کے اکثر ادھیائوں میں تو حید خالص کا دعویٰ کیا گیا ہے، نہ صرف مادہ، بلکہ ماورای ذات الہی سب کو حادث اور فنا پذیر اور مخلوق بتایا ہے، جنت، دوزخ کے صاف صاف اقرار موجود ہیں۔

دید میں کرشن سے پہلے جن رشیوں نے اپنی اپنی رایوں کا اضافہ کیا ہے، اس کی طرف بھی اشارہ ہے، یہی وہ باتیں ہیں جن سے کرشن کو اریوں کی نظروں سے گرا دیا، حتیٰ کہ کرشن ایک عیاش شریر عجبشی غلام ثابت کیا جاتا ہے، آخر آریوں کے مذہب کی بناء تو کل دو باتوں پر ہے:

۱۔ مادہ، روح، خدا الگ الگ واجب اور موجود لذاتہ ہے۔

۲۔ مکتی (نجات) تناسخ کے ذریعہ سے ہوتی ہے، جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں اور بس۔

اگر آریہ اپنے دونوں عقیدوں سے باز آجائیں، جیسا کہ کرشن اور اس کے شاگرد جن کا عقیدہ تھا، تو پھر قرآن کے کیوں کر منکر ہو سکتے ہیں، اصول میں ہمارا ان سے اختلاف پھر کیا رہ جائے گا....؟

ذیل میں ان ادھیائوں سے ان تمام نمبروں کا اردو ترجمہ درج کرتا ہوں، جس میں گذشتہ دعویٰ کی شہادت موجود ہے۔

ادھیاء ۹، جس کا نام راج ودیا (افضل العلوم) راج گھیہ یوگ (افضل الاسرار و المعارف) ہے، اس میں کرشن ار جن کو مخاطب کرتے ہوئے حسب ادعایہ آسمانی آواز پہنچاتا ہے۔

۱۔ ”کل اجسام کا قیام میرے سبب ہے، نہ کہ میرا قیام ان کے سبب، میں اس عالم پر پوشیدہ طور سے محیط ہوں۔“

۱۔..... کو اس وقت جو مجموعہ بھاگوت کا ہے، اس کے اعتبار سے وہ ایک فلسفی اور خود غرض، نکتہ آفرین متصوف معلوم ہوتا ہے، و اعلم عند اللہ۔

۲۔..... عیاش وغیرہ جو باتیں ہیں، وہ تو رادھا اور گوپیوں کے نقص سے ماخوذ ہے اور حبشی شور صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ کرشن کے معنی ”کالے“ کے ہیں اور شاید کرشن کارنگ بھی کالا تھا۔ ۱۲

۳۔..... یعنی: جس کو عقل بشر ہی نہیں سمجھ سکتی ۱۳

۲۔ ”تو میری“ اس قدرت کاملہ کو دیکھ! کہ نہ تو موجودات کا میری ذات میں قیام ہے اور نہ میری ذات باوجود موجودات کے ظہور دینے کے اور موجود کرنے کے موجودات میں مقیم ہے۔“

۳۔ میں منزل مقصود، پروردگار، مالک، شاہد، قیوم، ماویٰ، مرجع، زب، خلق، و فنا کا مرکز اور غیر فانی تھم ہوں۔“

اس ادھیاء میں اسی قسم کی موحدانہ تعلیم ہے، جس میں کہیں کہیں حلول و اتحاد کا شبہ ہوتا ہے، لیکن جبکہ منتر نمبر (۲) اس کی صراحتہ نفی ہے۔

تو ان سب کو اسی پر عمل کرنا چاہئے، اخیر میں یہ ادھیاء اس جملہ پر ختم ہو جاتا ہے:

”مجھ میں دل لگا، میری پرستش کر اور میری ہی بندگی کر، تو اس طریقہ سے اپنی ہستی کو میرے حوالہ کر کے مجھ سے ملے گا۔“

تو دیکھو! اس میں ”گو تم“ کے فلسفہ کی کب گنجائش ہے۔

﴿سبحان اللہ الذی بیدہ ملکوت کل شیء والیہ

ترجعون﴾

پس پاک ذات ہے جس کے ہاتھ آسمان و زمین کی بادشاہت ہے اور اسی کی طرف تم لوگ لوٹنے والے ہو۔“

اور صرف اسی پر کیوں بس ہو، تمام عالم کے فنا ہونے کی خبر سن کر کرشن ان لفظوں میں دیتا ہے:

”اس عالم ظاہری سے بالاتر وہ ہستی بحث ہے، جو پوشیدہ اور لازوال ہے اور جو کل

موجودات کے فنا ہونے پر بھی فنا نہیں ہوتا۔“ ادھیاء آٹھ نمبر ۲۰

بتاؤ کہ روح و مادہ کو غیر فانی کہنے والے اگر اس منتر کو دیکھ کر بیچارے کرشن کو جیسی زادہ

نہ کہیں تو اور کیا کہیں...؟

قرآن بھی:

﴿کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال

والا کرام ﴿﴾

”جو کچھ زمین پر ہے، سب فنا ہونے والے ہیں اور صرف ذوالجلال والا کرام کی ذات رہنے والی ہے۔“

”تو سمجھ کہ تمام مخلوقات اسی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، میں کل عالم کی پیدائش اور فنا کا مرکز ہوں۔“

قرآن بھی اپنے ہر ورق میں:

﴿تَبْرَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمَلِكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾

”مبارک ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہت ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرِ اللَّهِ﴾

”کیا خدا کے علاوہ اور بھی کوئی پیدا کرنے والا ہے۔“

فرماتا ہے، یہ چند جتہ جتہ منتر ہیں، جو میں نے تھا گوت سے بالاختصار نقل کئے ہیں، ورنہ اس کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ بجز چند مقامات کے جن کی صحیح ادبی تاویل ہو سکتی ہے اور تمام بھاگوت اسی سے ملو ہے، بلکہ گوتم کے فلسفہ پرستوں نے وید میں جہاں جہاں اس کی تثلیث کو مختلط کیا ہے، اس کی طرف بھی کرشن ہی نے اشارہ کیا ہے اور بتایا کہ وید محرف ہو چکی، صحیح توحید کا ملنا اس میں ممکن نہیں، دوسری ادھیا جس کا نام ساکھ یوگ (یعنی: علم و عرفان ہے) اس کا پینتالیسواں منتر ہے۔

”ویدوں میں تثلیث^۱ ہے، ارجن! تو اس تثلیث سے برتر ہو اور دوئی چھوڑ دے، ایک حالت توحیدی، و قیومی، اختیار کر۔“

پھر جو لوگ آج وید کی تحریف کے منکر ہیں، کیا پوچھتے ہو! کہ ان کے دل پر کرشن کے اس منتر سے کیا صدمہ پہنچا ہوگا، قرآن مجید نے بھی یہی کہا:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ وَمَا مِنْ آلِهِ إِلَّا

إِلَهُ وَاحِدٌ﴾

۱: یعنی: مادہ، روح، خدا تین انادیوں اور واجوں کا خیال پایا جاتا ہے، جیسا کہ آج کل کے آریہ کہتے ہیں، بہر کیف اگر ہے، تو بقول کرشن وہ قابل چھوڑنے کے ہے۔ ۱۲

”کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ خدا تین کا تیسرا ہے، حالانکہ ایک معبود کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں۔“

کرن اس کے بعد ارجن سے بہشت کا وعدہ کرتا ہے اور جہنم سے ڈراتا ہے، گرچہ بھاگوت میں کہیں کہیں تناخ کا اشارہ بصد کاوش وغور ملتا ہے، جیسا کہ ہمارے بعض آریہ حضرات قرآن مجید سے تناخ نکلنا چاہتے ہیں، لیکن اس کی جو کچھ حقیقت ہے، وہ خود ایک سنا تن دہری قدیم خیال کے جید فاضل اور ہندوؤں کے جلیل پنڈت رای بہادر جاکئی ناتھ مدن کشمیری، سوامن مدگلہ، گوتر جنہوں نے بھاگوت کا ایک ٹیکا (تفسیر) بھی لکھا ہے، وہ اپنے ٹیکے میں لکھتے ہیں:

”عوام کے جو خیالات اس کے (روح) پیدا ہونے اور ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہونے کی نسبت ہیں، وہ واقعات پر مبنی نہیں ہیں اور ان کے علم کی حقیقت سے ناواقفیت ظاہر کرتی ہے۔“

بعض مستقدمین نے اپنی تصریحات میں آواگون، یعنی: تناخ کے مسئلہ کو نا سمجھوں کی بدافعالی سے بچانے کے لئے نیم ورجا کے پیرایہ میں بیان کیا ہے اور اسکو نیم ورجا کے کلام سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔“

اس کے بعد اسی پنڈت کے الفاظ ہیں:

”آجکل آواگون کے معنی عام طور پر یہ لئے جاتے ہیں کہ جان ایک قالب کو چھوڑ کر دوسرے قالب میں پیدا ہوتی ہے اور جسم سابق کے فعلوں کا نتیجہ وہاں پاتی ہے، مگر اس خیال کے ثبوت میں کوئی کافی دلیل نہیں دی جاتی اور جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں، وہ غور و فکر کرنے پر پایہ ثبوت سے گر جاتے ہیں۔“

(دیکھو ٹیکا مذکور ص: ۲۴۰ مطبوعہ مٹھرا پریس)

اس مضمون سے ذیل کے نتائج پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ تناخ وید کا کوئی مسئلہ نہیں، بلکہ بعض مستقدمین کی اختراع ہے (جس کی تفصیل میں

نے اپنے مضمون ”تناخ“ میں پورے طور پر کی ہے)

۲۔..... تناخ کے متعلق میں نے ”القاسم“ کے گذشتہ نمبروں میں جو کچھ لکھا ہے، دیکھو! ایک پنڈت ہندو میری اس

رأے کی اصابت کن شاندار لفظوں میں کرتا ہے۔ ۱۲

۲۔ آریوں کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں اور جو ہیں، ناقابل اعتبار ہیں۔

۳۔ بجز عوام کے خواص پنڈت، متنازع کے مسئلہ کے منکر ہیں۔

۴۔ قدیم ہندو رشی اپنے بعض اعراض کے لیے نئے نئے مسئلے تراش کر اس پر مذہبی رنگ چڑھا کر پھیلانے کے عادی تھے۔

بہر کیف اب میں بھاگوت کے ان نصوصات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، جس میں صاف صاف لفظوں میں اس عقیدہ کو بیان کیا گیا ہے، سولہویں ادھیاء کے سولہویں منتر کا ترجمہ یہ ہے:

”جو طرح طرح کے واہمات میں سرگرداں اور غفلت کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں، وہ جو عیش و عشرت میں مصروف رہتے ہیں، وہ ناپاک دوزخ میں پڑتے ہیں۔“

﴿وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى الَّذِي يَصْلِي النَّارَ الْكُبْرَى﴾

”بد بخت (قرآن سے) پرہیز کرتا ہے، جو بڑی آگ میں دیکھے دیا جائے گا۔“

کا ترجمہ ہے، پھر جو لوگ شریروں کے لیے سور اور کوڑوں کا جسم مانتے ہیں، اگر بھاگوت اور کرشن سے بیزار نہ ہوں، تو اور کیا ہوں، ارجن نے جس وقت پانڈوں کی فوج پر نظر ڈالی، جو خدا اس کے بھائیوں، استادوں، دادوں، خسر، سالے سے بہری ہوئی تھی، تو اس کا جی بھرا آیا اور کرشن سے مخاطب ہو کر جو اس وقت جہاد پر آمادہ کر رہا تھا، کہتا ہے:

”اے کرشن! خاندان کی ہلاکت سے خاندان کی قدیم نیک افعالی جاتی رہتی ہے، اور نیک افعالی کے غارت ہونے سے بد افعالی ضرور کل خاندان میں پھیل جاتی ہے، اے کرشن! افعال ذمہ کے پھیل جانے سے خاندان کی عورتیں ضرور بد افعال ہو جاتی ہیں اور بد افعال عورتوں سے اولاد ناجائز پیدا ہوتی ہے۔“

اور اولاد ناجائز خاندان کے قتل کرنے والوں کو اور ان کی اولاد کو دوزخ میں پہنچاتی ہے، اس کے بعد ارجن کا دل اور زیادہ کانپا اور اسے کہا: ”اے جناردن! میں نے سنا ہے کہ ان لوگوں کو جن کے خاندان سے نیکی جاتی رہتی ہے، ضرور دوزخ میں مقام ہوتا ہے؟“

ارجن کے ان خیالات سے ذیل کے نتائج باسانی نکل آتے ہیں:

(۱) ارجن خود دوزخ کا قائل تھا۔

(۲) اس کے زمانے میں تناخ کی سزا کا علم بھی کسی کو نہ تھا۔

(۳) کرشن اس کی اس گفتگو پر دوزخ کی تردید نہیں کرتا، بلکہ جو کچھ کہتا ہے، وہ یہ ہے:

”اے ارجن! اپنے فرائض پر بھی نظر کر کے تجھے جنگ سے نہ ڈرنا چاہئے، حق و صداقت کے لیے جنگ سے بہتر سپاہی کے لیے اور کوئی چیز نہیں۔“

”بلا کوشش بہشت کا دروازہ کھلا ہوا ہے، ملتا ہے، ارجن تجھ جیسا صاحب قسمت

سپاہی ایسا موقع جنگ کے لیے پاتے ہیں، ارجن! اگر مارا جائے گا، بہشت پائے گا

اور فوجباب تو سلطنت پائے گا، اے ارجن! جنگ کی ٹھان کر کھڑا ہو۔“

(دوسری ادھیاء کے مختلف منتر)

قرآن بھی ان لوگوں کو جنہیں وہ کفر و شرک کے مٹانے کے لیے جنگ پر آمادہ کرنا

چاہتا ہے، یہی سکھاتا ہے:

﴿ان تر بص منکم الا احدی الحسنین﴾

”ہم تم سے (اے کفار) دو نیکیوں میں سے ایک کے منتظر ہیں۔“ (یعنی:

بہشت، یا فتح)

ان تمام مباحث سے میری غرض صرف اس حیرت کا ازالہ ہے، جو نامہ نگار خطیب کو

آریوں کی جانب سے پیدا ہوئی، کیا اس کے بعد بھی آریوں کا بغض، کرشن اور اس کی گیتا

سے قابل تعجب ہے؟

کیا لالہ لاجپت رائے اس دغل قلبی کو کبھی ظاہر کر سکتے ہیں؟

﴿وما تخفی صدور ہم اکبر﴾

”اور جو کچھ ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں، وہ اس سے بھی بڑی ہیں۔“

بھاگوت میں طبع کے بعد تحریف کی گنجائش بھی نہیں رہی، اب بجز اس کے کہ اس کی

توہین کریں اور کوئی چارہ نہیں۔

﴿بل اتبع الذین ظلموا اھواء ہم﴾

”بلکہ ظلم کرنے والوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی بغیر کسی علم کے کی ہے۔“

خاتمہ میں اس ابتدائی دیباچہ کا وہ ٹکڑہ بھی نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جسے بھاگوت

کے پڑھانے والے ابتداء درس میں پڑھایا کرتے تھے، جس میں نہ صرف بہشت، بلکہ طوبیٰ جو اس کا مشہور درخت ہے، اس کا نام موجود ہے، بھاگوت کے پڑھانے والے ابتدا میں کرشن پر سلام بھیجتے تھے، ان کے الفاظ یہ ہوتے تھے:

”شری کرشن مہاراج کونمسکار (سلام) جو کہ بمنزلہ درخت طوبیٰ ہیں الخ“

اخیر میں ہم اس پر بھی تنبیہ کر دینا چاہتے ہیں کہ کہیں ہماری ان باتوں سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں کرشن کو پیغمبر یا بھاگوت کو وحی آسمانی سمجھتا ہوں، یاد رکھو ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں، ہمارے لئے قرآن حکیم و مجید کافی ہے اور اس وقت تمام عالم کو اس سے چارہ نہیں، دنیا کی کوئی کتاب توحید کی صحیح روشنی صاف لفظوں میں قرآن کے علاوہ اس زمانہ میں کسی میں بھی نہیں پہنچ سکتی۔

﴿ان هذا القرآن يهدي للتي هي اقوم﴾

”بلاشبہ یہ قرآن نہایت مضبوط راستے کی ہدایت کرتا ہے۔“

کرشن کے جتنے معارف توحید ہیں، ایسی باتیں مسلمانوں کے معمولی معمولی علماء کی کتابوں میں اس سے زیادہ تفصیل سے موجود ہیں، تو کیا اس سے ان کی کتابیں وحی آسمانی ہو جائیں گی اور وہ پیغمبر ہو جائیں گے؟

﴿فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم

لا يجدوا في انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما﴾

”ہرگز نہیں، قسم ہے تیرے رب کی (اے محمد!) وہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے حتیٰ کہ جن باتوں میں وہ جھگڑ رہے ہیں، اس میں تمہیں فیصلہ کرنے والا مقرر کریں، پھر اپنے اندر اس فیصلہ سے جو تو نے کیا ہو، کسی قسم کی خلش نہ پائیں اور ڈال دیں اپنی گردنیں (اس فیصلہ پر) خوب اچھی طرح۔“

وہا اذنی خویدم الدین القیم و الصراط الاقوم

سید مناظر احسن غفر اللہ لہ و نصرہ علی اعداء الدین

ویشدازرہ بالکتاب المبین والمؤمنین الخالصین

(ماہنامہ الرشید دیوبند)



مناظرہ

جس مناظرہ کو اب ہم شروع کرتے ہیں، یہ ایک مشہور مناظرہ ہے اور ایک ایسے مسئلہ پر ہوا کہ جس کی مدت سے چھان بین ہو رہی تھی۔ حضرات محققین میں سے جو شخص جس نتیجہ پر پہنچتا تھا، وہ اپنی تحقیق سے فوراً سب کو مطلع کرتا تھا اور دوسرے حضرات نہایت صفائی اور اخلاص کی ساتھ یا تو اس پر رد و قدح کرتے اور یا اس کی موافقت کرتے تھے۔ اسی جہاں بین کے زمانہ میں اتفاقاً ابواسحاق شیرازی اور ابو عبد اللہ محمد بن علی بن محمد دامغانی کسی ایک مجلس میں مجتمع ہو گئے۔

قاعدہ ہے کہ جب کسی مسئلہ میں تحقیق کا باب کھلا ہوا ہوتا ہے، دلائل و براہین قائم کئے جاتے ہیں۔ ان پر ممنوع اور نقوض کا ورود ہوتا رہتا ہے، تو اس زمانہ میں عوام کی زبان پر بھی وہی مسئلہ ہوتا ہے اور خواہ وہ کسی قسم کی قابلیت رکھتے ہوں، یا نہ رکھتے ہوں، ان کو اپنی رائے زنی سے کام ہوتا ہے اور اگر کسی مجمع میں وہ اہل علم کا مجمع دیکھ لیتے ہیں، تو اسی مجمع میں اس مسئلہ کو بطور استفادہ کے پیش کر دیتے ہیں، تاکہ جواب ملنے پر جو اہل علم اس کے مخالف ہوں، اس کا رد کر دیں اور بغیر کسی شرط و قید و وقت کے مناظرہ شروع ہو جائے۔

ہمارے زمانہ میں تو عوام کی زیر کی یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ وہ ایسے علماء کو کہ جن کی تحقیق کسی مسئلہ میں مختلف ہوتی ہے، اپنے یہاں ضیافت میں مدعو کر دیتے ہیں، نہ ان مولوی

ان..... آپ احناف کے مشہور محقق ائمہ میں سے ہیں، بغداد کی مسند قضا کو بھی آپ سے زینت حاصل ہو چکی ہے، آپ کی پیدائش ۳۹۸ھ میں ہوئی اور ۴۷۸ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ بعض ۴۰۰ھ میں ولادت اور ۴۷۸ھ میں وفات بیان کرتے ہیں۔ آپ کے علم و فضل کا حال ممکن ہے کہ ہم کسی اگلی اشاعت میں لکھیں، مگر اس وقت صرف نمونہ کے طور پر اس قدر عرض کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ قاضی ابوالطیب کا قول آپ کے بارے میں یہ ہے:

”الد امغانی اعرف بمذہب الشافعی من کثیر من اصحابنا“

”دامغانی امام شافعی کے مذہب کو شوافع میں سے اکثر سے زیادہ جانتے ہیں۔“

جب باوجود حنفی ہونے کے مذہب کی تحقیق کا یہ حال تھا کہ خود شوافع سے بھی زیادہ ماہر تھے، تو خود اپنے مذہب کی تحقیق ظاہر ہے کہ کیا توت رکھتی ہوگی۔ ۱۲۔

صاحب کو خبر ہوتی ہے کہ فلاں مولوی صاحب بھی تشریف لاویں گے، نہ ان کو ان کی خبر۔ اس اجتماع کے بعد اسی مختلف فیہا مسئلہ کو بطور سوال پیش کر کے مناظرہ شروع کر دیتے ہیں۔

مسئلہ یہ تھا کہ سلطنت اسلامی میں جو محصول کفار سے (یعنی: جزیہ) وصول کیا جاتا ہے، اگر وہ شخص کہ جس سے محصول وصول کیا جاتا ہے، مسلمان ہو جائے، تو گذشتہ زمانہ کا محصول جو اس پر واجب ہو چکا تھا، اب مسلمان ہونے کے بعد اس سے وصول کیا جاسکتا ہے، یا نہیں؟ مثلاً زید ایک کافر شخص تھا کہ جو اسلامی سلطنت میں رہا کرتا تھا، سال بھر کا جزیہ اس پر واجب الادا ہو چکا تھا، اس کے بعد وہ مسلمان ہو گیا، سال بھر کا جزیہ جو کہ کفر کی حالت میں اس پر واجب ہو چکا تھا، اب اسلام کی حالت میں وصول کیا جاسکتا ہے، یا نہیں؟

اکابر امت کی آراء اس میں مختلف تھیں۔ ایک جماعت کی تحقیق تھی کہ اسلام کے بعد بھی محصول واجب الادا رہے گا اور اس نے اسلام کا اثر کفر کی حالت کے جزیہ پر کچھ نہ پڑے گا۔ دوسرا فریق کہتا تھا کہ مسلمان سے جزیہ لئے جانے کے کوئی معنی ہی نہیں، اس لیے خواہ وہ جزیہ کے وجوب سے پہلے مسلمان ہوا ہو، یا وجوب کے بعد، کسی صورت میں اس سے زمانہ گذشتہ کا واجب شدہ جزیہ وصول نہیں کیا جاسکتا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ زمانہ گذشتہ کا واجب شدہ جزیہ مسلمان ہونے کے بعد ساقط نہیں ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ جب دونوں حضرات ایک جگہ جمع ہو گئے، تو وہیں کسی شخص نے اس مسئلہ کے متعلق سوال کیا۔ امام ابو اسحاق شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے بلا تکلف فرمایا کہ میں اس کی پوری تحقیق کر چکا ہوں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اس میں صحیح ہے۔ سائل نے اس جواب پر اکتفا نہ کیا، بلکہ باادب یہ بھی عرض کیا کہ اس پر دلیل کیا ہے؟ کیا آج کل یہ ممکن ہے کہ کوئی مستفتی کسی مفتی سے فتویٰ کی دلیل کا مطالبہ کرے اور مفتی اس کو اس گستاخی کی کامل سزا دے...؟

لیکن امام ابو اسحاق شیرازی نے سائل کو رجز کیا، نہ اس پر ناراض ہوئے، بلکہ نہایت متانت سے اس جواب کی دلیل بیان کی اور فرمایا کہ کافر پر درود، طرح کے خراج واجب ہوتے ہیں۔ ایک کا تعلق خود اس کافر کی ذات سے ہے، دوسرے کا تعلق اس کی زمین سے۔ پہلا جسے ”خراج الارس“ کہنا بیجا نہیں ہے، جزیہ کہا جاتا ہے۔ دوسرا جس کو ”خراج الارض“

کہنا چاہئے، خراج سے موسوم ہے۔ ان دونوں خراجوں میں سے ایک خراج، یعنی: خراج الارض کی نسبت مخالفین اور موافقین سب کی یہی رائے ہے کہ اگر اس کا وجوب حالت کفر میں ہو چکا ہے، تو اگرچہ وہ مالک زمین کفر چھوڑ کر مسلمان بھی ہو جاوے، تب بھی یہ خراج اس سے وصول کیا جاوے گا اور اس کے ذمہ سے ساقط نہ ہو سکے گا۔ جب دونوں خراج برابر درجہ کے ہیں اور ایک کے متعلق سب کی رائے عدم سقوط بعد الوجوب کی ہے، تو پھر دوسرے خراج، یعنی: جزیہ کے متعلق باوجود مساوات کے یہی حکم کیوں نہیں دیا جاتا؟ تھوڑے سے غور کے بعد یہ بات باآسانی معلوم ہو سکتی ہے کہ جب دونوں مساوی ہیں، تو ان کے حکم میں تفریق کی وجہ معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔

شیخ عبداللہ نے اس تمام تقریر کو کامل غور و خوض کیساتھ سن کر فرمایا کہ ”مگر جناب مجھ کو اس پر کئی شکوک ہیں“۔

اول: تو یہ کہ اس میں کون سا عقلی، یا نقلی امتناع ہے کہ خراج کی دو قسموں میں سے ایک قسم میں بعض ایسی شرطیں لگی ہوئی ہوں کہ جو اس کے مقابل دوسری قسم میں موجود ہوں۔ میرے نزدیک اس کو تسلیم کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں کہ جب دو چیزیں ایک چیز کی قسمیں ہوں، تو جو شرائط ایک میں ہوں گی، انہیں شرط سے دوسری قسم بھی مفید ہوگی اور صرف یہی نہیں کہ میرے پاس اس کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں، بلکہ غور کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خلاف پر دلیل موجود ہے، یعنی: دلیل سے یہ بات ثابت ہے کہ دو چیزیں ایک ہی چیز کی قسمیں ہوتی ہیں، مگر ایک چیز میں بعض ایسی شرطیں ہوتی ہیں کہ جو دوسری میں نہیں پائی جاتی ہیں۔

مثلاً: زکوٰۃ کی دو قسمیں ہیں، ایک زکوٰۃ فطر (صدقہ الفطر) دوسری زکوٰۃ مال اور یہ سب کو معلوم ہے کہ باوجود یہ کہ دونوں قسمیں ایک ہی چیز کی ہیں، لیکن زکوٰۃ مال میں نصاب کی شرط ہے اور زکوٰۃ فطر میں شرط نہیں۔

ثانی: یہ کہ ممکن ہے کہ دو حق اس قسم کے ہوں کہ ان کا تعلق کفر کے ساتھ ہو، لیکن ان میں سے ایک تو ایسا ضعیف التعلق ہو کہ اسلام کی وجہ سے ساقط ہو جاتا ہو اور دوسرا حق ایسا نہ ہو کہ وجوب کے بعد کسی صورت سے ساقط ہو بھی نہیں سکتا ہے۔ مجھ کو ضرورت ہے کہ میں اپنی اس تقریر کی توضیح مثال کے ذریعے کروں، تاکہ میرا مدعا ذہن نشین ہو جائے۔ اس لئے

مثال عرض ہے کہ بنی نوع انسانی کو باوجود معظم و مشرف ہونے کے غلام بنا لینا، یا قتل کر دینا دو حق ہیں، جن کا تعلق کفر کیساتھ ہے، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ان میں سے ایک کا سقوط اسلام کی وجہ سے ہو جاتا ہے، یعنی: اگر کوئی کافر مسلمان ہو جائے، تو اس کو قتل نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن غلام بنائے رکھنا بعد مسلمان ہونے کے بھی جائز ہے۔ بعینہ یہاں پر بھی اس طرح ہے کہ دو حق (جزیہ اور خراج) بشرط کفر واجب ہوتے ہیں، لیکن ایک اسلام کی وجہ سے ساقط ہو جاتا ہے، دوسرا نہیں۔

ثالث: یہ کہ آپ نے اس جزیہ کو خراج ارض پر قیاس کیا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ مقیس اور مقیس علیہ میں مساوات ہے، یا فراق۔ سرسری نظر میں اگرچہ مساوات معلوم ہوتی ہے، مگر غور کے ساتھ تحقیق کرنے کے بعد یہی امر محقق ہوتا ہے کہ دونوں میں افتراق ہوتا ہے، نہ کہ مساوات، اس لیے کہ خراج الارض مالک زمین پر محض اس وجہ سے واجب ہوتا ہے کہ مالک زمین کو اس امر کی قدرت حاصل ہے کہ وہ اس زمین سے نفع اٹھا سکے، اسی قدرت پر وجوب خراج کا مدار ہے۔ اگر یہ قدرت مالک زمین کو حاصل ہے، تو خراج واجب ہو کر رہے گا، خواہ اس نے زراعت کی ہو، یا نہ کی ہو اور اگر اس کو قدرت ہی حاصل نہ ہوئی، تو خراج بھی واجب نہ ہوگا اور یہ قدرت کے وجوب خراج کا عداؤ وجوداً انداز ہے، ایک ایسا سبب ہے کہ اس کی وجہ سے حالت اسلام میں بھی اہل اسلام پر حق واجب ہو جاتا ہے، جیسا کہ زمین کی پیداوار میں سے عشر۔ اس سبب کی اس حقیقت پر غور کرنے سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ سبب کسی مسلمان پر ابتداءً وجوب حق کا سبب بھی بن سکتا ہے، پھر اگر اس سبب کی وجہ سے وہ حق جو کہ پہلے سے ثابت اور واجب ہو چکا تھا، اب اپنے حال پر باقی رہے، تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، اس لیے خراج ارض میں تو خواہ کافر ہو، یا مسلم ایک حکم میں دونوں کا داخل نہ ہونا قابل تعجب ہے، نہ خارج از قیاس۔

لیکن بھوت عنہا صورت میں یہ بات نہیں ہے، اس واسطے کہ وجوب جزیہ کے سبب کا تعلق صرف کفر کی حالت کے ساتھ ہی کوئی نظیر ایسی نہیں ہے کہ جو اس امر کو ثابت کر سکے کہ اسلام میں بھی کسی پر کوئی ایسا حق ثابت ہوا ہو کہ جس کا تعلق وجوب جزیہ کے سبب سے ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وجوب جزیہ کا سبب اسلام کے بالکل منافی ہے۔ بناءً علیہ اگر

حالت اسلام میں وہ حق ساقط ہو جائے جو کہ حالت کفر میں کسی ایسے سبب سے واجب ہوا ہے کہ اسلام کے بالکل منافی ہے، تو اس میں کون سا استبعاد ہے...؟

امام ابوسعیدؓ! آپ کے پہلے ایک اعتراض کے متعلق میں تین جواب دے سکتا ہوں۔
 ۱۔ یہ مثال میرے عرض کئے ہوئے کی دلیل ہو سکتی ہے۔ آپ کے مدعا کے اثبات سے تو اس کو کچھ تعلق ہی نہیں، پھر آپ نے یہ خیال کیونکر قائم کر لیا کہ اس مثال سے آپ فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اس واسطے کہ جب یہ امر طے شدہ ہے کہ زکوٰۃ فطر اور زکوٰۃ مال دونوں کا سبب وجوب اسلام ہے اور یہ بھی محقق ہے کہ کفر زکوٰۃ فطر اور زکوٰۃ مال دونوں کے منافی ہے، تو یہ بھی یقیناً واجب التسلیم ہے کہ ان دونوں کے ساقط کرنے میں بھی کفر مؤثر تام اور کامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص پر زکوٰۃ فطر واجب ہو چکی ہے اور واجب ہونے کے بعد (العیاذ باللہ) وہ بدنصیب مرتد ہو گیا ہو، تو یہ زکوٰۃ فطر اس پر سے ساقط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص پر زکوٰۃ مال واجب ہو چکی ہو اور وہ شخص اس زکوٰۃ کے واجب ہو چکنے کے بعد (العیاذ باللہ) مرتد ہو گیا ہو، تب بھی یہی حکم ہے۔ اب یہ بات بالکل متعجب ہو گئی کہ کفر کی تاثیر ان دونوں کے ساقط کرنے میں بالکل ہی مساویانہ درجہ میں ہے۔ اس قاعدہ کو یہاں پر بھی منطبق فرمایا جائے اس طرح پر کہ چونکہ ان دونوں خراجوں (جزیہ اور خراج ارض) کا سبب صرف کفر ہے اور اسلام ان دونوں کے منافی ہے، تو جس طرح کہ جو چیز اسلام کی وجہ سے واجب و ثابت ہوئی تھی، وہ اس کے منافی، یعنی کفر کی وجہ سے ساقط ہو کر رہتی تھیں، ٹھیک اسی طریقہ سے جن دو خراجوں (جزیہ اور خراج ارض) کا سبب وجوب کفر ہے، وہ دونوں چیزیں کفر کے منافی، یعنی اسلام سے ساقط ہو جائیں گی۔ بناءً علیٰ ہذا یہ حکم دینا چاہیے کہ اسلام کی وجہ سے دونوں خراج بغیر کسی فرق کے ساقط ہو جایا کرتے، لیکن یہ بات دلائل و براہین سے ثابت کی جا چکی ہے کہ ان میں سے ایک (خراج ارض) اسلام کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتا ہے، اس لیے یہی حکم دوسرے (جزیہ) کو بھی دیا جاوے گا۔

۲۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ فطر اور زکوٰۃ مال کا اس امر کی نظیر قرار دینا ہی صحیح نہیں ہے کہ ایک چیز کی دو قسموں میں سے اگر ایک میں کوئی چیز شرط ہو، تو ضروری نہیں کہ دوسری میں بھی شرط ہو، اس واسطے کہ زکوٰۃ فطر اور زکوٰۃ مال دونوں مساوات کا درجہ رکھتی ہی نہیں۔ خود

ان دونوں کے آپس میں افتراق موجود ہے، اس واسطے کہ زکوٰۃ فطر کی حالت اس امر میں تمام اقسام، زکوٰۃ سے بالکل جداگانہ ہے کہ اس کا تعلق ذمہ مکلف سے ہوتا ہے، اقسام زکوٰۃ میں سے کسی قسم کی زکوٰۃ کا تعلق مکلف کے ذمہ سے نہیں ہوتا ہے، اس لیے وہ اگر اعتبار نصاب میں بھی زکوٰۃ مال سے جداگانہ شان رکھے، تو اس میں کیا تعجب ہے۔

اب دونوں خراجوں (جزیہ، خراج ارض) کی حالت پر نظر ڈالئے، تو کسی بات میں جدا جدا نظر نہیں آتے، بلکہ جس طرح ان دونوں کے وجود کے لیے کفر کا وجود ضروری ہے، اسی طرح اسلام ان میں سے ہر ایک کے لیے منافی ہے، اس لیے اب ضروری ہے کہ ان دونوں خراجوں کا ایک ہی حکم رہنا چاہئے۔ بناءً علیہ بجز اس حکم کے ماننے کے اور کوئی چارہ ہی نہیں کہ ان میں سے اگر ایک اسلام کی وجہ سے ساقط ہو سکتا ہے، تو دوسرا بھی ساقط ہو جاتا ہے۔

۳۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ فطر میں نصاب کے اعتبار کی بظاہر کوئی معقول وجہ بھی نہیں معلوم ہوتی ہے، اس واسطے کہ مکلف کے پاس مال خواہ کتنا ہی زائد کیوں نہ ہو، مگر زکوٰۃ فطر کی مقدار اسی قدر واجب ہوگی جس قدر کہ ان لوگوں پر ہے، جو کم مال والے ہیں، مال کی کمی زیادتی کا کچھ بھی اثر زکوٰۃ کی کمی زیادتی پر نہیں پڑتا، چونکہ اس حالت میں نصاب کا اعتبار کرنا غیر مفید، بلکہ لغو تھا، اس لیے اس میں نصاب کا اعتبار ہی نہیں کیا گیا، لیکن زکوٰۃ فطر کے علاوہ زکوٰۃ کی دو قسمیں مال کی زیادتی اور کمی سے تعلق رکھتی ہیں، جیسے جیسے مال بڑھتا جاتا ہے، ویسے ویسے ان میں بھی زیادتی ہو جاتی ہے، اس لیے ان میں نصاب کا اعتبار کیا جانا ضروری ہے۔

لیکن ان دونوں خراجوں (جزیہ اور خراج الارض) کا حال جیسا کہ میں ابھی گذارش کر چکا ہوں، بالکل ایک سا ہے۔ کسی قسم کا کچھ فرق نہیں ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں اسلام میں بھی برابر ہیں، اگر یہ ساقط ہوتا ہے، تو اس کو بھی ساقط ہونا چاہئے۔

آپ نے دوسرا اعتراض قتل اور غلام بنالینے کی صورتوں کو پیش نظر کر کے کیا ہے، میں ان کو بھی اس قابل نہیں سمجھتا ہوں کہ ان کو لے کر اعتراض کیا جاسکے اور میرے خیال میں اس اعتراض کا جواب دو طریقہ سے ہو سکتا ہے:

اول: تو یہی کہ قتل اور غلام بنالینا دونوں مختلف جنسیں ہیں اور جب ان دونوں میں

جنس کا اختلاف موجود ہے، تو اگر ان کے احکام میں بھی اختلاف ہو جائے، تو کیا نقصان ہے۔

دوم: یہ کہ اگر کسی شخص کو حالت کفر میں غلام بنایا گیا، تو اس کے بعد بحالت اسلام کوئی جدید بات نہیں کی جاتی، بلکہ وہی غلامی اپنے حال پر باقی رہتی ہے، یعنی: جو چیز کفر کی وجہ سے اولاً (بحالت کفر) ثابت ہو چکی تھی، اسی کو باقی رکھا جاتا ہے اور قتل کی شان اس سے بالکل جدا ہے، اس واسطے کہ وہ جس حالت میں ہوگی، ابتدائی عقوبت ہوگی۔ اب اگر کسی کو بعد اسلام کے سزائے قتل دی جائے، تو گویا اسلام میں اس پر ایک سزا ابتداءً واجب کی گئی، لہذا ان دونوں کا احکام میں اختلاف صرف مناسب ہی نہیں، بلکہ ضروری بھی ہے۔

لیکن ان دونوں خراجوں (جزیہ اور خراج ارض) کے مسئلہ میں تو اس پر بہت زیادہ غائر نظر کرنے کے بعد بھی اس سے زیادہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا جاسکتا ہے کہ دونوں کی حالت ایک ہی ہے، کیونکہ اس میں اس سے زیادہ اور کیا ہوتا ہے کہ جس مال کا وجوب گذشتہ زمانہ میں اس پر ہو چکا ہے، اس کو اس وقت اس سے وصول کیا جاوے، کسی قسم کی کوئی نئی بات اس پر اس وقت واجب ہی نہیں کی جاتی ہے، اس لیے یہی حکم دیا جاسکتا ہے کہ اگر ان میں سے ایک ساقط نہ ہو، تو دوسرے کو بھی ساقط نہ ہونا چاہئے۔

سوم: تیسرا اعتراض بھی میرے نزدیک زیادہ قوی نہیں، اور میرے خیال میں اس کا جواب بھی دو طریقوں سے دیا جاسکتا ہے:

۱۔ یہی کہ یہ کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ وجوب خراج کا سبب ایسا سبب ہے کہ اس سے بعد اسلام کے حقوق کا وجوب ہوتا رہتا ہے، میں اس کو تسلیم ہی نہیں کرتا ہوں، اس واسطے کہ خراج تو صرف اس وجہ سے واجب ہوا ہے کہ مالک زمین باوجود کافر ہونے کے زمین سے انتفاع پر قادر ہے اور عشر کا وجوب زمین پر محض حق خداوندی میں ہوا ہے، یعنی: اسلام کی وجہ سے اب یہ کیونکر صحیح کہا جاسکتا ہے کہ سبب خراج ایسا ہے کہ اسلام اس کے منافی نہیں۔

۲۔ یہ کہ اگر اس صورت میں کوئی حق ایسا نکلتا ہے کہ جس کا تعلق اس سبب سے ہے کہ جو کہ خراج کے وجوب کا ہے، اس پر مناسب ہے کہ جو کچھ اس پر مال کفر میں واجب ہو چکا تھا، وہ اب حالت اسلام میں بھی باقی رہے، تو اس محوٹ عنہا مسئلہ میں بھی بعینہ یہی صورت

ہونی چاہئے، اس واسطے کہ سبب جزیہ کے مثل سے حق واجب ہوتا ہے، حتیٰ کہ اس کا اثر بھی حالت اسلام کے بعد تک رہتا ہے، کیونکہ زکوٰۃ فطر آخر رقبہ ہی کے بدلہ میں تو ہے اور جزیہ بھی رقبہ ہی کے بدلہ میں ہے۔ بناءً علیہ یہی ہونا چاہئے کہ جو کچھ مالی محصول حالت کفر میں کسی شخص پر واجب ہوا ہو، وہ حالت اسلام میں بھی باقی رہے، اس لیے کہ ان دونوں میں اس وقت تک بھی کچھ فرق نہیں ہوا۔

ابو عبد اللہ: میرے اس اعتراض کے پہلے جواب میں کہ زکوٰۃ کی دو قسمیں ہونے کے باوجود ایک قسم میں کچھ شرطیں ہیں اور دوسری میں کچھ، یہ فرمانا قابل غور ہے کہ یہ تو دلیل ہمارے لئے مفید ہے، نہ کہ مستدل کے، اس واسطے کہ دونوں زکوٰۃ میں اسلام کے اعتبار میں برابر ہی نکلتی ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ بھی تو ناجائز نہیں ہے کہ دونوں خراجوں میں کفر ہی کا اعتبار کیا جاوے، لیکن استیقا اور وصول کرنے کے وقت دونوں کے احکام مختلف ہو جاویں، مثلاً: زکوٰۃ فطر اور زکوٰۃ مال دونوں اتنی بات میں تو مساویانہ درجہ رکھتے ہیں کہ ایک ہی حالت میں دونوں میں مال کا اعتبار کیا جاتا ہے، اس کے باوجود اعتبار کی کیفیت میں دونوں میں کھلا ہوا اختلاف موجود ہے، اس لیے کہ زکوٰۃ فطر میں تو یہ معتبر ہے کہ مکلف کے پاس اس قدر مال ہو کہ وہ حوائج ضروریہ سے باقی بچنے کے بعد زکوٰۃ فطر کو ادا کر سکے اور اس کے سوا جس قدر اقسام زکوٰۃ ہیں، ان سب میں یہ معتبر ہے کہ مکلف کامل نصاب کا مالک ہو۔ ٹھیک اسی طرح یہاں بھی کہا جاسکتا ہے کہ دونوں قسم کے خراج اتنی بات میں تو مساوی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک میں کفر کا اعتبار کیا جاتا ہے اور جب تک کوئی شخص کافر نہیں ہوتا ہے، اس پر ان دونوں قسم کے خراجوں میں سے کوئی خراج واجب نہیں ہوتا ہے، مگر استیقا کے وقت ان دونوں کا حکم مختلف ہو جاوے، اس طرح پر کہ ایک تو باوجودیکہ مکلف کفر سے علیحدہ ہو جاوے، پھر بھی باقی رہے اور دوسرے کے بقائے وجود کا مدار بقاعلیٰ الکفر ہو، جب تک اس کا کفر باقی رہے، وہ محصول بھی باقی رہے اور جب اس کا کفر زائل ہو جائے، وہ حق واجب بھی ساقط ہو جائے۔

اس کا دوسرا جواب بھی دیا جاسکتا ہے، وہ یہ کہ ان دونوں قسم کی زکوٰۃ میں کفر کا اثر صرف ایک ہی طریقہ کا ہے، اس لیے کہ ان دونوں کا وجوب بطور عبادت ہوتا ہے، نہ کہ بطور

عقوبت، اس لیے ان کا استیفا اور وصول کرنا کفر کے بعد جائز نہیں ہو سکتا ہے، اس واسطے کہ کافر کی کوئی عبادت صحیح بھی نہیں ہوتی ہے اور نہ اس کے ذمہ پر کسی عبادت کا وجوب ہو سکتا ہے اور مجوث عنہا مسئلہ کی شان یہ نہیں ہے، اس واسطے کہ جزیہ بچوں پر بھی واجب ہوتا ہے، بڑوں ہی کی تخصیص نہیں، اس واسطے کہ کلام باری میں ہے:

﴿قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ والیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتب حتی یعطوا الجزیہ عن ید وھم صاغرون﴾

”لڑو ان لوگوں سے جو نہ اللہ کو مانتے ہیں اور نہ روزِ آخرت کو اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں، جو حرام کر دی اللہ اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں سچا دین اور ان لوگوں میں سے ہیں، جن کو کتاب ملی ہے، یہاں تک کہ جزیہ دیں اپنے ہاتھوں سے ذلیل ہو کر۔“

اخذِ جزیہ کے لیے صفار اور ذلت و ہوان کو داخل کیا گیا اور مسلمان ہو جانے کے بعد یہ چیزیں کسی طرح داخل ہو ہی نہیں سکتیں، اس لیے کسی طرح ایسی چیز کا استیفا ان سے نہیں کیا جاسکتا ہے، جس کا وجوب ان پر علیٰ سبیل الصغار والہوان ہوا ہو، اس واسطے کہ وہ اب ان لوگوں میں داخل ہی نہیں رہے، جن پر مسلمان کوئی ایسا حق ثابت کر سکیں کہ جس کے وصول کئے جانے میں تذلیل کو بھی داخل کیا گیا ہو، اسی لئے یہ صورت ممکن ہے کہ کسی جگہ مسلمانوں پر کوئی ایسی چیز واجب ہو جائے، جس کا نام اس محصول کا سا ہو جو کہ کفار پر واجب ہوتی ہے، مگر تذلیل وغیرہ کا اس میں شائبہ بھی نہ ہوگا۔ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل عراق پر بھی اس قسم کا محصول مقرر کیا تھا۔

(الرشید دیوبند)

مکالمات

گذشتہ ایام میں مختلف لوگوں کے درمیان بعض ایسی مفید دلچسپ گفتگوئیں ہوئیں ہیں کہ وہ کتابوں کے ذریعہ سے اس وقت تک منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ملک میں ان کی اشاعت انشاء اللہ العزیز مفید ثابت ہوگی۔ اخلاق و ادب، نیز مسائل علمیہ کا ایک بیش بہا ذخیرہ اس طرز سے اردو زبان میں آجائے گا۔ (وافوض امری الی اللہ) ان گفتگوؤں کا عنوان ”مکالمات“ رکھا جاتا ہے۔ جس کے معنی ”باہمی گفتگو کے مضامین“ ہیں۔

مناظر احسن کشف اللہ سوءہ وغفر لہ

شاہ و گدا

یعنی: سلیمان بن عبد الملک اور ابو حازم کا مکالمہ

سلیمان بن عبد الملک بنی امیہ کا مشہور بادشاہ خلیفہ ہے، اس کی حالت اور خلفائے پیشین سے اچھی تھی، اکثر ارباب علم و فضل سے ملتا تھا، قسطنطنیہ پر ایک زبردست حملہ اس کے زمانے میں بھی ہوا، اس کی سلطنت کا رقبہ بہت وسیع تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سلیمان جب مدینہ منورہ آیا، تو اس نے دریافت کیا کہ کیا یہاں کوئی ایسا بزرگ ہے، جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی ہو؟ لوگوں نے ابو حازم بن دینار کا تذکرہ کیا، یہ جلیل القدر صحابی اور حافظ حدیث ہیں، ذہبی نے تذکرہ الحافظ میں ان کا تذکرہ نہایت شاندار لفظوں میں کیا ہے، کجھوریں بیچا کرتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ جن چیزوں کے ملنے کے بعد موت سے انسان ڈرنے لگے، ایسی چیزوں کی تمنا ہی نہ کرنی چاہئے۔ یہ فارسی النسل تھے، ان کی والدہ ایک رومی عورت تھیں۔ ۱۴۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا ہے، بہر حال سلیمان نے آپ کو بلوایا اور اس طرح گفتگو شروع ہوئی:

سلیمان: ابو حازم! یہ کیا بے مروتی ہے، جسے میں دیکھ رہا ہوں؟

ابو حازم: مجھ میں آپ نے کیا بے مروتی دیکھی؟

سلیمان: مدینہ کے جتنے سربر آوردہ لوگ تھے، وہ ہم سے ملنے آئے، مگر تم نہیں آئے، کیا یہ صریح بے مروتی نہیں؟

ابوحازم: میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، تم سچ کہو، اگر مجھ میں اور تم میں پہلے سے شناسائی ہوتی، تو کیا میں اس طرح تمہارے سامنے آسکتا تھا؟ سلیمان نے کہا کہ شیخ سچ کہتا ہے، اس کے بعد اس نے پوچھا:

سلیمان: ابوحازم اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم موت کو ناپسند کرتے ہیں؟

ابوحازم: اس کی وجہ تو کھلی ہوئی ہے، تم لوگوں نے اپنی آخرت برباد کی ہے اور دنیا کو آباد کیا ہے، اس کے بعد ظاہر ہے کہ تم لوگ موت کو ناپسند کرو، اس لیے کہ آباد مقام سے کھنڈروں کی طرف منتقل ہونے کو ہر شخص ناپسند کرتا ہے۔

سلیمان: سچ کہتے ہو، اچھا اے ابوحازم! یہ بتاؤ کہ خدا کے پاس جانے کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟

ابوحازم: نیکو کاروں کے جانے کی یہ کیفیت ہے کہ گویا پردیسی اپنے گھر یا رابل و عیال کے پاس جا رہا ہے اور بدکاروں کی مثال ایسی سمجھو کہ بھاگا ہوا غلام اپنے آقا کے روبرو آ رہا ہے۔

سلیمان نیز سن کر رونے لگا اور بولا کہ اے ابوحازم! خدا کے یہاں میرا کیا حال ہوگا، کاش میں اسے جان لیتا!!!

ابوحازم: اے سلیمان! اس کے جان لینے کی آسان تدبیر ہے، اپنے نفس کو قرآن مجید پر پیش کر، جان لے گا کہ خدا کے ہاں تیرے لئے کیا ہے۔

سلیمان: قرآن میں وہ مقام کہاں پر ہے، جس پر ہم اپنے نفس کو پیش کریں؟

ابوحازم: خدا کا یہ قول: ﴿ان الابرار لفی نعیم وان الفجار لفی جحیم﴾

”نیک بندے ناز و نعمت میں ہوں گے اور بدکار جہنم میں۔“

سلیمان: ابوحازم! پھر خدا کی رحمت کہاں ہے؟

ابوحازم: ﴿قرب من المحسنین﴾ ”نیک بندوں کے قریب“۔^۱

سلیمان: اچھا ابو حازم! یہ بتاؤ کہ سب سے زیادہ دانشمند شخص کون ہے؟
ابو حازم: جو حکمت استوار و مضبوط علم جانتا ہو اور دوسرے کو بھی سکھاتا ہو۔

سلیمان: اچھا سب سے زیادہ احمق کون ہے؟

ابو حازم: جس نے اپنی آخرت کو بیچ کر دوسروں کے لیے دنیا خریدی۔

سلیمان: سب سے زیادہ مقبول دعا کس کی ہے؟

ابو حازم: خدا کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے والوں کی۔

سلیمان: ابو حازم تمہارا ان امور کے متعلق کیا خیال ہے، جن میں ہم ہیں؟ (یعنی خلافت)

ابو حازم: مجھے اس کی تفصیل سے معاف رکھو (گوبا اشارہ کہہ گئے کہ ناگفتہ بہ حالت

ہورہی ہے)۔

سلیمان: تم کو نصیحت کی تبلیغ کرنی چاہئے۔

ابو حازم: سنو! کچھ لوگ ایسے ہیں، جو اس پر (خلافت) اس طرح قابض ہو گئے ہیں کہ

نہ انہوں نے مسلمانوں سے کوئی مشورہ لیا اور نہ اجتماع منعقد ہوا، کچھ نہیں ہوا۔ اس کے بعد ان

لوگوں نے محض دنیا طلبی کے نشہ میں مست ہو کر خوزریاں کیں اور چل دیئے۔ (سلیمان سے

پہلے بنی امیہ کے مشہور ظالم حجاج نے جو کچھ کیا تھا اور اس کے علاوہ بھی چند واقعات کی طرف

اشارہ ہے) کاش میں جانتا کہ (مرنے کے بعد) انہوں نے کیا کہا اور ان سے کیا کہا گیا۔

ابو حازم اس کے بعد خاموش ہو گئے، امراء دربار میں سے ایک خوشامدی بولا کہ یہ کیا

بے ہودہ گفتگو کر رہے ہو؟

ابو حازم بولے کہ جھوٹ بولتا ہے (یعنی: یہ گفتگو بے ہودہ نہیں ہے) اے شخص! اللہ تعالیٰ

نے علماء سے عہد لیا ہے کہ حق کو خوب کھول کھول کر ظاہر کریں اور اسے کسی طرح نہ چھپائیں۔

اس کے بعد سلیمان بولا: حازم! آخر بتاؤ صلاح دینیکی پیدا کرنے کے کیا طریقے ہیں؟

ابو حازم: تکلف چھوڑ، وقار کے ساتھ رہ اور مروت کر۔

سلیمان: اس کے (یعنی: خراج کے) حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

..... کیونکہ دنیا کا حاصل کرنے والا جو کچھ حاصل کرتا ہے، غیروں کے لیے حاصل کرتا ہے، لیکن فقط اس قدر کہ جو

اس نے کھایا اور پہنا۔ ۱۲

ابوحازم: حق کے ساتھ لے اور مستحقین پر خرچ کر۔
 سلیمان: ابوحازم! تم میرے ساتھ رہو، مجھے تم سے فائدہ پہنچے گا اور تمہیں مجھ سے۔
 ابوحازم: میں اس سے پناہ مانگتا ہوں۔
 سلیمان: آخر کیوں؟

ابوحازم: میں اس سے ڈرتا ہوں کہ میں تیری طرف کچھ مائل نہ ہو جاؤں، اس کے بعد خدا مجھے زندگی اور موت میں دو گئے عذاب چکھائے۔
 سلیمان: اچھا تو پھر کوئی نصیحت کرو۔

ابوحازم: اس سے ڈر کہ خدا نے جن مقاموں سے منع کیا ہے، وہاں تجھے وہ دیکھ نہ پائے، جہاں رہنے کا حکم دیا ہے، وہاں تجھے ڈھونڈنا نہ جائے۔ (یعنی: ان مقاموں سے غائب نہ ہونے کی صورت میں تلاش ہوتی ہے)
 سلیمان: ابوحازم میری بہتری کی دعا کرو۔

ابوحازم: اے خدا! اگر سلیمان تیرا دوست ہے، تو اسے دنیا و آخرت کی بھلائیوں کی بشارت دے اور اگر تیرا دشمن ہے، تو اس کی پیشانی کا بال پکڑ کر اسے بھلائی کی طرف کھینچ لے۔
 سلیمان: کچھ اور نصیحت کرو۔

ابوحازم: میں مختصر بیان کر چکا، اگر تم خدا کے دوست ہو، کافی ہے اور اگر اس کے دشمن ہو، تو پھر وعظ کا کیا حاصل، جو تیرا غیر زمانہ کے چلا جائے گا، اس سے کس چیز کی امید کی جاسکتی ہے.....؟

اس کے بعد سلیمان نے آواز دی کہ ”اے غلام! سوا شرفیاں لانا اور ہاتھ میں لے کر ابوحازم کی طرف بڑھا کر بولا:
 سلیمان: ابوحازم! اسے لے لو۔

ابوحازم: مجھے اس کی ضرورت نہیں، مجھے دغدغہ ہے کہ کہیں یہ میری باتوں کا بدلہ نہ ہو۔ موسیٰ علیہ السلام جب فرعون سے بھاگ کر جاتے ہیں اور مدین کے باؤلی پر پہنچتے ہیں، تو انہوں نے دیکھا کہ دولڑکیاں اپنے ڈنگروں کو لئے الگ کھڑی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے

ان سے پوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے؟ لڑکیوں نے کہا، ہم پانی نہیں پلا سکتیں، جب تک کہ تمام چرواہے نہ پلا لیں، ہمارا باپ بوڑھا اور مسن ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سن کر ان کے ڈنگروں کو پانی پلایا اور اس کے بعد ایک درخت کے سایہ تلے جا کر ٹھہر گئے اور بولے: ﴿رب انسی لما انزلت الی من خیر فقیر﴾ ”اے پروردگار! تیری نازل کی ہوئی بھلائوں کا میں محتاج ہوں۔“ تو دیکھو انہوں نے اس کام کو چونکہ محض اللہ کے لیے کیا تھا، اس لیے اس پر اجر نہ طلب کیا، ادھر جب وہ لڑکیاں گھر پہنچیں، تو ان کے باپ نے کہا کہ تم اس قدر جلد کس طرح آگئیں؟ لڑکیوں نے کہا کہ ایک بیچارہ نیک آدمی آگیا تھا، اس نے ہمارے جانوروں کو پانی پلادیا، بزرگ نے پوچھا کہ وہ اور کیا کہتا تھا؟ لڑکیوں نے کہا کہ: ﴿رب انسی لما انزلت الی من خیر فقیر﴾ کہہ رہا تھا۔ بزرگ نے کہا کہ یقیناً وہ بیچارہ بھوکا معلوم ہوتا ہے، تم میں سے کوئی ابھی جائے اور اس سے جا کر کہے کہ میرا باپ تم کو اس لئے بلا رہا ہے کہ پانی پلانے کا اجر دے۔

حسب حکم ایک لڑکی آئی اور اس نے کہا کہ ابائے ہمیں پانی پلانے کی مزدوری دینے کے لیے بلاتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے یہ سن کر ایک چیخ ماری اور میدان اپنے کو ڈال دیا، اس کے اٹھے اور لڑکی کے پیچھے پیچھے چلے۔ جب دروازے پر پہنچے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ کھانا رکھا ہوا ہے۔ بزرگ جن کا نام حضرت شعیب علیہ السلام تھا بولے کہ: ہاں! اے جوان شروع کرو۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ”میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔“ شعیب علیہ السلام نے کہا: کیوں؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ: ”میں اس ایک گھرانے کا آدمی ہوں، جو اپنے دین کو زمین کے برابر چاندی و سونے سے بھی نہیں بیچ سکتے۔“ شعیب علیہ

السلام نے فرمایا: ”خدا کی قسم ایسا نہیں ہے (یعنی: میں تمہیں مزدوری نہیں دیتا ہوں) بلکہ یہ تو ہماری اور ہمارے باپ دادا کی قدیم عادت ہے کہ لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام یہ سن کر بیٹھ گئے اور کھانے میں مصروف ہو گئے، بہر حال اے سلیمان! اگر یہ اشرفیاں ان باتوں کا بدلہ ہیں، جو تو نے مجھ سے سنی ہیں، تو میں اپنے لئے مردار اور خون کھالینے کو وقت ضرورت کے جائز سمجھتا ہوں،

لیکن ان اشرافیوں کو کبھی جائز نہیں سمجھتا۔

سلیمان کو ابو حازم کی باتیں پسند آئیں، خادموں میں ایک شخص بیٹھا ہوا تھا، اس نے کہا کہ امیر المومنین! کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ ساری دنیا ابو حازم کی مانند ہو جائے؟ امام زہریؒ اس مجلس میں تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایسے آدمی ہیں کہ میں ان کا ہمسایہ ہوں اور تیس برس سے ان کے جوار میں رہتا ہوں، لیکن میں نے تو ان سے کبھی بھی بات نہ کی۔ اس پر ابو حازم نے کہا کہ تم نے خدا کو بھلایا، اس لئے مجھے بھی بھول گئے، اگر تم خدا کو دوست رکھتے، تو پھر مجھے بھی دوست رکھتے۔ امام زہریؒ نے کہا: ”کیا تم مجھے برا کہتے ہو؟“ سلیمان نے زہریؒ کے اس جملہ پر جواب دیا کہ انہوں نے کیا برا کہا؟ کیا ہمسایہ پر ہمسایہ کا حق نہیں ہے، پھر جو تم ان سے نہیں بولتے، یہ کس کا قصور ہے؟

ابو حازم نے اس کے بعد یہ تقریر شروع کی کہ بنی اسرائیل جب سیدھے راستہ پر تھے، تو اس وقت امراء علماء کے محتاج تھے اور علماء ان سے ملنے جلنے میں بخل کرتے تھے۔ اس کے بعد امراء علماء سے بے نیاز ہو گئے، جس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ قوم معصیت و تمرد پر جم گئی اور دنیا میں مشغول ہو گئی، آخر میں الٹ گئی۔ کاش! اگر ہمارے علماء بھی اپنے علم کی عزت کی حفاظت کرتے، تو امراء ان سے ڈرتے، خوف کرتے۔

زہریؒ یہ سن کر بولے: ”گویا تم ہماری طرف اشارہ کر رہے ہو اور یہ مجھ پر تعریض ہے۔“ ابو حازم نے کہا: ”بس بات وہی ہے، جو تم نے سنی۔“

اس مکالمہ میں حضرت ابو حازم رحمۃ اللہ علیہ کی دینی جرات کا جس قدر پتہ چلتا ہے، اس سے زیادہ سلیمان کی رواداری قابل غور ہے۔ ایک متقی عالم کی یہی شان ہونی چاہئے، جس کا نظارہ ابو حازم کی گفتگو میں نظر آتا ہے، لیکن بادشاہوں سے یہ بالکل بعید ہے کہ وہ اپنے متعلق ایسی باتیں سنیں اور پھر ناصح کی قدر و عزت کریں۔ ہمارے نزدیک اس مکالمہ سے زیادہ عبرت امراء وقت اور سلاطین عصر کو لینا چاہئے۔ کہا جاتا ہے کہ آج ابو حازم کے ایسے علماء نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج سلیمان جیسا کوئی رئیس بھی نہیں۔ ہر شخص دوسرے پر کتہ چینی کرتا ہے، لیکن اپنی اصلاح کا خواہاں ہوئی نظر نہیں آتا۔

مذہبی سوالات اور سائنس کی حد پر اوڑ

مذہب کے اس بنیادی سوال (عالم کا نقطہ آغاز اور انجام) کو سائنس حل کر سکتی ہے، یا نہیں، اسکے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ سائنس کی حد پر اوڑ کیا ہے؟ علماء سائنس نے اس علم کی حدود کو متعین کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

”سائنس کی بحث و تحقیق کا تعلق تمام ترفطرت کے واقعات اور مشاہدات سے ہے، جو ہمارے زیر تجربہ آسکیں، لیکن جو چیزیں ہمارے احساس اور مشاہدے کے دائرے سے خارج ہیں، سائنس کو انکے اقرار و انکار سے کچھ بحث نہیں۔“

ماہرین سائنس کا اعتراف

پروفیسر لیر جو فرانس کا مشہور ماہر سائنس دان ہے، لکھتا ہے: ”کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں ہے، اس لئے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی، یا ابدی وجود کا انکار کریں، جس طرح ہمارا کام یہ بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں، ہمارا کام نفی و اثبات دونوں سے الگ رہتا ہے۔“

پروفیسر ٹڈل نے اس خیال کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کی ہے، اگر تم گھڑی دیکھو اس میں گھنٹے، منٹ، سیکنڈ کی سوئیاں نظر آئیں گی، یہ سوئیاں کیوں پھرتی ہیں اور ان کی حرکت کی باہمی نسبت جو ہمیں نظر آتی ہے، کیونکر قائم ہے؟ ان سوالات کا جواب بغیر گھڑی کو کھولے اور اس کے مختلف پرزوں کو اچھی طرح دیکھے اور ان کا دوسروں سے تعلق قائم کئے بغیر نہیں دیا جاسکتا ہے، جب یہ سب کچھ ہو لیتا ہے، تو ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سوئیوں کی یہ خاص حرکت گھڑی کی اندرونی ساخت اور مشین کا نتیجہ ہے، جو کوک کی قوت سے چل رہی ہے، سوئیوں کی یہ حرکت صنعت انسانی کا ایک کارنامہ ہے، لیکن بحنبہ یہی حال واقعات و حوادث فطرت کا ہے، عالم کی اس مشین کے اندر بھی ایک مخفی مشین کار فرما ہے اور

ایک خزانہ قوت ہے، جو اس مشین کو چلا رہا ہے، سائنس کا انتہائی کام اس مشین اور ذخیرہ قوت سے پردہ ہٹا کر یہ بتانا ہے کہ واقعات و حوادث انہی دونوں کے باہمی تعلق کا نتیجہ ہے، لیکن کارخانہ عالم کی یہ اندرانی مشین خود کیا ہے؟ اور کیسے بنی؟ اور اس گھڑی کو کس نے کوکا اور اس کی چلانے والی قوت کہاں سے آئی؟ یہ وہ سوالات ہیں، جن کا جواب سائنس کے بس سے باہر ہے۔

انسان صرف کچھ جان سکتا ہے، کسی چیز کی تحقیق و ایجاد پر وہ قادر نہیں

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس نہ تو قدرتی قوانین کو ایجاد کرتی ہے، نہ ان قوانین کی تمام کڑیوں کو سلجھا کر ہمارے سامنے پیش کر سکتی ہے، بلکہ حوادث و واقعات کے محض ان حلقوں کو ترتیب کے ساتھ ہمیں بتانے کی کوشش کرتی ہے، جو اس کے دائرہ احساس و مشاہدہ میں آجاتے ہیں، مثلاً: وہ آگ میں جلانے کی خاصیت پیدا نہیں کرتی، بلکہ صرف یہ بتاتی ہے کہ تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ جلاتی ہے، وہ اسٹیم کو ایجاد (وجود بخشنا، تخلیق کردند) نہیں کرتی، بلکہ صرف اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے کہ جب آگ کا تعلق پانی سے ہوتا ہے، تو یہ ایک قدرتی قانون ہے کہ وہ بھاپ بن جائے، بہر حال ہمارے سامنے جو کچھ قدرتی قوانین پھیلے ہوئے ہیں، ہم ان کو بنا نہیں سکتے، بلکہ صرف جان سکتے ہیں اور سائنس اس پر اتنا اور اضافہ کرتی ہے کہ اسی حد تک جان سکتے ہیں، جس حد تک مشاہدہ ہمارا ساتھ دے گا، لیکن یہ سوال کہ اس قوانین کا مقنن کون ہے، ان کا نقطہ آغاز کیا ہے اور ان کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائنس کے حدود سے اس کا جواب خارج ہے۔

ہلکے نے سائنس کی اسی درماندگی کا اندازہ کرنے کے بعد بالکل سچ لکھا ہے کہ:
 ”وہ کسی چیز کی بھی کامل توجیہ نہیں کر سکتی، اسکے سارے اسباب اول سے آخر تک نہیں بتائے جاسکتے، کیونکہ انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ بھی توجیہ میں آغاز اشیاء کی جانب چند قدم سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔“

حکیم اور عامی میک میں فرق

بہر حال انسان کی انتہائی پرواز سائنس کے نقطہ نظر سے صرف اس قدر ہے کہ کل نہیں، بلکہ فطرت کے صرف ان قوانین کو وہ جان سکتا ہے، جو جو اس کی گرفت میں آجائیں، باقی رہا

یہ سوال کہ جب صرف محسوس قوانین کی واقفیت پر عام انسانی پرواز ختم ہو جاتی ہے، تو حکیم اور عامی میں کیا فرق رہا؟ تو بات یہ ہے کہ گو عامی کا علم بھی مشاہدات اور محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے اور حکیم بھی اس دائرے کے آگے قدم نہیں رکھ سکتا، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ عامی آدمی کسی حادثہ، یا مظہر قدرت کو جب دیکھتا ہے، تو وہ اس کے اثرات کو دور نہیں لے جاسکتا، یعنی: ایک جزئی واقعے سے کلیہ نہیں بنا سکتا اور حکیم ایک جزئی واقعہ کو دیکھ کر چونکتا ہے اور یہ دیکھنا شروع کرتا ہے کہ آیا یہ واقعہ اسی جزئیت تک محدود ہے، یا آگے بھی بڑھ سکتا ہے، پس اگر اس میں کچھ وسعت نظر آتی ہے، تو چند جزئیات پر منطبق کرنے کے بعد اسی جزئیہ کو کلیہ کی شکل عطا کرتا ہے اور اسی کو قانون کے نام سے موسوم کرتا ہے، مثلاً: نیوٹن نے سیب کو گرتے ہوئے دیکھا، اس طرح ہر شخص دیکھتا ہے، لیکن وہ چونکا آخر کیوں گرتا ہے، اسکو محسوس ہوا کہ زمین کی کشش کا نتیجہ ہے، اب اس کشش کی خاصیت کو اس نے دوسری چیزوں میں ڈھونڈنا شروع کیا، بالآخر اس نے اعلان کیا کہ فضا میں جتنے کڑے تیر رہے ہیں، وہ سب جذب و کشش ہی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، بہر حال نیوٹن نے فضائی کڑوں کی خاصیت کا ایک علم حاصل کیا، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ان کڑوں کا موجب تھا، یا اس نے ان میں جذب و کشش کی خاصیت پیدا کر دی تھی، جو قانون پہلے سے موجود تھا، صرف اسکا علم اس نے حاصل کیا، اس سے زیادہ نہ اس نے کچھ کیا اور نہ کر سکتا تھا، وہ خود کہتا ہے:

”عالم فطرت کی یہ نیرنگیاں (جذب و کشش) واجب الوجود کے ارادے کے سوا اور کسی شے سے ظاہر نہیں ہو سکتیں، وہ واجب الوجود جو ہر جگہ اور ہمیشہ موجود ہے اور یہی حال سائنس کے تمام مسائل اور اختراعات کا ہے، بھاپ سے کیتلی کے ڈھکنے کو اٹھتے ہوئے سبھی دیکھتے ہیں، جس طرح اسٹیفن نے دیکھا، لیکن اسٹیفن نے اس جزئی مشاہدہ سے ایک کلیہ پیدا کیا اور اس کلیہ کو فطرت کے دوسرے قوانین مثلاً: لوہے کی پلک، پہیوں کی گردش، اسی قسم کے میکانکی قوانین کے علم کے ساتھ وابستہ کر دیا، اس نے اپنے کسی پیدا کردہ قانون کو نہیں، بلکہ قدرتی قوانین کو اس شکل میں نمایاں کیا ہے، جسے ہم ”ٹرین“ کہتے ہیں۔“

الغرض صنعت و حرفت والے قدرتی قوانین کے جزئیات سے کلیات کا علم حاصل کرتے ہیں، لیکن کسی چیز کی ایجاد (یعنی: اس کو وجود بخشنا) ایک غریب انسان کے بس کی

بات نہیں، وہ فقط ”علم ادم الأسماء کلھا“ (سکھایا اللہ نے آدم کو سارے اسماء) کے اجمال کی تفصیل کر سکتا ہے اور یہی اسے دیا بھی گیا ہے۔

سائینس اور مذہب کے حدود

الحاصل جب سائینس کا سارا زور مشاہدات اور محسوسات پر ختم ہو جاتا ہے، تو خود اندازہ کرو کہ جن سوالات پر مذہب کی بنیاد قائم ہے، مثلاً: عالم کا نقطہ آغاز کیا ہے؟ جیسا کہ بکسلے نے کہا تھا کہ سائینس کا قدم آغاز اشیاء کی جانب چند قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، تو پھر آخری نقطے تک اس کی رسائی کیونکر ہو سکتی ہے.....؟

پس سچ یہ ہے کہ سائینس جہاں اپنی تحقیقات ختم کر دیتی ہے، مذہب وہیں سے اپنا درس شروع کرتا ہے، سائینس صرف عالم شہادت (عالم محسوس) کے چند واقعات محسوسہ کو کلیات کی شکل میں پیش کر کے اپنا بازو ڈال دیتی ہے، محسوسات کے آگے قدم رکھتے ہی اس پر ریشہ طاری ہو جاتا ہے، وہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ آگے کیا ہے، اور مذہب انسان کا یہیں سے ہاتھ پکڑتا ہے اور غیب (عالم غیر محسوس) کے سارے اسرار کو اس کے سامنے بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے، سائینس کچھ نہیں بتا سکتی کہ دنیا کی ابتداء کیونکر ہوئی، مذہب آتا ہے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتا ہے، انسان مرنے کے بعد کہاں جاتا ہے اور اس پر کیا گزرتی ہے؟ سائینس اس کے جواب سے عاجز ہے اور مذہب اس کی تفصیل پیش کرتا ہے، دنیا کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائینس متحیر ہے کہ اس کا کیا جواب دے، مذہب آتا ہے اور اس حیرت کو مٹا دیتا ہے، سائینس یہ تو بتاتی ہے کہ عالم کس کے لئے ہے، لیکن خود انسان کس لئے ہے؟ اس مقصد کو متعین کرنے سے وہ عاجز ہے، مذہب آتا ہے اور اس مسئلے کو بھی صاف کر دیتا ہے، الغرض مذہب کا جس عالم سے تعلق ہے، سائینس کی ہدایت کا چراغ اس کے حدود تک پہنچنے ہی گل ہو جاتا ہے۔ میلن ایڈورڈ کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کہ:

”عالم کے ان قوانین کی نسبت یہ کہنا کہ محض بخت و اتفاق کے نتائج ہیں، یہ فرضی احتمالات اور عقلی گراہیاں ہیں، جسے لوگوں نے محسوسات کا لقب دے رکھا ہے۔ فزیکل سائینس جانے والا ہرگز اس قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔“

اس کے بعد عوام الناس کا یہ خیال کہ سائینس کی جدید تحقیقات نے مذہب کی بنیادیں ہلا دی ہیں، جیسا کہ گینٹرو نے غایت گستاخی کے ساتھ لکھا ہے کہ:

”ہم نے خدا کی عارضی خدمات کا شکریہ ادا کر کے اس کو سرحد پار پہنچا دیا۔“

(نعوذ باللہ تعالیٰ شانہ) کس درجہ جاہلانہ اور مضحکہ خیز ہے...! کسی نے خوب کہا

ہے کہ:

”اگر خشکی کی ٹرین سمندر کے جہاز سے ٹکرا سکتی ہے، تو سائینس بھی مذہب سے ٹکرا سکتی ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ جب دونوں کی حدود جدا جدا ہیں، ایک کی تنگ و دو محسوسات کے تنگ دائرہ تک محدود ہے اور دوسرا غیبی فضا کا شہباز ہے، تو ان دونوں میں تصادم کا کیا مطلب ہو سکتا ہے، حافظ شیرازیؒ صحیح فرماتے ہیں۔

عافلاں نقطہء پرکار وجود اندوے

عشق داند کہ دریں بادیہ سرگردانند

خلاصہ یہ ہے کہ سائینس اور مذہب بالکل دو جدا گانہ چیزیں ہیں، نہ ان دونوں میں اختلاف ہے اور نہ ہو سکتا ہے، ہم سائینس کے ذریعے آسمان کے تاروں کو گن سکتے ہیں، آفتاب کو ناپ سکتے ہیں، ہوا کو تول سکتے ہیں، سمندر کو خشک کر کے بادل بنا کر پانی برسا سکتے ہیں، بلکہ ممکن ہے کہ آئندہ مردوں کو زندہ کرنے کی تدبیر بھی معلوم ہو جائے، جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ”احیاء موتی“ (مردے کو زندہ کر دینے) پر بھی آدمی قادر

..... میری مراد مولانا عبدالباری ندوی پروفیسر جامعہ عثمانیہ سے ہے۔ مولانا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد سورت میں ایک مقالہ ”دینیات اور عقلیات“ کے عنوان سے پڑھا تھا۔ یہ رسالہ کانفرنس کی نظر سے شائع بھی کر دیا گیا۔ درمیان سدا آہنی اسی رسالہ کو ترقی دیا ہے۔ خاکسار نے بھی اس کتاب کے ابتدائی حصہ میں درج ہیں۔ ان کی معقول تعداد مولانا ہی کے مضمون سے نقل کی گئی ہے۔ ۱۲۱ منہ۔

..... دیال کی حدیثوں میں اس کا ذکر ہے کہ مجملہ اور باتوں کے وہ مردے کو بھی زندہ کرے گا، حدیثوں کا صحیح ذخیرہ دیال کی اس خصوصیت کہ چالیس دن کی مختصر مدت میں کر زمین کے شمال و جنوب شرق و مغرب کی ہر آبادی میں پہنچ جائیگا۔ یعنی بعد مسافت کے مسئلہ کو گویا درجہ صفر تک پہنچا دے گا۔ یا مون سون پر (بقیہ جاہلانہ مضحکہ خیز)

ہو جائے گا، بلکہ زندہ کرے گا، دوسرے لفظوں میں اس کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ:

”انسان زندگی کے قانون سے بھی واقف ہو جائے گا۔“

اور سائنس والوں کا بھی بیان ہے کہ ہم نے ”تخم حیات“ (پروٹوپلازم) کا پتہ چلا لیا ہے، کیمیا والے کہتے ہیں کہ تخم حیات کاربن، آکسیجن، نائٹروجن کی باہمی ترکیب سے تیار ہوتا ہے، تو سائنس یہ سب کچھ کر سکتی ہے اور ہم اس کے منتظر ہیں کہ وہ ایسا کرے، کیونکہ ہمارے بہت سے ایمانی دعووں کی توثیق انہیں اکتشافات پر موقوف ہے، لیکن بایں ہمہ مذہبی سوالات کے حل میں سائنس اسی طرح عاجز رہے گی، جس طرح پہلے تھی اور اس وقت تک ہے، فرض کیجئے کہ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے ہم نے زندگی کو پیدا کر بھی لیا، تو اس سے یہ مسئلہ کہاں حل ہوا کہ ان عناصر کی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے، ٹھیک اس کی مثال ایسی ہے کہ زندگی کا راز کسی زمانے میں یوں حل کیا گیا تھا کہ زروادہ کے باہمی اختلاط کا یہ نتیجہ ہے، لیکن اس وقت یہ بھی سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس اختلاط سے یہ نتیجہ کیوں پیدا ہوتا ہے، اب بھی یہ سوال اسی طرح باقی رہے گا کہ کاربن، آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن کی باہمی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ کیا جو شخص اس سے واقف ہے کہ تخم کوٹی میں ملانے اور پانی دینے سے پودا پیدا ہو جاتا ہے، کیا اس نے اس سوال کو حل کر لیا کہ پودا کیونکر پیدا ہوتا ہے؟ پروفیسر ٹنڈل نے بلفا سٹ کے لیکچر میں ایک موقع پر کتنی اچھی بات کہی کہ:

”لیکن کیوں؟ اس کا جواب ہمیشہ کے لیے اسی طرح ناممکن رہے گا، جس طرح کہ پہلے رہا ہے۔“

امجد حیدر آبادی نے بھی اس مضمون کو ایک شعر میں ادا کیا ہے

امجد ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں

ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

(بقیہ گذشتہ صفحہ سے آگے) قابو یافتہ ہو کر جہاں چاہے گا پانی برسائے گا۔ آپ اگر غور کریں گے تو سائنس کے رجحانات ان چیزوں کی تکمیل کی طرف ہیں۔ ریل، موٹر، ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ریڈیو وغیرہ کا حاصل بعد مسافت کی کمی کے سوا اور کیا ہے۔ بارش برسائے کی طرف ہیں۔ ریل، موٹر، ڈوئی جہاز، ٹیلی فون، ریڈیو وغیرہ کا حاصل بعد مسافت کی کمی کے سوا اور کیا ہے۔ بارش برسائے کی جدو جہد ہمہ تن ہے۔ بارش تا ہے کہ سائنس کی دنیا میں جاری ہے۔ پھر کیوں نہیں کہا جاسکتا۔ سائنس کا انتہائی راجح ممکن ہے کہ وہ جہاں بھی کے ہاتھوں مقدر ہو۔“

الحاصل کسی شے کے آغاز کا پتہ چلانا اور اس کے آخری انجام تک پہنچنا سائنس کی رہنمائی میں ناممکن ہے، چند قدم چل کر اس کو اپنی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، علی الخصوص جب حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور یہی حال انجام کا ہے، آئندہ کیا ہوگا، موجودہ قوانین کا آئندہ کیا حال ہوگا، اس کے آثار و نتائج کیا ہوں گے؟ اس کا بھی کوئی قطعی جواب سائنس نہیں دے سکتی، وہی بکسلے جس نے آغاز کے متعلق انسان کے جاہل ہونے کا اقرار کیا تھا، اب انجام کے متعلق بھی اسی اعتراف کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

”عالم تو بڑی چیز ہے، سائنس کا معمولی قانون یہ ہے کہ جو پتھر بے سہارا ہوگا، اس کو زمین پر گر پڑنا چاہئے، لیکن ہمیشہ کیا یہی ضروری ہوگا...؟“

اس کے نزدیک یہ قانون قدرت نہیں، بلکہ انسان کا وہی اضافہ ہے، اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

”وہ ڈراؤنا لزوم اور ضروری ہونے کا قانون کیا ہے، جس نے لوگوں کو اس قدر خائف اور وحشت زدہ بنا رکھا ہے، سچ پوچھو، تو یہ ہمارے واہمہ کا گھڑا ہوا بھوت ہے، سائنس ہی کا یہ قانون ہے کہ جب پتھر بے سہارا ہوگا، تو اس کو زمین پر گر پڑنا چاہئے، لیکن آئندہ وہ ہمیشہ گری پڑے گا، یعنی: اس کے خلاف ہونا ناممکن ہے، یہ ایک ایسی زائد شے کا اضافہ ہے، جس کا نہ تو مشاہدہ اور واقعات میں نشان ملتا ہے اور نہ کہیں اور نہ کہیں اور سے اس کا پتہ چلتا ہے۔“

یعنی: یہ ایسا حکم ہے، جس کی شہادت ہمارے حواس نہیں دیتے۔ سائنس کی یہ رائے تو انجام کے متعلق تھی، رہا آغاز اس کے متعلق میں نے چند اقوال پہلے بھی درج کئے ہیں، لیکن آخر میں بکسلے ہی کے قول کو پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں، وہ اپنی کتاب ”اصول و نتائج“ میں لکھتا ہے:

”وجود کی علت اولیٰ کا مسئلہ، میرے حقیر قویٰ کی دسترس سے باہر ہے، حشری لایعنی ہرزہ سرائیوں کے پڑھنے کا مجھے موقع ملا، ان میں سب سے بدتر ان لوگوں کے دلائل ہوتے ہیں، جو آغاز عالم کے متعلق موشگافیاں کرتے ہیں، مگر ان لوگوں کے مہملات ان سے بھی زیادہ بڑھ جاتے ہیں، جو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں ہے۔“

سائنسی ایجادات کا سرچشمہ کون ہے؟

عملی و فکری قوتوں کا نتیجہ، یا قدرت کی کرشمہ پردازی؟

سورہ کہف میں باغ اور کاشت رکھنے والے آدمی کو، یعنی: بسطی پیمانے پر جسے رزق دی گئی تھی، اسی کے متعلق کہنے والوں کی زبان سے یہ فقرہ جو کہلوا یا گیا ہے۔

(لو لا اذ دخلت جنتك قلت ما شاء الله لا قوة الا بالله)

”اور کیوں نہ ہو ایسا کہ جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا، تو کہا ہوتا کہ جو

کچھ ہے، سب اللہ کا چاہا ہے، نہیں ہے قوت، لیکن اللہ ہی ہے۔“

جس کا حاصل یہی ہے کہ نعمتوں کو پالنے کے بعد آدمی کو چاہیے کہ واقعہ کے مطابق ان کے متعلق جو صحیح دانش اور علم ہو، اس کو اپنے سامنے سے اوجھل ہونے نہ دے، مثلاً: باغ والے کے سامنے اس کا باغ تھا، حکم دیا گیا کہ اس باغ میں جب جایا کرو، تو دو باتیں سوچا کرو، ایک تو یہ کہ جو کچھ ہے، سب اللہ کا چاہا ہوا ہے، اور دوسری بات یہ کہ قوت اور طاقت جو کچھ بھی جس کسی میں ہے، اس کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات مبارک ہے، ظاہر ہے کہ پہلی بات کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جن شکلوں میں نعمتوں کا ظہور ہوا ہو، ان کو دیکھ کر چاہیے کہ اس واقعہ کے احساس کو ہم اپنے اندر پیدا کرتے رہیں کہ ان کی آفرینش اور پیدائش سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ سب کچھ قدرت کی کار فرمایوں کا نتیجہ و اثر ہے۔ باغ ہی کو دیکھئے، باغ کی زمین، باغ کے درخت، درختوں کی شاخیں، پتے، پھول، پھل، اسی طرح وہ سارے اسباب جنہیں باغ کی نشوونما، بار آوری میں دخل ہے، ان میں کوئی چیز بھی ایسی ہے، جسے آدمی پیدا کرتا ہے، باغ تو خیر باغ ہی ہے۔

انسانی مصنوعات اور قدرت کی کار فرمائی

ایسی چیزیں جنہیں ہم انسانی مصنوعات خیال کرتے ہیں، بلکہ جن مصنوعات کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فلاں کی ایجاد ہے، مثلاً: ریل گاڑی اور اس کے انجن، ہی کو لیجئے، سوئیچ، انجن کے اجزاء، لوہا، تانبا، پیتل، انجن کے فلزاتی و ہنرمی عناصر اور اس کے سوا

جو چیزیں اس کے بنانے میں استعمال ہوتی ہیں، کیا ان میں سے کسی ایک چیز کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ اسی طرح انجن جن چیزوں سے چلتا ہے، بتائیے کہ آگ ہو، یا پانی، کیا آدمی ان کا پیدا کرنے والا ہے؟ پانی کو آگ پر چڑھانے سے اسٹیم پیدا ہوتی ہے، کیا پانی اور آگ میں یہ خاصیت آدمی کی رکھی ہوئی ہے؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ بھی قدرت کا بنایا ہوا قانون ہے، اسٹیم میں حرکت پیدا کرنے کی قوت ہے، کیا اس قوت کو آدمی نے پیدا کیا ہے؟ سوچتے چلے جائیے، اگر آپ حقیقت پر نظر جماتے ہوئے سوچیں گے، تو بالآخر ہر سوال کے جواب میں آپ کو وہی ”ماشاء اللہ“ کہنا پڑے گا، یعنی: سب اللہ کا چاہا ہوا ہے اور اسی کی قدرت کی یہ کرشمہ پردازیاں ہیں، یہ تو پہلے فقرے ”ماشاء اللہ“ کا مطلب ہوا، رہی دوسری بات، یعنی: ”لا قوۃ الا باللہ“ یہ اس دوسرے کے ازالہ کی طرف اشارہ ہے، جو عموماً ایسے موقعہ پر دلوں میں پیدا ہوتا ہے، یا ہو سکتا ہے، خیال یہ گزرتا ہے کہ ہیں تو سب کچھ قدرتی پیداوار اور قدرتی قوانین ہی کے نتائج، لیکن انسان جب تک ان قوانین کا علم نہ حاصل کرے اور علم حاصل کرنے کے بعد اپنی محنت و توجہ کو ان پر صرف نہ کرے، عقل کی ترکیبوں اور ذہن کی تجویزوں کو ان میں نہ لگائے، انجن کا وجود نہیں ہو سکتا اور انجن ہی کیا، باغ میں جب تک باغبانی کے قواعد اور قوانین کی پابندی نہ کی جائے گی، اس وقت تک جیسا کہ چاہئے اس کے پھلنے پھولنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے اور اتنا حصہ ان چیزوں میں یقیناً آدمی کا ہے، اسی وجہ سے ان چیزوں کو انسانی مصنوعات و ایجادات میں لوگ شمار کرتے ہیں، ورنہ اتنا حق کون ہوگا، جو سمجھتا ہو کہ انجن کے لوہے، یا اس میں جو آگ جلتی ہے، جو پانی خرچ ہوتا ہے، ان چیزوں کا ایجاد کرنے والا اور پیدا کرنے والا آدمی ہے۔

علمی و عملی قوتوں کا خالق اللہ ہے

دراصل اسی کے متعلق اس دوسرے فقرے میں چاہا گیا ہے کہ ٹھیک ٹھیک حقیقت اور واقعہ کے بالکل مطابق اپنے علم کو کر لیا جائے، یعنی: یہ سوچنا چاہئے کہ بلاشبہ ان امور کے ظہور میں انسانی ترکیبوں اور تدبیروں کو دخل ہے، لیکن ہمیں اپنے آپ سے یہ پوچھنا چاہئے کہ ان ترکیبوں اور تدبیروں کا تعلق انسان کی جن علمی و عملی قوتوں سے ہے، خود ان قوتوں کا

پیدا کرنے والا کون ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ہم جب خود اپنے پیدا کرنے والے نہیں ہیں، تو ان قوتوں کے پیدا کرنے والے ہم کیسے ہو سکتے ہیں، جو ہمارے اندر پائی جاتی ہیں، بلکہ جو ہمیں پیدا کرنے والا ہے، ظاہر ہے کہ اسی کے ارادہ و مشیت سے ہماری ان قوتوں کا بھی تعلق ہے۔ ”لاقوة الابالہ“ دراصل اسی واقعہ کی یافت کا نام ہے۔

اس کی شہادت

یوں بھی اگر سوچا جائے کہ جن ایجادات و انکشافات کو ہم اپنی اپنی دماغی قابلیتوں، فکر و غور کی محنتوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، کیا واقعی وہ ہمارے فکری نتائج ہوتے ہیں؟ میں آپ کے سامنے دو چیزیں پیش کرتا ہوں، ایک واقعہ تو یہ ہے کہ جدید مصنوعات و ایجادات، یا انکشافات جن لوگوں کی طرف منسوب ہیں، زیادہ تر میرا خیال ہے کہ اگر صد فی صد نہیں، تو ۹۰ فی صد یہ وہی لوگ ہیں، جنہیں باضابطہ تعلیم کا یا تو سرے سے موقع ہی نہیں ملا، یا کچھ تھوڑی بہت ابتدائی تعلیم کسی نے حاصل بھی کی ہے، یا تو عام طور پر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقات کے مقابلے میں ان کی تعلیم صفر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس بیسویں صدی کے موجد اعظم ایڈیسن ہی کو لیجئے، اس بہرے موجد کی سوانح عمری سے کون واقف نہیں، سوال یہی ہے کہ اگر آدمی کی فکری و عقلی قوتوں کے نتائج یہ ایجادات ہیں، تو چاہئے کہ عقلی قوتوں کی تربیت کا جن لوگوں کو اعلیٰ تعلیم گاہوں میں موقع ملا، یا ملتا رہتا ہے، ان کا دماغ ایجاد کرنے میں سبقت کرتا، لیکن جب واقعہ یہ نہیں ہے، تو غور کرنے کی بات ہے کہ ان انکشافات و ایجادات کو ہم کس چیز کا نتیجہ قرار دیں۔

دوسری بات اسی کے ساتھ جسے میں پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے شاید دوسرے بھی جانتے ہوں کہ ان ایجادات و انکشافات کے متعلق ایک عجیب انکشاف یہ بھی ہے کہ عموماً کسی ایک ایجاد کا خیال کسی ملک میں کسی شخص کے دماغ میں جب آیا تو ٹھیک انہی دنوں میں دیکھا گیا ہے کہ بالکل دور دراز ممالک کے رہنے والوں میں سے بھی کسی کے دماغ میں بھی ٹھیک انہی دنوں میں اس ایجاد کا خیال آیا۔ مصر کے مشہور عیسائی مجلہ ”الہلال“ کی اشاعت ۱۹۲۲ء نومبر میں ایک مقالہ میں اسی ”توارد“ کے متعلق شائع ہوا ہے۔ استقراء اور

تتبع سے مقالہ نگار نے عہدِ حاضر کی ۱۳۳، ایجادوں کے متعلق ثابت کیا ہے کہ ایک ہی زمانے میں دو مختلف ملکوں کے باشندوں کو ان کا توارد ہوتا رہا ہے، مثلاً: امریکا میں ایک بات کسی کی سمجھ میں آئی، ٹھیک اسی ہفتے میں دیکھا گیا کہ انگلستان کا ایک آدمی بھی اپنے دماغ میں اسی کا خیال پارہا ہے، آخر بتایا جائے کہ اس توارد کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے.....!؟

(الحق اکوڑہ)



موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

انسانی فطرت کی لامحدود خواہشات کیسے پوری ہوں؟

طفلِ تسلی کی وہ جھوٹی شکل کیا انسان کی غیر مطمئن فطرت کو واقع میں مطمئن بنانے میں کامیاب ہو سکتی ہے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ موجودہ نسلوں کو اس کی تھپکیاں دے دے کر کیا ہم چین کے ساتھ سلا سکتے ہیں کہ زمیں کے اسی کڑہ پر آج نہیں تو کل ہماری آئندہ نسلوں کو ایسی زندگی میسر آنے والی ہے، جس میں چاہنے والے جو کچھ چاہیں گے، وہی پائیں گے۔ ایسے میکانیکی آلات، نئی نئی ایجادات و اکتشافات کا ظہور ہونے والا ہے کہ اس کے بعد محرومی کا یہ گلہ آدم کی اولاد کو باقی نہ رہے گا، مگر اس امکان کے تصور کی یہاں قطعاً گنجائش نہیں۔ ہاں! انسانی فطرت اور اس کے لامحدود مطالبوں کا امالہ ایک ایسی عجیب و غریب شکل میں مذہب کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے کہ اس کی ساری بے چینیاں، چین کی اور ساری پریشانیاں سکون و عافیت کی سیڑھیاں بن جاتی ہیں۔

انسانی فطرت صبر اور سیری کی صفت سے محروم رکھ کر پیدا کی گئی ہے اور معاشی سرمایہ جس پیمانہ پر یہاں پیدا ہو رہا ہے، خواہ دیکھنے میں وہ جتنا بھی نظر آئے، لیکن قدرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ مجموعی حیثیت سے بسط و فراخی کی کیفیت اس سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میں کوئی ہو، ہر ایک یہی محسوس کر رہا ہے کہ اس کی چاہ پوری نہیں ہو رہی ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر ہماری اندرونی جھنجھلاہٹوں کا تعلق اسی صورت حال سے ہے، جسے دیکھئے، جہاں دیکھئے، جس طرف دیکھئے، یہی آواز آرہی ہے کہ نہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اسی چیز نے انسانی زندگی کو ایک طوفان بنا دیا ہے، ایسا طوفان کہ ہر جینے والا یہ کہتے

ہوئے مر رہا ہے۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
ہمارے شاعروں نے اسی کی تصویر مختلف الفاظ میں کھینچی ہے، سیاست کی یہ قیدان کو
کبھی غم کا پھندا اور بند نظر آتا ہے، اسی لئے:

”قید حیات و بند غم“ اصل میں دونوں ایک ہیں
کافیصلہ کیا جاتا ہے، کبھی یہی غالب ”زندگی“ کو ”سوز“ اور ”سوز“ کو ”زندگی“ بتاتے
ہوئے بالآخر اس حقیقت کے اعلان پر کہ۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ زندگی کسی قالب اور کسی رنگ میں ہو، قالب کی نگاہوں
میں وہ جلتی ہوئی ایک شمع ہے، کسی رنگ کی چینی اس پر چڑھائی جائے، سبز ہو، یا سرخ، لیکن
جب تک روشن ہے، جلے گی اور جب تک جلتی رہے گی، اسی وقت تک وہ روشن ہے، شیراز
کے عارف کو تو کھل کر یہ کہنا پڑا کہ۔

نہ گل از داغ غمت ست نہ بلبل در باغ
ہمہ را نعرہ زنان جامہ داراں می داری

(حافظ)

الغرض بے چینی اور اضطراب، کرب و تکلیف کی اسی کیفیت کا احساس موجودہ زندگی
میں سب ہی کو ہو رہا ہے۔ انفرادی طور پر ہو سکتا ہے کہ اس میں استثناء بھی ہو، جیسے ہر کلیہ میں
استثناء بھی ایک کلیہ ہے، لیکن اضطراب و بے چینی، کرب و تکلیف کے عام ہنگاموں میں
ٹٹولنے والوں کو عموماً یہی کاٹنا چھپا، یا چھپا ہوا نظر آیا ہے کہ سب، سب کچھ چاہتے ہیں، لیکن
چاہنے والوں کی چاہ کو پوری کرنے کے لیے جو سرمایہ یہاں پیدا ہو رہا ہے، وہ ایک ایسے مقررہ
محدود پیمانہ پر پیدا ہو رہا ہے، جس سے سب کی یہ چاہ پوری نہیں ہو سکتی، اکبر مرحوم نے فرمایا تھا۔
یہ بات ہے صاف مجھ سے سن لے کتاب میں اسکو کیا پڑھے گا
حد و فطرت کے ہیں مقرر جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑھے گا

لامحدود خواہشوں والی فطرت کا رخ ایسے محدود سرمائے کی طرف پھیر دیا گیا ہے، جسے دنیا کی کوئی طاقت لامحدود نہیں بنا سکتی، محدود پر لامحدود کا انطباق چونکہ نہیں ہو رہا ہے اور نہیں ہو سکتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ خواہشوں کے جس محدود حصہ کو تکمیل کا موقع مل جاتا ہے، اس وقت تو آدمی سرور ہوتا ہے، لیکن نہ پورے ہونے والے ارمانوں کا جو قافلہ عدم کی راہ لے رہا ہے، اسی کا ماتم ہے، جس کے غم میں اولادِ آدم سو گوار ہے۔ مسکین شاعر نے کتنے دردناک پیرایہ میں کہا تھا۔

ہوئے ہیں دفن مرے ساتھ سینکڑوں ارماں

عدم کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

پھر کیا کیا جائے؟ کیا چھوڑ دیا جائے، اسی حال میں آدمی کو تڑپتا پھڑکتا چھوڑ

دیا جائے کہ۔

جنت بنا سکے گا ہرگز نہ کوئی اس کو

اکبر یونہی چلی ہے دنیا یوں ہی چلے گی

کہتے ہیں کہ ”الیاس احدی الراحتین“ ”قنوط و مایوسی بھی ایک قسم کی راحت ہی ہے۔“ اسی قسم کی راحت جو ارمانوں اور امیدوں کے پورے ہونے سے ہوتی ہے، شعر کی دنیا میں ہو سکتا ہے کہ سن بھی لیا جائے، لیکن کامیابی کی مسرت اور ناکامی کی خاموش کھساہٹ حقیقت بینوں کی نگاہ میں ایک نہیں ہو سکتی۔ اگر راحت کی یہ دونوں شکلیں ایک ہی ہیں، تو تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے، ایک کو دوسرے سے بدلنے کے لیے کیا کوئی تیار ہو سکتا ہے؟

یہ نہیں تو طفلِ تسلی کی وہ جھوٹی شکل کیا انسان کی غیر مطمئن فطرت کو واقع میں مطمئن بنانے میں کامیاب ہو سکتی ہے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ موجودہ نسلوں کو اس کی تھکیاں دے دے کر کیا ہم چین کے ساتھ سلا سکتے ہیں کہ زمین کے اسی کڑے پر آج نہیں تو کل ہماری آئندہ نسلوں کو ایسی زندگی میسر آنے والی ہے، جس میں چاہنے والے جو کچھ چاہیں گے، وہی پائیں گے۔ ایسے میکانکی آلات، نئی نئی ایجادات و اکتشافات کا ظہور ہونے والا ہے کہ اس کے بعد محرومی کا یہ گلہ آدم کی اولاد کو باقی نہ رہے گا۔

ایسا ہوگا بھی، یا نہیں، اُسے تو جانے دیجئے، کم از کم جو قرآن کو خدا کا کلام مان چکے ہیں، ان کے لیے تو اس مکان کے تصور کی جیسا کہ گذر چکا ہے قطعاً گنجائش نہیں، الرزق کی جن پیداواروں کے متعلق قدرت فیصلہ کر چکی ہے کہ عام بسط کی حالت جس سے پیدا ہو، اس پیمانے پر ان کی پیدائش یہاں نہ ہوگی، پھر پیدا کرنے والا جس سرمایہ کو محدود رکھنا چاہتا ہے، اسی کو وہ غیر محدود کیسے بنا سکتے ہیں، جنہوں نے نہ دنیا پیدا کی ہے، نہ دنیا والوں کو پیدا کیا ہے اور بالفرض مان بھی لیا جائے کہ آج نہیں تو کل ایسا ہو کر رہے گا، تو آنے والی نسلوں کے مطمئن ہو جانے سے یہ بتایا جائے کہ موجودہ نسلوں کی غیر تشفی یافتہ خواہشوں کو کیسے اطمینان بخشا جاسکتا ہے۔ زید کے تندرست ہو جانے سے غریب عمر کی بیماری کیسے اچھی ہو جائے گی، مستقبل کی ان بشارتوں میں آپ ہی بتائیے کہ حال والوں، یا ان کے لئے جو کڑھتے اور جھینکتے، چلاتے اور کراہتے ہوئے، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اب تک مرتے چلے گئے، مر رہے ہیں، مرتے چلے جائیں گے، ان مسکینوں کا تسکین کے ان مغالطوں میں کیا حصہ ہے؟

میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان کے رہنے والوں کی مشکلات کا صحیح حل اگر یہ واقعہ نہیں ہو سکتا کہ امریکہ، یا ارجنٹائن، برازیل، یا ٹیکسٹو کے باشندے ان مشکلات میں مبتلا نہیں ہیں، پھر جیسے ایک جگہ کے رہنے والوں کی خوشحالیوں سے دوسرے مقام والوں کی بدحالیوں کی تلافی نہیں ہو سکتی، تو ایک عہد کی نسلوں کی تلخیوں کا علاج آپ آنے والے

۱..... سورہ بلد کی مشہور آیت ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ﴾ ”قطعاً ہم نے پیدا کیا ہے آدمی کو درد بگڑ میں“ پھر اس سے پہلے مکہ معظمہ کی اور مکہ معظمہ کے بھی اس زمانے کی جب رسول اللہ ﷺ وہاں زندگی گزار رہے تھے قسم کھائی گئی ہے، اس کے بعد دوسری قسم ہے: ﴿وَالْوَالِدُ وَمَا وَلَدٌ﴾ ”یعنی: اور تم ہے والد کی اور جو پیدا ہوا“ قرآن کی قسمیں اس دعویٰ کی جس کا ذکر قسموں کے بعد ہوتا ہے، عموماً دلیلیں ہوتی ہیں، آدمی کی موجودہ زندگی بگڑ خواری کی زندگی ہے، اس لیے یقیناً دادی غیر ذی زرع، شہر مکہ کی زندگی ایک بہترین مثال ہے، پھر انسان کی فطرت کا یہ تجربہ کہ رسول اللہ ﷺ جیسے ہی خواہہ پر اسی مکہ میں زندگی دو بھر کر دی گئی، اس سے بھی موجودہ زندگی کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے، خصوصاً اپنے سب سے بڑے محبوب شہر اور محبوب بیٹے کو بھی جب اس قسم کی زندگی دی گئی، تو اس سے دوسرے سمجھ سکتے ہیں کہ موجودہ زندگی کی کیا حقیقت ہے، پھر یہ آدمی کا پیدا ہونا ٹمہر ہونے تک اس قطرہ کا حلقہ ہائے صد کا تہنگ سے گزرنا، اور ابھی یہ تجربات ختم بھی نہیں ہو پاتے کہ صاحب زادے پھر ٹمہر ہونے کے لیے قطرے کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں، باپوں میں بیٹوں کی جو محبت فطرت رکھی گئی ہے، وہ زندگی کو پھر تلخ بناتی چلی جاتی ہے، لہذا یہی سلسلہ ہے، ایک کے بعد دوسری کڑی نمودار ہو رہی ہے۔

دوسرے عہد کی نسلوں کی شیریں کامیوں کے وعدوں صرف وعدوں سے کیسے کر سکتے ہیں؟ آپ جہنم میں رہنے والوں کو یہ سنا سنا کر کیا خوش کرتے ہیں کہ ان کے پوتے جنت میں پیدا ہوں گے اور دوسروں کی مسرتوں ہی سے اگر ہم اپنی کلفتوں کے ازالہ میں کامیاب ہو سکتے ہیں، تو مستقبل کے مشکوک بے بنیاد اوہامی وعدوں کی کیا ضرورت ہے؟ آپ ہی کے سامنے اسی زمانے میں ہر جگہ، ہر علاقہ اور ہر خطہ میں تشفی یافتہ فطرتوں کی کیا کمی ہے، بتا چکا ہوں کہ انسان سکینت و طمانیت کی جس کیفیت کے لیے تڑپ رہا ہے، یہ مرہم تو ان تمام زندہ ہستیوں کو مفت بغیر کسی کد و کاوش، درد سری اور محنت کے حاصل ہے۔ جو انسان بن کر دنیا میں نہیں پیدا ہوئے ہیں، دوسروں کا اطمینان ہی اگر آپ کو مطمئن کر سکتا ہے، تو شاخساروں پر چھبھانے والی چڑیوں، جو بناروں میں تیرنے والی مچھلیوں، اور مرغ آبیوں، مرغزاروں میں کلیلیں بھرنے والے ہرنوں کو دیکھ دیکھ کر بجائے آئندہ نسلوں کے ادھار وعدوں کے اطمینان کی اس نقد دولت کو کیوں حاصل نہیں کرتے۔ مستقبل کے ”شنیذہ“ موعا عید سے آپ کی فطرت اگر خنکی حاصل کر سکتی ہے، تو انسان کے سوا ہر دوسری زندہ ہستی ”دیدہ“ کی شکل میں آپ کے سامنے اسی وقت اسی کیفیت کو تقسیم کر رہی ہے، جب دوسروں ہی کا سکون آپ کا سکون بن سکتا ہے، تو پھر دوسروں ہی خصوصیت پیدا کرنے کے کیا معنی؟

خیر کہاں تک کہتا چلا جاؤں اور جنہوں نے قرآنی صداقتوں کے مطابق زندگی گزارنے کا عہد نہیں کیا ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ میرا ان سے خطاب بھی نہیں ہے، فضا میں جو مغالطے پھیلا دیئے گئے ہیں، شعوری، یا غیر شعوری طور پر دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں میں بھی ان کے جراثیم کسی نہ کسی طرح پیوست ہوتے چلے جا رہے ہیں، اس لیے جہاں تک کہہ سکتا ہوں، کہہ دیتا ہوں، ورنہ ایک سیدھے سادھے مسلمان کے لیے یہی کافی ہے کہ الرزق، یا انسان کے معاشی ذخیروں کی پیدائش کا پیمانہ قرآن کی رو سے اس دنیا میں غیر مبسوط، یا غیر محدود شکل اختیار نہیں کر سکتا، اس کی عدم مبسوطیت اور محدودیت کا جو حال آج ہے، وہی کل بھی رہے گا، اور جب تک یہ حال ہے، اخیر کے حب شدید کے روگی اور بلوغیت و عدم سیری و بے صبری کے عارضہ میں اس بتلا انسان کی بے چین فطرت، اپنی لامحدود خواہشوں کو معاشی پیداواروں کے محدود سرمائے پر منطبق نہ پا کر ہمیشہ بے کلی اور بے چینی کی اس حالت میں

تڑپتی پھڑکتی رہے گی۔

قانون ازالہ کی راہوں سے علاج کرنے والوں نے آپ دیکھ چکے کہ معاشی زندگی کی اس پیچیدگی کو کتنی اہمیت دے رکھی ہے، زور آزمائیوں کی ساری تدبیروں کو وہ ختم کر چکے اور جو باقی ہیں، انہیں بھی ختم کر رہے ہیں، لیکن اسلام نے بجائے ازالہ کے امالہ کی جو راہ اس سلسلہ میں بھی اختیار کی ہے، وہ کتنی سادہ کتنی آسان کتنی سہل الوصول ہے، ایسی راہ کہ سننے کے بعد ممکن ہے کہ کہنے والے کہہ انھیں کہ یہ تو بالکل سامنے کی بات تھی، ایسی بات جس سے کون ناواقف ہے اور یہی میں بھی کہنا چاہتا ہوں کہ آسانیوں کو غلط کاروں اور غلط فہموں نے کیوں دشوار بنا لیا، قدرت ظالم نہیں ہے، اپنے بندوں کے لیے وہ رحم اور صرف رحم ہی رحم ہے، کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ سب سے زیادہ مکرم و محترم بنا کر جو پیدا کیا گیا ہے، تمام تقویوں میں سب سے احسن، سب سے اچھی تقویم میں جو ڈھالا گیا، امانت اور خلافت کی خلعت سے جو سرفراز کیا گیا، ایک لہجے کے لیے کوئی باور کر سکتا ہے کہ قصد و ارادۃً ایک ایسی زندگی اسی کے گلے میں لٹکا دی گئی، جو جنم بن کر اسے لپٹ گئی، ایسی جنم جس میں وہ جھلس رہا ہے، تڑپ رہا ہے، جل رہا ہے، بھن رہا ہے اور اس طور پر جل بھن رہا ہے کہ علاج کی ساری تدبیریں اس عذاب سے نکلنے اور نکالنے میں بے کار ثابت ہو رہی ہیں، ذہنی ارتقاء اور عقلی عروج کا انتہائی زمانہ جس عہد کو انسانیت کے لیے ٹھہرایا جا رہا ہے، اس عہد میں بھی آئندہ نسلوں کے متعلق استقبالی وعدوں کی جھوٹی طفل تسلیوں کے سوا علاج کی کوئی دوسری تدبیر اب تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئی ہے اور نہ آنے کی امید ہے۔ بہر حال بجائے ازالہ کے امالہ کی جس عجیب و غریب تدبیر کو میں اسلام کی طرف جو منسوب کر رہا ہوں، آپ نے سمجھا؟ میں کیا کہہ رہا ہوں، کیا کہنا چاہتا ہوں؟

حقیقت تو یہ ہے کہ میں الدین، یا مذہب کے نظام ہی کو اسی امالہ کی واحد، بے خطا تدبیر سمجھتا ہوں، خود ہی سوچ لیجئے، مذہب کس چیز کا نام ہے؟ یہی ناکہ زندگی کے موجودہ دور کو جس کا نام قرآنی اصطلاح میں ”الحیوة الدنیا“ ہے، اسی ”الحیوة الدینا“ کو الحمد و قدرت و قوت رکھنے والے خالق کی مرضی کے مطابق اس لئے گزارنا، تاکہ خالق کی لامحدود قوتیں بھی انسانی مرضی کے مطابق ہو جائیں، یعنی وہی: ”رضی اللہ عنہم ورضو“

اعنہ۔ ”راضی ہو گیا اللہ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اللہ سے“ جس کا قرآنی خلاصہ ہے، جن لوگوں سے زیادہ اعتماد انسانیت کی تاریخ میں کسی کو حاصل نہیں ہوا، یعنی: حضرات رسل علیہم السلام ان ہی کی اعتمادی حقیقتوں کو ذریعہ بنا کر ہر ملک اور ہر قرن میں جو چیز مذہب کے نام سے پیش ہوتی رہی ہے، کون نہیں جانتا کہ اس کا حاصل یہی ہے، مذہب جس چیز کا نام ہے، یہ تو اس کا حاصل ہوا، لیکن آپ نے یہ بھی سوچا کہ لامحدود خواہشوں سے لب ریز فطرت کے ساتھ مذہب کے اس پیغام کو جوڑنے کا نتیجہ کیا نکلا؟

کوئی سمجھے، یا نہ سمجھے، لیکن ہوا یہی کہ دنیا کی معاشی پیداواروں کی محدودیت و عدم مبسوطیت کی وجہ سے لامحدود مطالبوں والی انسانی فطرت میں بے چینی اور بے اطمینانی کے جو انگارے دہک رہے تھے، مذہب کے اس پرزے کو جوڑنے کے ساتھ ہی محدود سے ہٹ کر انسانی فطرت کا رخ لامحدود کی طرف اچانک پھر گیا، انسانی فطرت کے مطالبے نہ پوری ہونے والی تمناؤں کی شکل اختیار کر کے آدمی کو جو تڑپا رہے تھے، شاداب بڑھتی ہوئی امیدوں اور ارمانوں کے پھول بن کر وہیں آگ بھری ہوئی تھی، شگفتہ و تروتازہ تختوں سے بھرا ہوا باغ بن گیا، جس سے زیادہ بھروسہ کسی دوسرے پر نہیں کیا جاسکتا، حتیٰ کہ خود اپنی آنکھوں، اپنے کانوں پر بھی انہیں ان ہی غیر مشکوک قطعی علمی ذرائع (رسل اللہ) کی راہوں سے انسانی فطرت اور اس کے لامحدود مطالبوں کا مالہ ایک ایسی عجیب و غریب شکل میں مذہب کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے کہ اس کی ساری بے چینیاں چین کی اور ساری پریشانیاں سکون و عافیت کی سیڑھیاں بن جاتی ہیں۔ فطرت کے ان لامحدود مطالبوں کے استعمال کی صحیح قدرتی راہ یہی ہے، ان مطالبوں کو ہمارے اندر بھرنے والے نے اسی استعمال کے لیے بھرا تھا، پھر جو ہاتھ سے پاؤں کا اور پاؤں سے ہاتھ کا کام لے کر دکھ اور اذیت محسوس کرتا ہے، اس کا الزام استعمال کے غلط طریقوں کو اختیار کرنے والوں پر ہے، نہ کہ اس پر جس نے ہاتھ اور پاؤں کی نعمتوں سے ہمیں سرفراز فرمایا ہے۔ مذہب اسی مالہ کا ذریعہ اور صحیح آسمانی مشورہ ہے۔ یوں تو یہ بالکل ایک واضح اور کھلی ہوئی بات ہے، لیکن بد بیہات پر بھی کبھی تنبیہ کی جاتی ہے۔ قرآن پڑھئے، ان تنبیہوں کے اشارے بھی اس میں آپ کو ملیں گے۔

واقعہ معراج

نکتہ کی دو باتیں

از: رئیس التحریر حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی

صدر شعبہ تبلیغ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

ولادت: ۱۳۱۰ھ ۱۳ فرغت: ۱۳۲۳ھ وفات: ۱۳۷۵ھ تدفین: اپنے

وطن گیلان بہار میں

جس چیز کو ایک طرف سے دباؤ گے، تو دوسری طرف سے اس کا بھرنانا گزیر ہے، آخر جو نیچے کو دبایا گیا اور مسلسل نہایت بے دردی سے دبایا گیا اور وہ دبتا ہی چلا گیا، کس قدر عجب بات ہے کہ لوگ اسی کے متعلق پوچھتے ہیں کہ وہ ”معراج“ میں اوپر کی طرف کس طرح چڑھا، کیوں چڑھتا گیا؟ آخر حد درجہ جسے نیچے دبایا گیا، اسے حد درجہ اوپر ابھرنانا چاہئے تھا، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

معراج کے موقع پر آسمانی سیر میں پہلے آسمان پر حضرت آدم، دوسرے پر عیسیٰ و مہدی، تیسرے پر ادریس، چوتھے پر ہارون، پانچویں پر یوسف، چھٹے پر موسیٰ اور ساتویں پر ابراہیم علیہم السلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقت ہوئی، ہزار ہا پیغمبروں میں سے کل سات پیغمبروں اور ان میں بھی حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر معمارِ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زیارت پر آپ کی ملاقات کیوں ختم ہوگئی؟

اگر غور کیا جائے، تو نکتہ کی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جس طرح اپنے وطن جنت سے نکل کر دنیا کی ہجرت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ (وطن) سے نکل کر مدینہ پہنچے، مدینہ میں یہودی فتنے نے آپ کو اسی طرح گھیرا، جس طرح حضرت عیسیٰ و حضرت مہدی علیہما السلام ان میں گھرے، حضرت ادریس؟ علیہ السلام کتابت کے موجد تھے، غزوہ بدر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں نوشت و خواند کو فروغ کیا، حتیٰ کہ ہر خواندہ قیدی سے دس بچوں کو لکھنا سکھادینا فدیہ مقرر ہو، پیغمبروں میں حضرت

ادریس علیہ السلام کے بعد آپ نے سلاطین کے نام خطوط روانہ کئے، آگے جس طرح حضرت ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل میں ہر عزیز تھے، آنحضرت ﷺ ان میں محبوب تھے، پھر جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے وطن ثانوی مصر میں جو اقتدار حاصل ہوا، وہی حضور ﷺ کو اپنے دور ہجرت مدینہ طیبہ میں چند سالوں کے بعد حاصل ہو گیا، پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے وطن فلسطین پر مصر سے حملہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وطن مکہ پر حملہ کیا اور اس کو مشرکوں کے اقتدار سے آزاد کرایا، حضرت ابراہیم علیہ السلام بانی کعبہ تھے، آپ ﷺ نے کعبہ پر قبضہ کر کے پھر اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام بانی کعبہ کی مسجد بنا دیا اور اسی پر زندگی ختم ہو گئی۔“

”النبی الخاتم“

از مولانا مرتوم، ص: ۵۵، ۵۲،

مکتبہ رشیدیہ لاہور



فہرست تصانیف سید محمد اکبر شاہ بخاری

- | | |
|---|--|
| مقالات مفتی جمیل احمد تھانویؒ | علمائے دیوبند کے شاندار کارنامے |
| چالیس بڑے مسلمان (جلد 2) | اکابر علمائے دیوبند |
| خطبات اکابر (جلد 5) | تذکرہ اولیاء دیوبند |
| خطبات احتشام (جلد 6) | کاروان تھانویؒ |
| بیس علمائے حق | فیضان تھانویؒ |
| اکابرین وفاق المدارس پاکستان | اکابرین مجلس صیانت المسلمین پاکستان |
| تذکرہ شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانیؒ | سلسلہ اشرفیہ کے سو بڑے علماء |
| خطبات شیخ الاسلام پاکستان علامہ عثمانیؒ | خطبات مفتی اعظمؒ |
| حیات مولانا احتشام الحق تھانویؒ | مقالات مفتی اعظمؒ |
| حیات علامہ ظفر احمد عثمانیؒ | معارف مفتی اعظمؒ |
| مقالات علامہ ظفر احمد عثمانیؒ (جلد 2) | مفتی اعظم پاکستان اور ان کے ممتاز تلامذہ و خلفاء |
| مقالات ترمذیؒ (مفتی عبدالشکور ترمذی) | مفتی اعظم پاکستان اکابر و معاصر کی نظر میں |
| مقالات حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ | چند عظیم شخصیات (تاثرات مفتی اعظمؒ) |
| ذکر طیب (قاری محمد طیبؒ) | خطبات علامہ ادریس کاندھلویؒ |
| خطبات طیبات (قاری محمد طیبؒ) | حیات علامہ ادریس کاندھلویؒ |
| تذکرۃ الشیخ (مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ) | مفتی محمد حسن امرتسریؒ اور ان کے خلفاء |
| معارف شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ | ذکر خیر محمد جالندھریؒ |
| تحریک پاکستان اور علمائے دیوبند | یاد شریف جالندھریؒ |
| تحریک پاکستان کے عظیم مجاہدین (تاریخی دستاویز) | تذکرہ خطیب الامتؒ |
| پچاس مثالی شخصیات | ذکر متین خطیب |

خطبات و مقالات مفتی عبدالقادر	حضرت مولانا اظہر سہلئی
مقالات مفتی عبدالکیم سکھروی	مقالات گیلانی (سے مناظر احسن گیلانی)
مقالات و مضامین مولانا شمس الحق	مقالات سید بدر عالم میرٹھی
خطبات و مقالات مولانا نذیر احمد	سیرت بدر عالم
خطبات مالک کاندھلوی	پاک و ہند کے نامور علماء و مشائخ
حیات مالک کاندھلوی	پچاس جلیل القدر علماء

سید محمد اکبر شاہ بخاری

خادم مدرسہ اشرفیہ احتشام العلوم جام پور

ضلع راجن پور (پنجاب)

AF-1582